

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

تسکین الحقائق

مخزن کنز الایمان

اعلیٰ حضرت شاہ احمد رضا خان رحمتہ اللہ علیہ کے ترجمہ کا کتابی بڑھ

تالیف: عید الرزاق بختراوی حطاروی

مدرس جامعہ ضویہ ضیاء العلوم راولپنڈی

مکتبہ ضیاء

بوہڑ بازار راولپنڈی

اِنتِساب

سجدۃ المحققین استاذ العلماء استاذی المکرم حضرت
علامہ مولانا محمد اشرف صاحب سیالوی شیخ الحدیث سیال شریف
کے نام جنکی محنت و محبت اور روحانی توجہ کی وجہ سے ہی میں
نے تالیف کا یہ کام مکمل کیا، آپکی توجہ کے بغیر میرے لئے یہ
مرحلہ طے کرنا ناممکن تھا۔

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپکی اس مشفقانہ توجہ کو
میرے لیے رہنما بنائے رکھے اور آپکا سایہ تادیر قائم رکھے۔

نام کتاب _____ تسکین الجنان فی محاسن کثر الایمان
مصنف _____ مولانا عبدالرزاق چشتی بھقراوی
کتابت _____ محمد اسلم، محمد حیات ڈوگر، شاہ محمد چشتی قصو
_____ فون - ۳۱۳۴
صفحات _____
تعداد بار اول _____ ۱۱۰۰ (۹۸۷ء ۲۰۰۷ء)
ناشر _____ مکتبہ ضیائیہ راولپنڈی

پسِ خاطر

♦ استاذ العلماء حضرت علامہ غلام محی الدین شاہ صاحب

(مہتمم و شیخ الحدیث جامعہ رضویہ راولپنڈی)

♦ مولانا حسین الدین شاہ صاحب نائب شیخ الحدیث جامعہ رضویہ راولپنڈی۔

♦ مولانا محمد یعقوب ہزاروی صدر مدرس جامعہ رضویہ راولپنڈی۔

♦ مولانا عبدالرشید صاحب قریشی مدرس جامعہ رضویہ راولپنڈی۔

♦ مولانا ابوالفضل الشردتہ صاحب سیالوی بھابڑا ضلع سرگودھا۔

♦ مولانا گل احمد صاحب جامعہ نعمانیہ لاہور۔

♦ مولانا شاہ محمد چشتی سیالوی خوشنویس قصور۔

ان تمام حضرات کیلئے میرے دل میں انتہائی

احترام کے جذبات موجود ہیں کہ انہوں نے مجھے مشورہ دل سے نوازا۔

اظہارِ تشکر

سوزنیم حافظ مولانا محمد اختر صاحب گجراتی ٹھکانہ

ادا کرتا ہوں جنہوں نے ادراق میں بکھرے ہوئے مضامین

کو جمع کرنے میں میری معاونت کی۔ اللہ تعالیٰ ان کے

علم و عمل میں برکت عطا فرمائے۔

مولانا غلام سرور صاحب امام مسجد بڑے کاتیہ لاہور۔

جنہوں نے طباعت میں امداد فرمائی ان کا بھی شکریہ گزار ہوں۔

اللہ تعالیٰ انکو جزا بخیر عطا فرمائے۔

استاذ العلماء حضرت علامہ مولانا محمد گل احمد عتیقی شیخ الحدیث دارالعلوم نعمانیہ لاہور

تقریظ

امام اہل سنت حضرت علامہ مفتی شاہ احمد رضا خاں بریلوی کی شخصیت علمی حلقوں میں محتاج تعارف نہیں، اپنے بیگانے سمجھی آپ کے علمی کمال کے معترف ہیں، آپ کا ترجمہ قرآن آپ کے علم و فضل کا شاہد عدل اور روشن تر دلیل ہے گاہے تفاسیر کے کئی صفحات پر پھیلے ہوئے مضامین کو آپ ایک جملہ میں نہیں بلکہ ایک لفظ میں سمجھ کر رکھ دیتے ہیں گویا کہ آپ کا ترجمہ قرآن دریا اندر جباب یا سمندر کو گونے میں بند کر دینے کا مصداق اتم ہے فاضل اجل حضرت علامہ مولانا محمد عبدالرزاق چشتی مدرس جامعہ رضویہ ضیاء العلوم سٹائنٹ ٹاؤن نے آیات کثیرہ کے تراجم کے ساتھ ان تفسیری مضامین کو بھی بیان فرمادیا ہے جس سے تراجم کو چارہ چاند لگ گئے ہیں، اللہ تعالیٰ فاضل کی عمر و زادہ فرمائے اور انہیں دین مبین کی مزید توفیق عنایت فرمائے اور لوگوں کو ان کی کاوشوں سے بہرہ مند ہونے اور استفادہ کی توفیق بخشے۔ اللہ ہمہ دین دہجاء سید المرسلین

محمد گل احمد عتیقی

شیخ الحدیث دارالعلوم نعمانیہ لاہور

استاذ الفضلاء استاذی المکرم علامہ عبدالحکیم شرف قادری شیخ الحدیث جامعہ نظامیہ رضویہ لاہور

تقریظ

کچھ کتابیں بہترین راہنما اور بہترین ساتھی کی حیثیت رکھتی ہیں اور کچھ کتابیں ہولناک تباہی اور بربادی کا سامان ہوتی ہیں غرضیکہ کتاب کی اثر آفرینی سے انکار نہیں کیا جا سکتا، انسانی تاریخ میں آج تک کتنی کتابیں لکھی گئیں؟ کوئی محقق انکا شمار نہیں کر سکتا، لیکن یہ بات بلا خوف تردید کہی جاسکتی ہے کہ سب سے اعلیٰ سب سے زیادہ مکمل اور لافانی کتاب صرف اور صرف قرآن پاک ہے جو تخیل و تبدل سے محفوظ اور بی نوع انسان کے لئے پیام حیات ہے، پیام امن ہے، صراط مستقیم ہے اور انسانی زندگی کے ہر گوشے میں راہنمائی کر نیوالی کتاب ہے۔

قرآن پاک کتاب ثواب بھی ہے اور کتاب انقلاب بھی، نبی اکرم، ہادی اعظم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے قرآن پاک کی بنیاد پر جو انقلاب بھی بپا کیا، تاریخ اس کی نظیر پیش کر نیلے قاصر ہے، وہ قوم جو ہر اعتبار سے پستی کی اتھاہ گہرائیوں میں غرق تھی اسے محقر ترین عرصے میں عظمتوں کی ان بلندیوں پر پہنچا دیا کہ اس وقت کی دوسرے بادشاہ متین روم اور ایران ان کے سامنے سرنگول ہو گئیں، یہ وہ عظیم انقلاب ہے جس نے غیر مسلم دانشوروں کو محو حیرت کیا ہوا ہے اور وہ اس گہنی کو سلجھانے سے عاجز نظر آتے ہیں اسکے ساتھ ساتھ اگر ہم اپنی موجودہ حالت زار پر غور کریں تو سر بار زندامیت سے جھک جاتا ہے، کہاں وہ شاندار عروج اور کہاں یہ افسوس ناک زوال؟ — و بظاہر ہے بقول شاعر

وہ معزز نہ تھے زمانے میں مسلمان ہو کر

اور ہم خوار ہوئے تاکہ قرآن ہو کر

آج کی اہم ترین ضرورت یہ ہے کہ ہم قرآن و حدیث پڑھیں، سمجھیں اور ان پر عمل کریں، اصولی طور پر ہونا تو یہ چاہیے کہ ہم علوم دینیہ اور عربی زبان میں اتنی مہارت حاصل کریں کہ قرآن و حدیث کا عربی زبان میں مطالعہ کر سکیں اور ان کے مطالب و مفہم تک ساقی حاصل کریں مگر آج

بجائے ہم علوم دینیہ سے کہ مولوں دور میں اور عربی زبان سے بالکل ناواقف، ایسے حالات میں ہماری یہی خوش نصیبی ہے کہ ہم تراجم کے ذریعے اللہ تعالیٰ اور اس کے حبیب مکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے احکام و تعلیمات جاننے کی کوشش کریں۔

اردو زبان میں قرآن پاک کے بہت سے ترجمے کئے گئے ہیں اور ہاں میں دستیاب بھی ہیں لیکن ترجمہ کرنے کیلئے عربی لغت اور گرامر سے واقف ہونا ہی کافی نہیں ہے بلکہ بارگاہ الوہیت اور دربار رسالت کا ادب و احترام، عصمت انبیاء کا لحاظ، ناسخ و منسوخ، شان نزول سے واقفیت، بظاہر اختلاف رکھنے والی آیات کے درمیان تطبیق، عقائد اہل سنت، تفسیر صحابہ و تابعین اور تفسیر سلف صالحین پر گہری نظر اور عبور ہونا بھی ضروری ہے، امام احمد رضا بریلوی قدس سرہ کو اللہ تعالیٰ نے تقریباً سچاس علوم و فنون میں بے مثال مہارت، وسیع مطالعہ اور حیرت انگیز حافظہ عطا فرمایا تھا انہوں نے قرآن پاک کا ترجمہ کر کے عامۃ المسلمین پر بہت بڑا احسان فرمایا، بلاشبہ ان کا ترجمہ تمام خوبوں کا حامل اور قرآن پاک کا بہترین ترجمہ ہے ان کے ترجمہ قرآن کی بے پناہ مقبولیت نے مخالفین کو سرسیمہ کر دیا ہے چنانچہ کئی کتابچے اور پمفلٹ اس ترجمہ کے خلاف دیکھنے میں آچکے ہیں، ایسے ہی ایک پمفلٹ کے شبہات کا ازالہ کرنے کے لیے فاضل نوجوان مولانا علامہ عبدالرزاق ندید مجاہد نے پیش نظر کتاب تحریر فرمائی ہے جس میں انہوں نے عالم اسلام کے مسلم مفسرین کے حوالے سے ثابت کیا ہے کہ امام احمد رضا بریلوی قدس سرہ کا ترجمہ ہی صحیح ترجمہ ہے مولانا عبدالرزاق ندید علمہ ضیاء العلوم جامعہ رضویہ، سبزی منڈی، راولپنڈی کے مدرس ہیں اور علمی ذوق سے سرشار ہیں، ان کی یہ پہلی تھمڑی کوشش ہے جو لائق تہنیت و تحسین ہے، اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں دعا ہے کہ تصنیف و تالیف کے میدان میں انہیں مزید کام کرنے کی توفیق نصیب ہو اور ہمارے نوجوان علماء کو بھی قلم و قریطاس کی اہمیت کا شعور عطا ہو۔

محمد عبدالحکیم شرف قادری

جامعہ نظامیہ رضویہ، لاہور

ابتدائے سخن

جب کائنات عالم پر انحطاط کے بادل چھلنے ہوئے تھے علم و دانش کے چراغ بجھے ہوئے تھے بلکہ عقل و خرد کا نام و نشان ایک تنکے کی طرح ہوا کی زد میں آنے کی وجہ سے مٹ چکا تھا سوچنے سمجھنے کی قوتیں مفلوج ہو چکی تھیں خلوص و ایمان داری کو چشمِ حقارت سے دیکھا جاتا تھا۔ عیاری و مکاری کی عزت افزائی ہوتی۔ ڈاکہ زنی، سود خواری کو طرہ امتیاز بنا لیا گیا تھا۔ بدکرداری، شراب نوشی کو روج جاں سمجھا جاتا تھا۔ اپنوں، بیگانوں میں تمیز کی صلاحیتیں مفقود ہو چکی تھیں۔ زہر کو تریاق سمجھ کر بڑے شوق سے نوش کیا جاتا اور تریاق کو زہر سمجھ کر پائے حقارت سے ٹھکرا دیا جاتا۔ غرضیکہ سلامتی کی کشتیاں طوفان میں گھر چکی تھیں۔ بے رحم موجیں اقوام عالم خصوصاً اقوام عرب کے سفینوں کو دھکیل دھکیل کر گرداب کے حوالے کر رہی تھیں۔

ان طوفانوں سے بچنے آزما بی کرنے کی فکر سے بے نیاز، اپنے مستقبل کو درخشاں کرنے سے چشم پوشی، اپنی غلطیوں اور لغزشوں کا ازالہ کرنے کے بجائے شب و روز ان میں مصروف رہنے میں اترتا اور جو رزلے ان کے اذہان و افکار کی دنیا کے فلک بوس ایوان کو پیوند خاک کرے تھے ان کی غارتگریوں اور فتنہ سامانیوں سے بچنے کی کوئی تدبیر نہ کرنا ان کی رگ و جان میں سرایت کر چکا تھا۔ ایسے حالات میں جبکہ اخلاق اور شائستگی کا تصور کہیں خال خال نظر آتا، جانزدانا جائز، حسن اخلاق و بد اخلاق میں اکثریت کو کوئی تمیز نہ تھی۔ شرم و جاکا بھی جائزہ نکل چکا تھا۔ کعبہ شریف کا برہنہ طواف کرنے میں بھی عار محسوس نہیں کرتے تھے۔

ایسے حالات میں یکایک ایک مہنتی کا ورود ہوتا ہے جو مشفق و مہربان، مرقی، مزکی اور جہتیں صفات حمیدہ سے متصف، جنہوں نے ایک عظیم مدبر و مفکر کی حیثیت سے ریگستان عرب کی بکھری ہوئی قوم کو اخوت و محبت، ایمان و ایقان کی وحدت کی سبک میں پرو دیا۔ جنگ جو، جابل، غیر متمدن، غیر مہذب، ناشائستہ سرکش اور ہمیشہ آپس میں لڑنے والوں کو ایک مذہب، ایک تہذیب، تمدن اور ایک ہی نظام و قانون کے تابع بنا دیا۔ اسلام کا برہم لہر دیا۔ امن و سکون، محبت و پیار کا سبق دیا تاکہ اس سرزمین پر بسنے والے اپنی صلاحیتوں کو نیکی اور اصلاحی سرگرمیوں میں صرف کر سکیں تاکہ عداوت، حسد، منافرت، مجادلہ، مقاتلہ کے شعلے ان کے خرمین عاقبت کو جلا کر خاکستر نہ کر دیں۔ ایک محبوب و حقیقی کا تصور دیا۔ روز محشر کے محاسبہ کا خوف دلایا۔ اعمال کے محرکات و عوامل سے ان کو خوب آگاہ کیا اپنے اخلاق و خلق سے ان میں انقلاب پیدا کیا۔ اپنی فصیح و بلیغ کلام، شیریں اور مسحور کن زبان سے ان کے دلوں کی حقیقت کو یکسر بدل دیا۔

آپ سرزمین عرب کے ایک مہذب خاندان کے فرد ہونے کے ناطے، بنو سعد کی فضاؤں میں پروردہ ہونے کی وجہ سے فصیح ترین زبان سے آراستہ و پیراستہ تہذیبات و تمائیل، خطابت کا عجیب انداز اور ایسا اسلوب جس کی لطافتوں سے متاثر ہوتے بغیر اہل عرب بھی نہیں رہ سکتے تھے، انھیں بھی برملا کہتے ہوئے پایا گیا کہ ایک ہی مقام پر پرورش پانے کے باوجود آپ کی زبان لطافتوں سے مزین کیوں ان کا جواب ان الفاظ میں دیا جاتا ہے: ان الله عز وجل ادبني

فاحسن ادبی و نشأت رفی بنی سعد بن بكر بیشک میری لسانی فصاحت اللہ عز وجل کی عطا کردہ ہے۔ اسی نے میرے ذوق ادب کو خوب تر بنایا ہے۔ میری نشو و نما بنو سعد کی فصیح و بلیغ فضاؤں میں ہوئی۔

جو امح الکلم آپ کا اعجاز خاص تھا یعنی مختصر ترین کلمات جو معانی کی بہت بڑی وسعتوں کے حامل ہیں۔ آپ کے اجزائے کلام جو گوہر نایاب جو اہر درخشندہ معنوی

گہرائی کی وجہ سے دلوں پر تاثیر کرنے کے لحاظ سے مثال نہیں رکھتے۔ آپ کی کلام جو نیم سحر کی طرح سہانی، آب جو کی طرح برودت سے لبریز، تیغ برق کی طرح درخشاں بھتی ہی لیکن وحی کی کلام مبین نے حسن گفتار کو اور بھی منور کر دیا تھا۔ آپ کی زبان بے مثال سے حیرت انگیز کلام سن کر اقوام عرب متحیرہ گئیں۔ اس کی شدت تاثیر سے آپ کے دشمن بھی ڈرتے تھے کہ کہیں دل میں نہ اتر جائے۔ اس کی فصاحت و بلاغت اور زور بیان کا یہ عالم تھا کہ تمام عالم عرب کے شعراء، خطباء، ادبا کو ایک دفعہ نہیں بار بار چیلنج دیا کہ تمام مل کر اس جیسی ایک پھوٹی سی شورت بنا کر لاؤ۔ لیکن مقابلہ کی طاقت نہ رکھنے وجہ سے انھوں نے سنی ان سنی کر دی۔ آج وہی فصیح و بلیغ مقام سے عاجز ہو کر سر جھیکا گئے نظر آتے ہیں جو ایک طرح مصرعہ پر طویل قصائد لکھا کرتے دوسروں کی بچو میں اشعار کے انبار رکھا دیتے۔ کسی کی مدح و توصیف میں فصاحت کے چمکدار نمونوں کو ایک سبک میں جمع کرتے نظر آتے لیکن سید دو عالم کے سامنے انگشت بدنداں اور زبان پر مہر سکوت ہے۔

تیرے آگے لپے بے فصاحتے عرب کے بڑے بڑے

کہے کہ منہ میں زبان نہیں بلکہ جسم میں جاں نہیں

میدان فصاحت میں کوئی شہسوار سبقت نہیں حاصل کر سکتا۔ بلاغت کی بلند منازل کی چوٹیوں کو کوئی گوہر پیما سر نہیں کر سکتا۔ اس لیے کہ یہ کسی انسان کا کلام نہیں بلکہ اس ذات باری تعالیٰ کا کلام ہے جس کی توصیف میں سعدی رحمۃ اللہ علیہ جیسے یہ کہتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

برتر از خیال و قیاس و گمان و دہم

اسی وجہ سے معانی و بیان و بدیع کے جمیع ضوابط کا حامل ہے۔ استعارات، مجاز، مرسل، حذف و ایصال جیسی بیشمار صورتیں مذکور ہیں جن کا ایک ساتھ لحاظ کرنا اسی کو زیب دیتا ہے جو جمیع نقائص و عیوب سے پاک ہو۔ سہو و نسیان، علم کی قلت و کثرت سے متصف ذوات کو ان کا مد نظر رکھنا ممکن نہیں۔ ان استعارات و

متاثر سے اُستار کو کھولنے کے لیے اور انتہائی مختصر مضامین جو غیر محدود معانی و مطالب کو متضمن تھے ان کی وضاحت کے لیے اور اس کلام کے لطائف و حقائق بیان کرنے کے لیے کہیں علامہ فخر الدین رازی بجز تحقیق و تدقیق میں غوطہ زن ہو کر جو اہم نکالتے نظر آتے ہیں کہیں علامہ سید محمود آلوسی علم و عرفان کے موتیوں کو جمع کرتے ہوئے نظر آتے ہیں کہیں قاضی ثناء اللہ معرفت کے باغات سے پھول چھینتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ ایسے ہی جلال الدین سیوطی اور جلال الدین محلی راہ حق سے بھٹکنے والوں کو مختصاراً حقائق و لطائف سے آگاہ کرتے ہوئے نظر آتے ہیں علامہ ابوالبرکات نسفی معارف حقائق کے بیان کے ساتھ ساتھ فقہی استنباط کرتے ہوئے ممتاز نظر آتے ہیں۔

ہر دور میں محققین کلام الہی کے اسرار و رموز کو اپنی اپنی علمی استعداد کے مطابق بیان کرنے میں کوشاں رہے۔ مختلف زبانوں میں قرآن پاک کے معانی و مطالب کو بیان کرنے کی کوشش کی جاتی رہی۔ اردو زبان میں کئی تراجم معرض وجود میں آئے لیکن جب ان تراجم کا تقاسیم کے آئینے میں تقابلی مطالعہ کیا جائے تو یقیناً ایک ہستی کا ترجمہ انفرادی حیثیت میں آپ کے سامنے جلوہ گر ہوگا۔

وہ ہستی مولانا احمد رضا خاں بریلوی کی ہے جس کی فراست ایمانی نے ہندو مسلم اتحاد کی قباحتوں کا سب سے پہلے اندازہ لگایا جس نے کسی کی پرواہ کئے بغیر گاندھی اور اس کے مکار چیلوں کے دام فریب کو قبل از وقت تاڑتے ہوئے مسلمانوں کو بانگ دہل لکھارا۔ اے مجاہد مصطفیٰ، خبردار! ہندو کے دام صید میں نہ پھنس جانا۔ وہ اپنی اکثریت کے بل بوتے پر تمہیں نیگل جلے گا تمہیں نیست و نابود کر دے گا اور یا ہندو نہ طرز زندگی گزارنے پر مجبور کر دیگا۔ اس مرد درویش کو سیاسی بصیرت، بالغ نظری کے ساتھ ساتھ ایمانی فراست اور علمی وسعت کا بھی ایک عظیم تر مقام حاصل تھا عقل و خرد کے ساتھ دین و ایمان سے بھی بہرہ ور تھا جس کا ذہن و ضمیر، قلم و زبان سبھی محبت مصطفیٰ میں غرق تھے جس کے سوز ایمانی اور حمیت دینی نے

جمود و خمود کی چٹانوں کو ریزہ ریزہ کر دیا۔ جو اسلام کی غفلت کا متمنی، اسلام سے دلی وابستگی اور اسلام کی سر بلندی کی کوشش میں اپنے آپ کو وقف کئے ہوئے تھا۔ وہ جس کے عقائد، اعمال، صورت، سیرت، رفتار، گفتار، نشست و برخاست، خور و نوش سب میں محبت مصطفیٰ کی جھلک نظر آتی ہے۔ علمی بصیرت کا یہ حال ہے کہ ایک ہی وقت میں تمام علوم پر حاوی۔

آپ کے ترجمہ قرآن پاک کو دیکھ کر بلا تردد یہ کہا جاسکتا ہے کہ تجھ پر رحمت کائنات کی خاص نظر اور خالق کائنات کا تجھ پر کرم ہے۔ ترجمہ میں مفسرین کے اقوال کو نظر میں رکھنا۔ راجح مزاج کا لحاظ کرنا، مجاز و استعارات کو ترجمہ میں سمجھنا، منشا بہات کا ترجمہ اس طرح کرنا کہ ان کی حیثیت برقرار رہے یقیناً یہ احسان مالک الملک ہے۔ ممکن ہے کسی مسخ شدہ ذہن والے آدمی کے نزدیک یہ علمی کمالات کے مراتب کی بے بہا قدیں کوئی اہمیت نہ رکھتی ہوں لیکن خدا را! بھڑکے ہوئے جذبات کی زد میں بہتے ہوئے تحالف کے احساس کے زیر اثر کوئی فیصلہ نہ کریں۔ بلکہ ان سے بلند ہو کر عدل و انصاف سے غور کریں۔ بے شک آپ جذبہ عقیدت نظر محبت کو بالائے طاق رکھ دیں لیکن حقیقت کا دامن تو کسی کے کھنکھنے اور طمع سازی سے نہ چھوڑیں۔ آج کل زندگی محض ہنگامہ آرائی سے عبارت ہے۔ غور و فکر کی رسم یکسر ختم ہو چکی ہے۔ اپنے حرفیوں پر الزام تراشی، بہتان بازی، غزلے رنج بن چکی ہے۔ سنگین الزام عائد کرنے میں ذرا بھرا احتیاط نہیں کیا جاتا بلکہ دشنام طرازیں عروج پر ہیں۔ ان یہیم لغزشوں سے لرزہ بر اندام ہونے کی بجائے ان کو علم کا منہ لائے کمال سمجھا جاتا ہے۔ کاش! کہ غور و فکر سے کام لیا جاتا اور اگر فقط تحقیق و تدقیق میں اختلاف کیا جاتا تو وہی اختلاف باعث رحمت بنتا لیکن ستم بالائے ستم یہ ہے کہ ایسے اعتراضات سے قوم کو فکری انتشار کے گردابوں میں غلطاں و چٹانوں کی کوشش کی جاتی ہے جو حقائق سے دور ہوں۔ بلکہ ان اعتراضات کے انکشافات بطغیانی کے بے رحم پھیلنے سے بن کر ان

کی بزم نشاط کو تباہ و برباد کر دیتے ہیں۔

آئیے! چند ایسی مثالیں دیکھیں جن سے پتا چلتا ہے کہ یہ ایسا سلوک کیا گیا ہے جیسے کوئی کمینہ پرور شخص اپنے بدترین دشمن سے کرتا ہے لیکن اپنے گریبان میں جھانکنے کی کوشش نہیں کرتا۔

اعلیٰ حضرت مولانا احمد رضا خاں بریلوی رحمۃ اللہ علیہ کے ترجمہ پر اعتراض اس طرح کیا جاتا ہے :- انا انزلنا الیک الكتاب بالحق

پ ۵ سورۃ نسا آیت نمبر ۱۰

اس آیت میں ”اے محبوب“ کسی عربی لفظ کا ترجمہ نہیں لیکن افسوس یہ نہیں خیال کیا گیا کہ یہ الیک میں ”ک“ ضمیر کا مرجع بتایا گیا ہے کہ اسکا مرجع نبی کریم کا دار پاک ہے۔ معترضین کے اپنے اکابر کے تراجم میں اس طرح کی زیادتیاں سینکڑوں کی تعداد میں موجود ہیں۔

چند مثالیں بطور نمونہ مولینا محمود الحسن کے ترجمہ سے پیش کی جا رہی ہیں۔ وہ چند بھی صرف پارہ اول سے ملاحظہ ہوں :-

و علم ادم الاسماء کلھا ثم عرضہم علی الملائکۃ

”اور سکھا دیئے اللہ نے آدم کو نام سب چیزوں کے پھر سنے کیا ان سب چیزوں کو فرشتوں کے“

یہاں لفظ ”اللہ“ اور ”سب چیزوں“ اور ”پھر سب چیزوں“ کسی عربی لفظ کا ترجمہ نہیں۔

ان سبہم باسمائہم

”بتا دے ان فرشتوں کو ان چیزوں کے نام“

فرشتوں اور چیزوں ————— کسی عربی لفظ کا ترجمہ نہیں۔

فتاب علیہ ”پھر متوجہ ہو گیا اللہ اس پر“

اللہ کسی عربی لفظ کا ترجمہ نہیں۔

واشریوا فی قلوبہم العجل

پلائی گئی ان کے دلوں میں محبت اس سمجھڑے کی۔

محبت کسی عربی لفظ کا ترجمہ نہیں۔

بعاقدمت ایدہم

”بلسبب ان گناہوں کے کہ بھیج چکے ہیں ان کے ہاتھ“

گناہوں، اور بھیج چکے عربی لفظ کا ترجمہ نہیں کیونکہ ”قد مرث“ کا معنی معنی بھیج چکے نہیں۔

آم شریذون

”کیا تم مسلمان بھی چاہتے ہو؟“

مسلمان، کسی عربی لفظ کا ترجمہ نہیں۔

طوالت کے پیش نظر چند مثالوں پر اکتفا کیا جاتا ہے ورنہ دیگر تراجم سے اور اسی ترجمہ سے سینکڑوں مثالیں پیش کرنا کوئی مشکل نہیں۔ پھر لفظ محبوب پر ہی اعتراض کیوں؟ جبکہ حبیب پاک علیہ التحیۃ والثناء کو محبوب کہنا اور محبوب جانا خود ارشاد مصطفیٰ ہے : لایومن احدکم حتیٰ اکون احب الیہ

من والدی و ولده والناس اجمعین ”کوئی آدمی اس وقت تک مون نہیں ہو سکتا جب تک مجھے اپنے والد اور تمام لوگوں سے محبوب نہ سمجھے“

① مقامات حریری کی ابتدا میں مولینا محمد ادریس کاندھلوی کے نبی کریم کے اسمائے گرامی پر مشتمل اشعار اور ان کا ان پر حاشیہ مکتبہ اشرفیہ لاہور کو بھی نکالنے کا سبب کہیں

ایسا ہی اضطراب تو درپیش نہیں آیا؟ جب کہ ملک سر لاج دین کی طباعت میں مولانا کے اشعار اور ان پر حاشیہ قرآن پاک اور احادیث مبارکہ سے استدلالات مذکور

ہیں جو حبیب پاک کی مدح میں ایک اہم مقام کے حامل ہیں۔ اسی

اسی طرح اعلیٰ حضرت کے ترجمہ کو قصباتی زبان سے تعبیر کیا جاتا ہے کہ اس

میں فصاحت و بلاغت نہیں لیکن تقابلی جائزہ سے معاملہ دگرگوں نظر آتا ہے

وكان من الكافرين

• اور تھا وہ کافروں میں کا۔ (مولانا محمود الحسن)۔

• اور وہ کافر ہو گیا (اعلیٰ حضرت)۔

ثم بعثناكم من بعد موتكم

• پھر اٹھا کھڑا کیا ہم نے تم کو مر گئے پیچھے (مولانا محمود الحسن)۔

• پھر مرے پیچھے ہم نے تمہیں زندہ کیا (اعلیٰ حضرت)۔

وكل انسان طائر في عنقه

• اور جو آدمی ہے لگا دی ہم نے اس کی بُری قسمت اس کی گردن سے (محمود الحسن)

• اور ہر انسان کی قسمت اس کی گردن سے لگا دی ہے۔ (اعلیٰ حضرت)۔

واجتنوا الطاغوت

• اور بچو بڑوں کے سے (محمود الحسن)۔

• اور شیطان سے بچو۔ (اعلیٰ حضرت)۔

مذکورہ بالا چند مثالیں صرف بطور نمونہ پیش کی گئی ہیں۔ ان سے بہرہ ذی شعور

انسان قصاحت و بلاغت کا اندازہ لگا سکتا ہے کہ کس ترجمہ میں فصیح زبان کو

پیش کیا گیا ہے۔ ایسی عظیم المرتبت ہستی پر دشنام طرازیوں کا سلسلہ اس انداز پر پیش

کیا جاتا ہے کہ بلاشبہ ان کالیوں کو دیکھ کر کہنا پڑتا ہے کہ کیسی عالم کی تحریر نہیں

بلکہ بدترین جاہل کا کلام ہے کیونکہ اگر یہی علم ہے تو جہالت کسے کہا جاتا ہے؟

اعلیٰ حضرت کو جو گالیوں دی گئیں ان کی دو تین مثالیں ملا خطہ ہوں جو لفظوں

کی ذہنیّت کا اندازہ لگایا جائے کہ کس طرح پست ذہن رکھنے والے ہیں :-

① برصغیر پاک و ہند کے مبتدع عظیم و فتنہ تکفیر کے بانی مولانا احمد رضا خاں

② مذکورہ ترجمہ و تفسیر اسی فرقہ مضال کے پیشوا مولانا احمد رضا خاں بریلوی اور

اس کے خلیفہ مفتی نعیم الدین مراد آبادی کی خامہ فرسائی کا نتیجہ ہے۔

③ مولانا بریلوی کے ترجمہ قرآن پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ایسا انسان

مسلمانوں کا رہنمایا عالم اور اہلسنت کا امام تو کیا، ایمان ہی کے نور سے

خالی ہے۔

اگرچہ ایسی نازیبا عبارات ہمارے لیے ناقابل برداشت ہیں۔ حق تو یہ

تھا کہ اسی طرح کا جواب دیا جاتا لیکن پھر بھی اخلاق و سنجیدگی کا دامن بھامنے

ہوئے فقط اعلیٰ حضرت کے ترجمہ کے محاسن و کمالات تفسیر کے آئینہ میں پیش

کئے جا رہے ہیں۔ جہاں دیگر مترجمین کی کشتیاں تلاطم امواج میں جھکولے کھاتی نظر

آتی ہیں وہاں محبت رسول کی وسعت علم اور دقت نظر جیسے مضبوط و قوی ناخدا کے

سہارے کشتی صحیح و سلامت کنارے پر لنگر انداز نظر آتی ہے۔

ابھی تو تحقیق کے ابتدائی مراحل ہیں جس طرح تحقیق کا دائرہ وسیع ہوتا جائے

سکا، اہل علم کی تحقیق و تدقیق سے انشاء اللہ تقابلے اعلیٰ حضرت کے ترجمہ کے حسن و

جمال میں اور نکھار آئے گا

عبدالرزاق

تقریظ

اتحاد المحققین اتا فدی المکرم حضرت علام ابوالحنات محمد اشرف سیالوی صاحبہ علیہ السلام
شیخ الحدیث دارالعلوم ضیاء شمس الاسلام سیال شریف

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ يَا رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ

محترم مکرم برادر عزیز حضرت مولانا محمد عبدالرزاق صاحب زیدت فرائد
السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ مزاج شریف بہ خیریت موجود و خیریت مطلوب مکتوب
گرامی ملایا دآدری کا شکریہ جناب نے بہت مستحسن قدم اٹھایا ہے اور جیسے کہ چند
مقامات کے دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے آپ نے خوب معتدل انداز اور مہذب پیرائے
میں اعلیٰ حضرت کے ترجمہ کی موزونیت اور معنوی عظمت ثابت کی ہے۔ ہونا تو یہ چاہیے
تھا کہ دوسرے حضرات کے متعلقین انصاف اور دیانت سے کام لیتے اور اس ترجمہ
سے رہنمائی حاصل کرتے ہوئے اپنے بزرگوں کے تراجم درست کر لیتے اور آپ کی ذات
سراپا کمال کی علمی فوقیت و برتری کا اعتراف کرتے مگر براہِ وحد اور تعصب کا کہ وہ
کمال و حسن کو بھی نقصان اور قبح بنا دکھاتا ہے اور براہِ وحد و عناد کا کہ وہ حق کے اعتراف و
تسلیم کی طرف کبھی بھی مائل نہیں ہونے دیتا۔ بندہ نے متعدد مقامات تراجم کا تقابلی جائزہ
لیا تو یوں معلوم ہوا کہ ایک طرف ہمارے ترجمہ کا راجحہ فن کا ترجمہ ہے اور دوسری طرف
طلباء کا مشتقی انداز میں ترجمہ جس میں قواعد و ضوابط اور اصولوں کی طرف ذرا بھڑکے نہیں
دی گئی بلکہ عظمت خداوندی اور عظمت رسالت کے متعلق غلط فہمیاں پیدا تو کی ہیں
مگر ممکنہ غلط فہمیوں کو دور کرنے کی معمولی کوشش کوئی زحمت بھی گوارا نہیں فرمائی جبکہ
اعلیٰ حضرت نے ہر ایسے مقام پر مفسرین کرام کی تفاسیر کا حاصل اور چوڑے ترجمہ میں پیش
کر کے حق تعظیم بھی ادا کیا ہے اور عوام اہل اسلام کے ایمان کا تحفظ بھی فرمایا جائزہ اللہ
احسن الجزاء اللہ تعالیٰ آنجناب کی اس محنت اور سعی جلیل کو بظہیل حبیب مکرم و جسد
مقربان بارگاہ ناز مشرف قبولیت بخشے اور موجب انصاف و دیانت بنائے۔ آمین والسلام
احقر محمد اشرف

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ الحمد لله الواحد الغفار والصلوة
والسلام علی النبی لشاہد المختار وعلی اصحابہ الاخیار وعلی الہ الطہار
اما بعد

فاعوذ بالله من الشیطن الرجیم بسم الله الرحمن الرحیم
اهدنا الصراط المستقیم

اللہ تعالیٰ صراطِ مستقیم پر ثابت رکھے۔ انفراد و تقریظ سے بچائے مقصد
کسی کی دلائل آری نہیں کسی پر کچھ اچھلانا کسی کو برا کہنا کسی کو گمراہ کہنا یا کسی کو جاہل
کہنا مقصود نہیں بلکہ صرف اعلیٰ حضرت مولانا احمد رضا خاں بریلوی رحمۃ اللہ علیہ کے
ترجمہ کسرا ایمان کے محاسن و کمالات بیان کرنے مقصود ہیں۔ اعلیٰ حضرت کی بصیرت
اور علمی نکات پر رسانی اور تفاسیر کی آراء اور رائج اقوال سے باخبری پر مطلع کرنا
مطلوب نظر ہے اور یہ واضح کرنا ہے کہ اعلیٰ حضرت نے جس طرح شان الوہیت اور
مقامات نبوت اور فضائل مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کا پاس کرتے ہوئے ترجمہ کیا
ہے یہ آپ کا ہی حصہ ہے۔ بفضلہ تعالیٰ تفاسیر کی عبارات کو سامعہ پیش کیا جا رہا
ہے جن سے اعلیٰ حضرت کے ترجمہ کی فوقیت کا عیاں ہونا شک نہیں۔ اگر کسی مقام پر
تفاسیر کے مختلف اقوال ہیں جن سے دوسرے تراجم پر بھی دلیل قائم کی جاسکتی ہو تو اس
کی نشان دہی بھی انشاء اللہ موجود ہوگی۔ کوشش یہی ہے کہ عبارت آسان ہو تاکہ
اس کا سمجھنا صرف اہل علم پر موقوف نہ رہے بلکہ عام آدمی بھی اس سے فائدہ حاصل
کر سکے۔ امید ہے کہ انشاء اللہ اس کو پڑھ کر انصاف کیا جائے گا اور ایک عظیم
ترین شخصیت اور تحقیق و تدقیق میں ایک خاص مقام رکھنے والے بزرگ کی شان میں
کچھ اچھلانا بند کر دیا جائے گا۔ اگر تحقیق طور پر کوئی اختلاف پیش کرے تو یہ اس کو

حق حاصل ہے لیکن بدزبانی اور طعن و تشنیع پر مبنی کلام اہل دانش کو زیب نہیں دیتی۔
اب قرآن پاک سے چند مقامات پیش کیے جا رہے ہیں جن سے اعلیٰ حضرت کے
ترجمہ کی برتری روز روشن کی طرح عیاں ہے۔ ترتیب وار پہلے پارہ سے سلسلہ کلام
کا آغاز کیا جا رہا ہے۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ حق کہنے اور اس پر ثابت رہنے کی
توفیق عطا فرمائے اور میرے بچوں کو بھی اللہ تعالیٰ حق مسکب پر قائم و دائم رکھے!
او ما توفیقی الا باللہ العظیم۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

• شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان اور نہایت رحم والا ہے (مولانا
محمود الحسن)۔

• شروع ساتھ نام اللہ تعالیٰ بخشش کرنے والے مہربان کے۔ (شاہ رفیع الدین)
• شروع اللہ نہایت رحم کرنے والے بار بار رحم کرنے والے کے نام (عبد المجید)
• شروع کرتا ہوں اللہ کے نام سے جو بڑے مہربان اور نہایت رحم والے ہیں۔
(مولانا اشرف علی)۔

• شروع اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے۔ (شاہ عبد القادر)
• شروع خدا کا نام لے کر جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے۔ (فتح محمد)
• اللہ کے نام سے شروع جو بہت مہربان رحمت والا ہے۔ (اعلیٰ حضرت)

تراجم میں فرق اعلیٰ حضرت کے ترجمہ کی خوبی

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ طرف مستقر ہے
جس کا تعلق کسی اسم یا فعل سے کیا جاتا ہے جس کو اپنی طرف سے اختیار کرنا پڑتا ہے۔
اگرچہ کسی احتمال میں اسم ہو یا فعل، خاص ہو یا عام، اول ہو یا آخر۔ اس مقام پر اعلیٰ حضرت

کے ترجمہ میں لفظ اللہ پہلے ہے اور شروع بعد میں لیکن دیگر تراجم میں شروع پہلے اور
لفظ اللہ بعد میں۔ اعلیٰ حضرت کے ترجمہ سے پتا چلتا ہے کہ اس کا تعلق بعد سے ہے۔
اسی ترجمہ کی تائید مدارک سے ملتی ہے جو اس طرح ہے:-

تعلق الیاء بمحذوف تقدیرہ بسم اللہ الرحمن الرحیم اقرا او اتلو
یہاں میں پڑھتا ہوں یا تلاوت کرتا ہوں بعد میں ہے۔ خود ہی مفسر اس کی وجہ بھی
بتاتے ہیں: وانما قدراً المحذوف متأخراً لان الاھم من الفعل والمتعلق بهما
المتعلق بهما وکانوا یبدون باسماء الھتم فیقولون باسم اللات واسم العزى
فوجب ان یقصد الموحّد معنًی ختصاص اسم اللہ عن وجہ بالابتداء و
ذا بتقدیرہ و اتلخیم الفعل وانما قدّم الفعل فی اقرا یا اسم ربك و

لانہا اول سورة نزلت فی قول وکان الھم بالقیارة اھم کان
تقدیرہ الفعل اوقع: یہاں یہ بیان کیا گیا ہے کہ فعل کے مؤخر ہونے
کی وجہ یہ ہے کہ جس کا تعلق ہے فعل سے وہ یہ نسبت فعل کے زیادہ مقصود ہے کیونکہ
کافر اپنے کاموں کی ابتدا میں اپنے معبودان بطلہ کے نام لیا کرتے تھے "باسم اللات"
اور "باسم العزى" کہتے تھے۔ اس لیے مومن کے لائق بھی یہی ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے
اہم گرامی کو اول میں لائے۔ یہ اسی وقت ہوتا ہے جب کہ فعل مؤخر ہو اور اللہ کا اہم گرامی
مقدم۔ اب واضح ہوا کہ اسی نقطہ کے پیش نظر اعلیٰ حضرت نے ترجمہ میں لفظ اللہ کو پہلے
لایا اور شروع بعد میں جس کا دیگر حضرات خیال نہ کر سکے۔

پھر ایک سوال ہوتا ہے کہ اقرا یا اسم ربك میں فعل پہلے کیوں ہے او
لفظ رب بعد میں؟ اس کا جواب یہ دیا گیا ہے کہ یہ سورۃ نزول میں اول ہے، اس
لیے کہ یہاں فعل قرأت اہم ہے لہذا اس کا پہلے ذکر کرنا ہی مناسب ہے۔ اسی وجہ
سے وہاں ترجمہ کرنے وقت پڑھ، پہلے آئے گا اور رب بعد میں۔ اسی طرح مختصر معانی

میں بھی ہے: ولہذا اراى التقديم يفيد الاختصاص والاهتمام، بقصد المحذور
فی بسم اللہ مؤخر اى بسم اللہ افعل کذا البفید مع الاختصاص والاهتمام
لان المشرکین كانوا یبدون باسم الہتم فیقولون باسم اللات وباسم العزى
فقصدا لى موحدا تخصیص اسم اللہ بالابتداء للاهتمام والسرہ علیہم۔

مطلب یہ ہے کہ جب تقدیم طرف تخصیص و اہتمام پر دل ہے۔ اسی وجہ سے
بسم اللہ میں محذوف مؤخر مانا جاتا ہے یعنی بسم اللہ افعل کذا کہا جاتا ہے تاکہ
اختصاص و اہتمام کا فائدہ دے کیونکہ مشرکین اپنے معبودوں کے ناموں سے
اپنے کاموں کی ابتدا کرتے تھے۔ کہتے تھے لات و عزى کے نام سے ہماری ابتدا
ہے۔ مومن اللہ کے نام سے ابتدا کرتا ہے۔ کہتا ہے، اللہ ہی کے نام سے شروع
اس میں تخصیص بھی حاصل ہو جاتی ہے۔ اللہ کے نام کو پہلے لانے میں اہتمام شان
بھی اور کفار کا رد بھی۔ یہ مقصد اسی ترجمہ سے حاصل ہوتا ہے کہ کہا جائے "اللہ
کے نام سے شروع"

الْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ

• سب تعریفین اللہ کے لیے ہیں جو پالنے والا سارے جہان کا۔ (مولانا محمد امجد)
• سب تعریف خدا ہی کو سزاوار ہے جو تمام مخلوق کا پروردگار ہے۔ (فتح محمد)
• سب تعریف واسطے اللہ تعالیٰ کے جو پروردگار عالموں کا۔ (شارفیع الدین)
• سب خوبیاں اللہ کو جو مالک ہے سارے جہان والوں کا۔ (اعلیٰ حضرت)
یہاں اعلیٰ حضرت نے رب کا معنی مالک کیا ہے اور دیگر حضرات نے پالنے والا
معنی کیا ہے۔ اگرچہ رب معنی مرتبی یعنی پرورش کرنے والا بھی استعمال ہوتا ہے
لیکن یہ خاص ہے فقط پرورش کرنے ہی میں مستعمل ہے لیکن مالک عام ہے جو

اس کے ہر قسم کے تصرف کو شامل ہے۔ اسی ترجمہ کی تائید میں جلالین کی عبارت ملاحظہ
ہو: رب العالمین اى مالک جميع الخلق من الانس والجن و
الملئكة والندواب وہ تمام مخلوق کا مالک ہے۔ انسانوں، جنوں، فرشتوں،
جانوروں وغیرہ کا۔ ناظرین کرام سے انصاف کی توقع ہے کہ کون سا ترجمہ تفسیر کے
مطابق ہے یا ان کے لیے سمجھنا کوئی مشکل بات نہیں۔

اهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ

• بتلا ہم کو سیدھی راہ۔ (مولانا محمد امجد)۔ بتلائیے ہم کو رستہ سیدھا۔ (مولانا اثر علی)
• ہمیں سیدھا راستہ دکھا۔ (مولانا مودودی)۔ دکھا ہم کو راہ سیدھی (شاہ فیح الدین)
• ہم کو سیدھا راستہ چلا۔ (اعلیٰ حضرت)

① یہاں اعلیٰ حضرت نے ترجمہ کیا ہے کہ ہم کو سیدھا راستہ چلا اور دیگر ترجمہ میں نے
ترجمہ کیا ہے "سیدھی راہ بتلا"۔ راہ بتلایا دیکھا، یہ دعا کافی نہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ
اور اس کے حبیب نے کفار کو بھی سیدھی راہ بتلائی ہے ہدی للناس سے یہ
واضح ہے۔ بلکہ کامل دعایہ ہے کہ اے اللہ ہمیں سیدھی راہ چلا یعنی اس پر ثابت و قائم
رکھ تفسیر کمالین نے اس مقام پر لکھا ہے: والمستقیم المستوی والمراد به طریق الحق
ومنهلة الاسلام واتباع القرآن یعنی مستقیم کا معنی سیدھا ہے اور مراد اس
سے راہ حق ہے اور اسی کے ضمن میں دین اسلام اور اتباع قرآن ہے۔ اس کے
تحریر کرتے ہیں: فان قيل طلب الهداية من المؤمن وهو المهدى تحصيل
الحاصل قلنا المراد طلب الثبات عليه او حصول المراتب المرتبة عليه والنزادة
على الهدى الذى اعطوه یعنی اگر کوئی سوال کرے کہ یہاں مومن جو پہلے ہی ہدایت
یا قنہ ہے یعنی راہ دکھلایا جا چکا ہے وہ پھر کیسے ہدایت کو طلب کر رہا ہے۔ یہ تو

حاصل شدہ چیز کا پھر سوال ہے۔
 اس کا جواب دیتے ہیں کہ یہاں مراد اس ہدایت پر ثابت رہنا ہے اور جو
 مراتب اس پر مرتب ہیں ان کے حصول کی دعا ہے اور جو ہدایت اسے حاصل ہے
 اس سے اور زیادتی کا سوال ہے۔ یہ صورت انہی وقت حاصل ہو سکتی ہے جب
 ترجمہ ایسا کیا جائے جیسا اعلیٰ حضرت نے کیا ہے کہ اللہ! ہم کو سیدھی راہ چلا یعنی ثابت
 رکھ تاکہ اور مدارج حاصل ہوں۔ صرف راہ دکھانا یا بتلانا یہ کافی نہیں۔ یہ تو کفار کے
 لیے بھی ثابت ہے۔

الْحَمْدُ لِلَّهِ الَّذِي لَمْ يُشْكَ فِيهِ

- یہ کتاب کہ کوئی شبہ اس میں نہیں۔ (عبد الماجد)
- اس کتاب میں کچھ شک نہیں۔ (مولانا محمود الحسن)
- یہ کتاب ایسی ہے جس میں کوئی شبہ نہیں۔ (مولانا اشرف علی)
- اس کتاب میں کچھ شک نہیں۔ (شاہ عبدالقادر)
- یہ اللہ کی کتاب ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں۔ (مولانا مودودی)
- یہ کتاب (قرآن مجید) اس میں کچھ شک نہیں۔ (فتح محمد)
- یہ کتاب ہے کہ نہیں شک بیچ اس کے۔ (شاہ رفیع الدین)
- وہ بلند رتبہ کتاب (قرآن) کوئی شک کی جگہ نہیں۔ (اعلیٰ حضرت)
- اس مقام پر اشارہ بعید کا (ذاک) لگایا گیا ہے نہ کہ قریب کا یعنی ہذا نہیں لایا۔
 حالانکہ بظاہر ہذا ہی لانا چاہیے تھا جس کا معنی ہوتا "اس" لیکن مقام قریب میں جب
 اشارہ بعید کا لایا جائے وہ بلندی مرتبت عظمت شان پر دال ہوتا ہے۔ اس ضابطہ
 پر اعلیٰ حضرت کا ترجمہ ہی صحیح صادق آتا ہے دیگر تراجم اس پر صادق نہیں آ رہے کیونکہ

اعلیٰ حضرت کا ترجمہ واضح ہے "وہ بلند کتاب" بلند رتبہ کتاب یہ اشارہ بعید سے
 سمجھ میں آتا ہے۔ اس پر تفسیر صاوی کی عبارت ملاحظہ ہو: اِیْ هَذَا الْمَثَلِ اِنْ شَاءَ اللهُ
 اِلَى اَنْ حَقَّ اِلْتِمَاعُ اَنْ يَتَوَقَّى بِهَا الْقَرِيبَ وَ اِنْ مَاتِ بِهَا يَدُ عَلَى الْبَعِيدِ
 لِلْعَظِيمِ لَكُنَّ الْقُرْآنُ مَوْضُوعُ التَّوْبَةِ وَ عَظِيمُ الْقُدْرَةِ
 یعنی صاحب جلالین نے ہذا کا لفظ ذکر کر کے اشارہ کیا ہے کہ یہاں حق یہ تھا کہ
 اشارہ قریب ہوتا لیکن اشارہ بعید لایا عظیم کے لیے اس لیے کہ قرآن پاک رفیع القدر
 ہے اور عظیم القدر ہے۔ یہ معنی اعلیٰ حضرت کے ترجمہ سے واضح ہے۔ اس ضابطہ کو
 مختصر معانی میں بھی پیش کیا گیا ہے اور عظیم بالبعد نحو المذکور لکھتے ہیں
 بعد درجہ و رفعت محلہ منزلت بعد المسافة یعنی مسند الیہ کو معرفۃ اشارہ بعید
 کے ساتھ لانے کا یہ قاعدہ ہے۔ وہ بلندی رتبہ اور رفعت مقام پر ایسا ہی دال ہے
 جس طرح مسافت بعیدہ پر دال ہے۔ لاریب فیہ کا ترجمہ اعلیٰ حضرت نے کیا ہے:
 "کوئی شک کی جگہ نہیں" لیکن باقی تراجم اس میں کوئی شک نہیں۔ اس میں کوئی شبہ
 نہیں۔ دیگر تراجم سے یہ واضح نہیں کہ اس میں شک نہیں ہوتا چاہیے یا اس میں کسی
 نے شک کیا ہی نہیں بیضاوی کی تفسیر دیکھنے کے بعد اعلیٰ حضرت کے ترجمہ کی فوقیت
 واضح ہو جائے گی بیضاوی کی عبارت یہ ہے:۔۔ لاریب فیہ: معناه انہ
 لو ضوحوه و سطوح برهانہ بحیث لا یرتاب العاقل بعد النظر الصحیح
 بکونہ وحیا بالعاقل الذی لا ان احدا الا یرتاب فیہ الا تری الی قولہ
 تعالیٰ و ان کنتم فی سرب مساکن لنا علی عبدنا
 الایۃ یعنی قرآن پاک کے واضح ہونے کی وجہ سے اور روشن دلائل کے ہوتے ہوئے
 بعد از نظر صحیح عاقل اس کے وحی اور حد اعجاز تک پہنچنے میں شک نہیں کر سکتا۔ اس
 کا مطلب یہ نہیں کہ کوئی شک نہیں کرتا یا کسی نے کیا بھی نہیں حالانکہ قرآن پاک میں

لوگوں نے شک کیا ہے جس پر وان کستم فی سبیب مما نزلنا علی عبدنا الیہ
 شاہد ہے۔ علامہ بیضاوی کی اس عبارت کی وضاحت میں شیخ زادہ کی عبارت یہ
 ہے: جواب عما یقال کیف یصح نفی جنس الریب عنه مع کثرة
 المتباہین و کثرة المراتب تستلزم کثرة السبیب یعنی علامہ بیضاوی نے سوال کا
 جواب دیا ہے کہ یہاں لافنی جنس تو جنس ریب کی نفی کر رہا ہے جو صحیح نہیں کیونکہ
 مراتب میں (شک کرنے والے) تو کثیر ہیں اور کثرة مراتب میں کثرت ریب کو مستلزم ہے۔
 یعنی زیادہ شک کرنے والوں کا ہونا شک کے زیادہ ہونے کو مستلزم ہے۔ علامہ
 بیضاوی کا جواب اوپر ذکر ہو چکا ہے۔ اب اعلیٰ حضرت کے ترجمہ کو دیکھیں تو پتا چلتا ہے
 کہ آپ نے اسی سوال و جواب کو مد نظر رکھتے ہوئے یہ ترجمہ کیا ہے، کوئی شک کی
 جگہ نہیں۔ اس ترجمہ پر بعینہ شیخ زادہ کی عبارت دال ہے۔ شیخ زادہ میں ہے:
 فظہر ان معنی نفی الریب عنه نفی کونه محلا لمظنة لثبوتہ لا ان
 احدا لا یسر تاب فیہ پس ظاہر ہوا کہ معنی یہ ہے کہ قرآن پاک
 شک کا محل (جگہ) نہیں۔ یہ معنی نہیں کہ کسی نے اس میں شک کیا بھی نہیں۔ اب
 اعلیٰ حضرت کے ترجمہ کی فوقیت محتاج بیان نہیں۔

يُخَدِّعُونَ اللَّهَ وَالدِّينَ اَمَنُوا (۱)

• چال بازی کرتے ہیں اللہ سے اور ان لوگوں سے جو ایمان لائے ہیں۔ (مولانا اشرف علی)

• فریب دیتے ہیں اللہ کو اور ان لوگوں کو کہ ایمان لائے (شاہ رفیع الدین)

• دغا بازی کرتے ہیں اللہ سے اور ایمان والوں سے۔ (مولانا محمود الحسن)

• دغا بازی کرتے ہیں اللہ سے اور ایمان والوں سے۔ (شاہ عید القادری)

• وہ اللہ اور ایمان لانے والوں کے ساتھ دھوکا بازی کر رہے ہیں (مولانا مودودی)
 • فریب دیا جاتے ہیں اللہ اور ایمان والوں کو (اعلیٰ حضرت)

اس مقام پر اعلیٰ حضرت کے ترجمہ سے یہ پتا چلتا ہے کہ وہ منافقین ظاہر ایمان
 لاکر اور باطناً کافر وہ کہ اللہ تعالیٰ کو اور ایمان والوں کو اپنے خیال میں دھوکا دینا
 چاہتے ہیں یعنی حقیقتاً وہ دھوکا نہیں دے سکتے لیکن باقی تراجم سے پتا چلتا ہے کہ
 وہ اللہ سے دغا بازی کرتے ہیں یا چال بازی کرتے ہیں۔ اس طرح کے ترجمہ سے بھی
 پتا چلتا ہے کہ وہ فی الواقع اس دغا بازی میں کامیاب ہیں حالانکہ یہ درست نہیں۔

تفسیر کے مطابق اعلیٰ حضرت کا ترجمہ ہی درست ہے۔ تفسیر کبیر میں ہے: وہی الختم
 کیف خادعوا اللہ تعالیٰ فلقاللہ ان یقول ان خادعة اللہ تعالیٰ ممتنعة من وجہین
 الاول انہ تعالیٰ یعلم الصائر والسرائر فلا یجوز ان یخادع لہ الذی فعلوہ لواظہر وان
 الباطن بخلاف الظاہر لم یکن ذلک خادعا فاذا کان اللہ تعالیٰ لا یخفی علیہ البواطن لم یصح
 ان یخادعہ والثانی ان المنافقین لم یعتقدوا ان اللہ بعث الرسول لہم فلم یکن قصدہم فی
 نفاقہم بخدعة اللہ تعالیٰ فثبت انہ لا یمکن اجراء هذا اللفظ علی ظاہرہ
 بل لابد من التاویل

یہاں سوال یہ ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کو دھوکا دینا تو ممتنع ہے۔ ایک وجہ تو
 یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ دلوں کی باتیں اور چھپی ہوئی کو جانتا ہے جب کہ منافق باطن کو
 ظاہر سے پوشیدہ رکھ کر کیسے اللہ تعالیٰ سے دغا کر سکتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ سے
 باطن کو چھپانا ممکن نہیں تو دغا کیسے ممکن ہے؟ دوسری وجہ یہ ہے کہ منافقوں
 کا یہ عقیدہ ہی نہیں تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کی طرف مبعوث فرمایا
 لہذا ان کا اپنے نفاق میں اللہ تعالیٰ سے دغا بازی کرنے کا اعتقاد ہی نہیں تھا پس
 ثابت ہوا کہ اس لفظ کو ظاہر پر رکھنا ممکن نہیں بلکہ اس کی تاویل ضروری ہے اس

سے جواب میں دو تاویلیں پیش کی گئی ہیں۔ دوسرے تراجم کے مطابق کوئی تاویل بھی نہیں البتہ علحضرت کے ترجمہ کو ایک تاویل کے مطابق کرنا ہی صحیح بھی ہے اور شان الوہیت کے مطابق ہے۔ وہ تاویل یہ ہے: **الثانی ان یقال صورة عالم مع الله حيث یظهرون الايمان و هم کافرون صورة من یخادع** وہ اپنے ایمان کو ظاہر کرتے ہیں اور حقیقت میں وہ کافر ہیں۔ لہذا ان کا معاملہ اللہ سے ایسا ہے جس طرح دغا بازی کرنے والے کا ہوتا ہے یعنی وہ اپنے خیال میں دغا بازی کرتا چاہتے ہیں یہ نہیں کہ دغا بازی کرتے ہیں کیونکہ رب تعالیٰ سے دغا بازی ممکن ہی نہیں۔

اسی طرح ابو سعور میں ہے: **ان الخدعة والحيلة والمکر و اظہار خلاف الباطن** خفی بمنزلة النفاق و هو مستحيلة فی حق الله تعالى وصیفة المفاعلة تقتضی المشاركة فاشار الخ جوابہ بما ذکرنا محصلہ انہا ہنہنا لیست علی بابہا وقولہ و ذکر اللہ جواب سوال اخر تقدیرہ کیف یخادع اللہ ای یحتال علیہ و هو یعلم الضمان فکیف قیل یخادعون اللہ فاجاب عندہ بما ذکرنا محصلہ ان الایۃ من قبیل الاستعارة التمثیلیۃ حیث شبہ حالہم فی معاملتہم اللہ بحال المخادع مع صاحبه من حیث القبح یہاں دو قسم کے سوال وارد ہوتے ہیں۔ ایک سوال یہ وارد ہوتا ہے کہ یخادعون اللہ منہا دعوت سے لیا گیا ہے۔ یہ یاب مفاعلہ سے ہے۔ وہ ثمر کثرت جانہیں کو چاہتا ہے جس کا مطلب یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ بھی مکر، حیلہ، دغا بازی کرتا ہے حالانکہ اللہ تعالیٰ کی شان کے یہ لائق نہیں۔ اس کا جواب یہ دیا گیا ہے کہ یہاں منہا دعوت مثرت کے لیے استعمال نہیں بلکہ ایک ہی جانب سے استعمال ہے۔ پھر سوال ہوا کہ یہ کہتا بھی ممکن نہیں کہ وہ اللہ تعالیٰ سے دغا بازی کرتے ہیں کیونکہ دغا باز تو اپنی چال بازیوں

کو دوسرے سے مخفی رکھتا ہے حالانکہ اللہ تعالیٰ تو اسرار اور مخفی اشیاء پر مطلع ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ یہاں استعارہ تمثیلیہ ہے جس طرح دغا باز بُرائی کا ترکیب ہوتا ہے اسی طرح یہ اللہ تعالیٰ سے اپنے خیال سے اپنے معاملہ میں بُرائی کے ترکیب ہو رہے ہیں۔ اب بات واضح ہے کہ دغا بازی حقیقت میں نہیں کرتے تھے بلکہ اپنے خیال میں کرتا چاہتے تھے۔ لہذا علحضرت کے ترجمہ میں خوبی کا واضح ہونا مخفی نہ نہ رہا بلکہ روبرو روشن کی طرح عیاں ہو گیا۔

اللہ یستہزی بہم و یمدھم فی طغیانہم یعمہون (پ ۶)

• اللہ ہنسی کرتا ہے ان سے اور ترقی دیتا ہے ان کو ان کی سرکشی میں (اور) حالت یہ ہے کہ وہ عقل کے اندھے ہیں۔ (مولانا محمود الحسن)

• اللہ ہنسی کرتا ہے ان سے اور بڑھاتا ہے ان کو ان کی شرارت میں بہکے ہوئے۔ (شاہ عبدالقادر)

• اللہ ان سے مذاق کر رہا ہے وہ ان کی رستی دراز کیے جاتا ہے اور یہ اپنی سرکشی میں اندھوں کی طرح بھٹکے جاتے ہیں۔ (مولانا مودودی)

• ان (منافقوں) سے خدا ہنسی کرتا ہے۔ (فتح محمد)

• اللہ ٹھٹھا کرتا ہے ان سے اور کھینچتا ہے ان کو بیچ سرکشی ان کی بہکتے ہیں۔ (شاہ رفیع الدین)

• انھیں اللہ نیارہا ہے۔ (عبدالماجد)

• اللہ ان سے استہزاء فرماتا (جیسا اس کی شان کے لائق ہے) اور انھیں ڈھیل دیتا ہے کہ اپنی سرکشی میں بھٹکتے رہیں۔ (علحضرت)

اعلیٰ حضرت نے ترمیم کیا ہے کہ اللہ ان سے استہزاء فرماتا ہے جیسا اس کی شان کے لائق ہے۔ یہ ہی معنی مناسب ہے اور اللہ تعالیٰ کی شان کے لائق ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ

ہنسی مذاق، ٹھٹھا نہیں کرتا۔ ان الفاظ کو اس کی طرف منسوب کرنا غلط ہے۔ اس پر مدارک کی عبارت ملاحظہ ہو :

اللہ یستہزیئ بہم ای یجازہم علی استہزاء شہم فسمی جزاء الاستہزاء باسمہ کقولہ تعالیٰ وجزاء سیئۃ سیئۃ مثلمہا فن اعتدی علیکم فاعتدوا علیہم فسمی جزاء السیئۃ سیئۃ وجزاء الاعتداء اعتداء وان یکن الجزاء سیئۃ واعتداء وهذا لان الاستہزاء علی اللہ تعالیٰ لا یجوز من حیث الحقیقۃ لانہ من باب المعیث وهو علی عند اللہ تعالیٰ کے استہزاء کا یہ مطلب ہے کہ وہ ان کو جزائے استہزاء دیتا ہے جس طرح اللہ تعالیٰ نے یرائی کے بدلے کو یرائی سے اور حد سے تجاوز کے بدلے کو تجاوز سے تعبیر فرمایا حالانکہ فی الواقع وہ جزاء یرئی یا تجاوز نہیں۔ اسی طرح یہاں بھی استہزاء کے بدلے کو استہزاء سے تعبیر فرمایا گیا۔ (گویا یہی اس کی شان کے لائق ہے) کیونکہ حقیقتاً ہنسی کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف جائز نہیں کیونکہ ہنسی مذاق یہ ایک بے فائدہ کھیل ہے۔ اللہ تعالیٰ معیث، بے فائدہ کام کرنے سے ملذوب والا ہے۔ اسی طرح ویمدہم کا ترجمہ حضرت کا یہ ہے ان کو مہلت دیتا ہے۔ یہ تفاسیر کے مطابق ہے جلالین مدارک میں ویمدہم کا معنی یہ مہلہم کیا گیا ہے جس کا مطلب ہے ان کو مہلت دیتا ہے۔ ایسے ہی یعمدون کا ترجمہ بھی حضرت کا ہی تفاسیر کے مطابق ہے۔ کیونکہ اعلیٰ حضرت نے ترجمہ کیا ہے بھٹکتے رہیں، چونکہ تفاسیر میں یترون دون تخبوا ترجمہ کیا گیا ہے جس کا اردو میں مطلب بھٹکتے رہیں، زیادہ مناسب ہے۔ بعد المایہ کا ترجمہ لذت اور مراد دونوں کے مخالف استہزیئ کا ترجمہ بنا رہا ہے غلط ہے۔

وَمَا كَانُوا مُهْتَدِينَ (پ ۶)

اور نہ ہوئے وہ راہ پاتے والے۔ (مولانا محمود الحسن)

اور نہ یہ ٹھیک طریقہ پر چلے۔ (مولانا اشرف علی) اور یہ ہرگز صحیح راستے پر نہیں ہیں۔ (مولانا مودودی) اور نہ وہ ہدایت یاب ہی ہوئے۔ (فتح محمد) اور نہ راہ پاتے (شاہ عبدالقادر) اور وہ سودے کی راہ جانتے ہی نہ تھے۔ (اعلیٰ حضرت) اور نہ ہوئے راہ پاتے والے (شاہ رفیع الدین) اور نہ وہ راہ یاب ہوئے۔ (عبدالماجد)

اعلیٰ حضرت کے ترجمہ کو تفاسیر کے آئینہ میں دیکھیں فیض اللہ تعالیٰ صاف و شفاف نظر آئے گا۔ مدارک میں ہے : و مَا كَانُوا مُهْتَدِينَ لطريق التجارة وہ طریقہ تجارت کی راہ نہیں جانتے تھے، جلالین میں ہے : و مَا كَانُوا مُهْتَدِينَ فيما فعلوا اس پر حاشیہ میں ہے فيما فعلوا ای طریقہ التجارۃ مقصد اس کا بھی یہ ہی ہے کہ وہ طریقہ تجارت کو نہیں جانتے تھے بیضاوی شریف میں ہے :

وَمَا كَانُوا مُهْتَدِينَ لطريق التجارة فان المقصود منها سلامة سرائل المال والربح وهو لا يعد اذ اصابوا الطلاب بنين لأن سرائل ما لهم كان الخطر في السليمة والعقل الصرف فلما اعتقدوا هذه الضلالت بطل استغدادهم واختل عقلهم ولم يبق لهم سرائل مال يتوسلون به الى درك الحق ونيل الكمال فبقوا خاسرين آيسين من الربح فاخذوا من الدار.

یعنی وہ تجارت (سودے) کی راہ نہیں جانتے تھے کیونکہ تجارت میں مقصد یہ ہوتا ہے کہ اصلی سرمایہ محفوظ رہے اور نفع بھی حاصل ہو اور ان لوگوں نے دونوں کو ضائع کر دیا کیونکہ اصل ان کا سرمایہ فطرت سلیمہ اور عقل خاص تھا لیکن اعتقاد باطل کی وجہ سے ان کی استعداد باطل ہو گئی عقلوں میں فتور آگیا اور ان کا اصلی سرمایہ جو حق کو پاتے اور حصول کمالات کا ذریعہ تھا وہ ضائع ہو گیا پس اس طرح وہ اصل مال کے ضائع کرنے کی وجہ سے خسارے میں ہوئے اور نفع سے محروم ہوئے۔

یظنون کی تفسیر یقینوں سے کی گئی ہے اس لیے کہ حضرت عبداللہ کی قرأت میں جملہ ان آیات پر یہ ہے کہ وہ یقین کرتے ہیں کہ بے شک ضرور اللہ سے ملاقات ہوتی ہے اور ضرور جزا حاصل ہوتی ہے اور جس کو یہ یقین ہو اس کو یہ یقین کافی ہے وہ نماز کو گراں نہیں جانے گا لیکن جس کو یقین نہیں ہو گا جزا کا اس کو ثواب کی امید نہیں ہوگی۔ اس پر نماز خالص مشقت ہوگی۔

اسی طرح شیخ زادہ علی البیضاوی میں بیان کیا گیا ہے :- بیان لوجہ استعجال الظن بمعنی یقین مع ان الظن هو الاعتقاد الراجح الذی یحتمل النقص والیقین هو الاعتقاد الراجح الذی لا یحتمل النقص فانہما الماتشابهان من حیث ان کل واحد منهما اعتقاد راجح صم ان یستعاد کل واحد منهما للاختصاص بحسب اقتضاء المقام فاستعبر لفظ الظن ہما بمعنی یقین

یہاں یہ وجہ بیان کی جا رہی ہے کہ ظن بمعنی یقین ہے اس لیے کہ ظن کہتے ہیں اعتقاد راجح کو جو نقص کا احتمال رکھے یقین کہتے ہیں اعتقاد راجح کو جو نقص کا احتمال نہ رکھے۔ اس لیے دونوں میں اعتقاد راجح پایا گیا ہے لہذا یہ دونوں ایک دوسرے کے مشابہ ہیں اس لیے ہر دو کو ایک دوسرے کی جگہ مجازاً استعمال کیا جاتا ہے۔ یہاں ظن بمعنی یقین ہے۔ اسی طرح جلالین میں بھی یظنون کی تفسیر یقینوں سے کی گئی ہے اور پھر اس پر حاشیہ میں یہ ہے :- (اشارة الی ان الظن ہما بمعنی یقین یعنی یہاں یہ اشارہ ہے کہ ظن بمعنی یقین ہے۔ اب تفاسیر کی عبارات دیکھنے سے اعلیٰ حضرت کے ترجمہ کی فوقیت مخفی نہ رہی بلکہ خوبی واضح ہو گئی۔

اسی طرح فاشعین کا ترجمہ اعلیٰ حضرت نے کیا ہے "جو دل سے میری طرف جھکتے ہیں" یہ زیادہ واضح اور مناسب ہے یہ نسبت عاجز اور دل سے پھلے کے

عاجز اردو زبان میں مختلف معانی میں استعمال ہوتا ہے جیسا کہ غریب محتاج بے دست و پا کسی کام کو کرنے کی طاقت نہ رکھنا۔ ان تمام معانی پر لفظ عاجز کا اطلاق ہوتا رہتا ہے۔ اسی طرح دل سے پھلنا غیر معروف ہے۔ اعلیٰ حضرت کا ترجمہ معروف ہے اور اس میں کسی اور معنی کا وہم نہیں اور تفسیر کے مطابق بھی۔ جلالین میں ہے: الساکنین الی الطاعة اور جمل میں ہے الساکنین الی طاعة اللہ اور معالم التنزیل میں ہے: فالخاشع ساکن الی طاعة اللہ ان تفاسیر کی عبارات کا مشترکہ مفہوم یہی ہے کہ جو اللہ کی اطاعت کی طرف جھکتے ہیں یعنی دل سے میری طرف جھکتے ہیں۔

اُسْكُنْ پ ۴

رہا کرو۔ (مولانا محمود الحسن)۔ رہا کرو (شاہ عبدالقادر)۔ رہا کرو (مولانا اشرف علی)۔ رہو۔ (اعلیٰ حضرت)

وَاتَّقِ الزَّكَاةَ پ ۴

دیا کرو زکوٰۃ۔ (مولانا محمود الحسن)۔ دیا کرو زکوٰۃ۔ (شاہ عبدالقادر) اور زکوٰۃ دیا کرو۔ (فتح محمد) اور زکوٰۃ دیا کرو۔ (عبدالماجد) اور زکوٰۃ دو (اعلیٰ حضرت)۔

رہا کرو اور دیا کرو زکوٰۃ اردو محاورہ میں ایک کام کو جاری رکھنا اور اس میں تکرار کا ہونا سمجھ میں آتا ہے حالانکہ اصول فقہ میں ایک ضابطہ پیش کیا جاتا ہے کہ امر تکرار کو نہیں چاہتا بلکہ عبادات تکرار اسباب سے متکرر ہوتی ہے لیکن یہاں تو امر کا ایسا ترجمہ کیا گیا ہے جو تکرار پر دال ہے لیکن اعلیٰ حضرت کے ترجمہ میں تکرار نہیں۔

اور تحقیق میں نے بزرگی دی تم کو اوپر عالموں کے۔ (شاہ رفیع الدین)
 کہ میں نے تم کو تمام دنیا جہان والوں پر فوقیت دی تھی۔ (مولانا شرف علی)
 اور یہ کہ اس سارے زمانہ میں تمہیں بڑائی دی۔ (اعلیٰ حضرت)
 یہاں بنی اسرائیل کا ذکر کیا جا رہا ہے۔ انہیں رب تعالیٰ نے اپنے اہتمام
 یاد دلائے اور فرمایا: **وَإِنِّي فَضَّلْتُكُمْ عَلَى الْعَالَمِينَ** اب اگر ترجمہ یہ کیا جائے، تم
 کو بڑائی دی تمام عالم پر۔ اس سے یہ واضح نہیں ہوتا کہ بنی اسرائیل کو فضیلت صرف
 اپنے زمانہ میں دوسروں پر تھی کہ ہر زمانہ میں انہیں دوسروں پر فضیلت دی گئی۔ بلکہ
 اس طرح کے ترجمہ کو دیکھ کر قوی دہم ہوتا ہے کہ ان کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی
 امت پر بھی فضیلت حاصل ہے۔ لیکن اعلیٰ حضرت کے ترجمہ سے یہ عقدہ حل ہو جاتا
 ہے کہ ان کو فضیلت صرف ان کے زمانہ میں دوسروں پر حاصل رہی نہ کہ بعد میں آنے
 والوں پر بھی۔ اس پر تائید جلالین میں دیکھیں۔ عالمین کی تفسیر اسی عالمی زمانہ ہم
 سے کی گئی ہے کہ انہیں زمانہ میں اوروں پر فضیلت دی گئی تھی۔ اور اس کی زیادہ
 وضاحت کمالین میں ہے جو اس طرح ہے: **وَيَعْنِي لَيْسَ الْمَرَادُ بِالْعَالَمِ**
جَمِيعِ مَا سِوَى امَّةِ لَيْسَ مَفْضَلًا عَلَيْهِمْ عَلَى هَذِهِ امَّةِ اَمَّا مَحْمُودُ صَلَّى اللہ
عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الْمَرَادُ بِالْعَالَمِ كُلِّ مَوْجُودٍ سِوَاهُ فِي ذَالِكَ الْوَقْتُ۔

یعنی عالم سے مراد اللہ تعالیٰ کے بغیر جمع اشیاء نہیں تاکہ ان کی فضیلت نبی کریم کی امت
 پر لازم نہ آئے بلکہ عالم سے مراد اس وقت ان کے بغیر جو بھی تھے ان پر انہیں فضیلت
 دی گئی۔ ان تفسیر کی روشنی میں اعلیٰ حضرت کے ترجمہ کی برتری کا انکار کیسے کیا جائے؟
 اسی طرح ۲۵ **ع** **وَفَضَّلْنَاهُمْ عَلَى الْعَالَمِينَ** کے ترجمہ میں بھی مترجمین سے
 اعتراض ہوئی۔

حاشی میں ہے: **وَلَا مَوْجِبٌ لَهُ فِي التَّكْرَارِ وَلَا يَحْتَمِلُهُ**۔ کہ امر
 میں تکرار ہونا ہے اور نہ تکرار کا احتمال جب امر میں تکرار کا احتمال تک نہیں تو ایسا
 ترجمہ جس میں صراحتہً تکرار سمجھ رہا ہو، کیسے صحیح ہوگا؟ حاشی کی اسی عبارت پر نامی
 میں یہ ہے **فَاِذَا قِيلَ صَلِّ كَانْ مَعْنَاهُ اَفْعَلْ فَعَلِ الصَّلَاةُ لَا يَقْتَضِي**
ذَلِكَ التَّكْرَارَ وَلَا يَحْتَمِلُهُ یعنی اگر کسی کو کہا جائے صَلِّ تو اس کا
 معنی ہوگا اَفْعَلْ فَعَلِ الصَّلَاةُ مَرَّةً تو ایک دفعہ نماز ادا کر کیونکہ امر نہ تکرار کا
 مقتضی ہے اور نہ ہی اس کا احتمال رکھنا ہے۔ البتہ تکرارِ صلوٰۃ تکرارِ اسباب کی وجہ
 سے ہے یعنی جب بھی نماز کا وقت آئے گا، نماز لازم ہوگی۔ تو وقت کے بار بار آنے
 کی وجہ سے بار بار نماز لازم ہوگی، امر کے تکرار کی وجہ سے نہیں۔ یہاں بھی اسی ضابطہ
 کے مطابق یہ کہا جاسکتا ہے کہ اتوانہ زکوٰۃ کا مطلب یہ ہے کہ ایک دفعہ زکوٰۃ دینا
 ثابت ہے اس امر سے البتہ ہر سال زکوٰۃ اس لیے لازم ہوگی کہ اس کے پاس اتنی
 مقدار میں مال ہے جس پر زکوٰۃ لازم آتی ہے اور اس پر سال گزر چکا ہے۔ تو یہ
 زکوٰۃ کا تکرار سبب کے تکرار کی وجہ سے ہے۔ اعلیٰ حضرت کا ترجمہ اسی اعتراض سے
 محفوظ ہے کہ امر تکرار کو نہیں چاہتا تو ایسا ترجمہ کیوں کیا ہے جس سے تکرار سمجھ میں
 آ رہا ہے۔ آپ کا ترجمہ تکرار کا معنی نہیں دے رہا۔

وَإِنِّي فَضَّلْتُكُمْ عَلَى الْعَالَمِينَ ۚ

- ① اور اس کو کہ میں نے تم کو بڑائی دی تمام عالم پر۔ (مولانا محمود الحسن)
 تمہیں دنیا کی ساری قوموں پر فضیلت دی تھی۔ (مولانا مودودی)
 اور یہ کہ میں نے تم کو جہان کے لوگوں پر فضیلت بخشی تھی۔ (فتح محمد)
 اور وہ جو میں نے تم کو بڑا کیا جہان کے لوگوں سے۔ (شاہ عبد القادر)

وَلَا يَقْبَلُ مِنْهَا شَفَاعَةٌ (پ ۶)

اور قبول نہ ہو اس کی طرف سے سفارش۔ (مولانا محمود الحسن)
 نہ کسی کی طرف سے سفارش قبول ہوگی۔ (مولانا مودودی)
 اور نہ کسی کی سفارش منظور کی جائے۔ (فتح محمد)
 اور قبول نہ ہو اس کی طرف سے سفارش۔ (شاہ عبدالقادر)
 اور نہ قبول کی جائے اس سے سفارش۔ (شاہ رفیع الدین)
 اور نہ کسی شخص کی طرف سے کوئی سفارش قبول ہو سکتی ہے۔ (مولانا اشرف علی)
 اور نہ کسی کے حق میں سفارش قبول ہوگی۔ (عبدالماجد)
 اور نہ کافر کے لیے کوئی سفارش مافی جائے۔ (اعلیٰ حضرت)
 یہاں اعلیٰ حضرت کے ترجمہ سے یہ واضح ہو رہا ہے کہ کافروں کے لیے کسی کی
 سفارش قبول نہیں لیکن دیگر تراجم سے یہ سمجھ آتا ہے کہ کسی کی سفارش کسی کے لیے
 نہیں ہوگی حالانکہ یہ درست نہیں کیونکہ ایمان والوں کے لیے انبیاء، شہداء، صلحاء،
 سفارش فرمائیں گے۔ اعلیٰ حضرت کے ترجمہ کی تائید مدارک سے اس طرح ملتی ہے:
 لَا يَقْبَلُ مِنْهَا شَفَاعَةٌ لِّلْكَافِرِينَ وَقِيلَ كَاذِبٌ اَلَيْسَ اِنَّ اَبَاءَهُمْ
 الْاَنْبِيَاءَ يَشْفَعُونَ لَهُمْ قَالُوا لَيْسَ اَوْ هُوَ كَقَوْلِهِ فَمَا تَسْغَعُهُمْ شَفَاعَةُ
 الشَّافِعِينَ تَشْلُكُ الْمَعْتَزِلَةَ بِالْاِيَةِ فِي نَفْيِ الشَّفَاعَةِ لِلْعَصَاةِ مَرْدُودِ
 لَانِ الْمَنْفَعِي شَفَاعَةُ الْكَفَّارِ فَقَدْ قَالَ عَلَيْهِ السَّلَامُ شَفَاعَتِي اَهْلُ الْكِبَايَرِ مِنْ اَهْلِ
 لَعْنِي كَافِرُونَ كَيْ لِي شَفَاعَتِ قَبُولِ نَحِيں كِي جَانِكِي۔

تفسیر کبیر میں اسی آیت کریمہ کے ماتحت بہت بسیط بحث کی گئی ہے۔ معتزلہ
 منکرین شفاعت کے دلائل اور ان کا رد پیش کیا گیا ہے۔ تمام بحث کا ذکر کرتا تو اس مختصر

میں نہیں البتہ مختصر طور پر ذکر کی جا رہی ہے۔

اجمعنا الامۃ علی ان لمحمد صلی اللہ علیہ وسلم شفاعۃ فی الآخرة وحمل
 علی ذلک قولہ تعالیٰ عسی ان یبغثک ربک مقاماً محموداً وقولہ تعالیٰ
 ولسوف یعطیک ربک فترضی ثم اختلفوا بعد ہذا فی ان شفاعۃ
 علیہ السلام لمن تكون للمؤمنین المستحقین للثواب ام تكون
 لاهل الکبائر المستحقین للعقاب۔ فذهب المعتزلۃ علی انہا
 للمستحقین للثواب وتأثیر الشفاعۃ فی ان تحصل فی اید من المنافع
 علی قدر ما استحقوه وقال اصحابنا تاثیر ہا فی اسقاط العذاب عن
 المستحقین للعقاب اما بان یشفع لهم فی عرصة القیامۃ حتی
 لا یدخلوا النار وان دخلوا النار فیشفع لهم حتی ینخرجوا
 منها ویدخلوا الجنة والتفقوا علی انہا لیست ککفار۔
 نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو آخرت میں شفاعت کے حامل ہونے پر امت کا اجماع
 ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی عسی ان یبغثک ربک مقاماً محموداً اور اللہ تعالیٰ
 کا قول ولسوف یعطیک ربک فترضی اس پر دال ہیں۔ پھر اس میں اختلاف
 ہے کہ یہ شفاعت صرف مومنوں کو نفع دے گی جو مستحق ثواب ہیں یا کہ کبیرہ گناہوں کے
 مرتکبین جو عذاب کے مستحق ہوں گے ان کو بھی نفع دے گی۔ معتزلہ کا مذہب یہ ہے کہ
 یہ شفاعت صرف ان مومنوں کو نفع دے گی جو ثواب کے مستحق ہوں گے شفاعت
 کا فائدہ ان کو یہ ہوگا کہ ان کے ثواب اور منفعت میں ان کو مستحقان سے زیادتی حاصل
 ہوگی لیکن جمہور اہل سنت کا مذہب یہ ہے کہ مستحقین عذاب سے عذاب کے محاف
 کرنے میں یہ شفاعت فائدہ دے گی۔ یا تو میدانِ حشر میں ہی ان کے لیے شفاعت ہو
 گی۔ لہذا ان کو جہنم کی آگ میں نہیں داخل کیا جائے گا اور یا ان کے جہنم میں داخل ہونے

کے بعد شفاعت ہوگی جس کی وجہ سے ان کو جہنم کی آگ سے نکال دیا جائے گا۔ البتہ کافروں کے حق میں شفاعت کے نہ ہونے میں اتفاق یعنی کافروں کے لیے انبیائے کرام یا صلحاء نے شفاعت کرنی ہی نہیں کہ ان کو نفع دے۔ معزز کہ نے گنہگاروں کے لیے شفاعت کی نفی پر جو اعتراض کیے علامہ رازی نے ان کا رد کیا ہے۔ ایک اُن کی دلیل یہ ہے: ولا یقبل منها شفاعة وهذه نكرة فی سیاق النفی فتعم جمیع انواع الشفاعة اس مقام پر شفاعت نکرہ ہے اور سیاق نفی میں ہے چونکہ نکرہ تحت نفی عموم کا فائدہ دیتا ہے لہذا شفاعت کی تمام قسموں کی نفی ہو جائے گی یعنی کوئی شفاعت نہیں کر سکے گا۔ اس کا جواب اس طرح دیا گیا حسب (ہذا باطل) ان العبارة بمعنی اللفظ لا بخصوص السبب الا ان تخصیص مثل هذا العام بذات السبب المخصوص یکفی فی ادنی دلیل فاذا قامت الدلائل الدالة علی وجود الشفاعة وجب التخصیص یہ دعویٰ باطل ہے کہ اعتبار عموم لفظ کا ہے خصوصی سبب کا نہیں اس لیے کہ عام کو خصوصی سبب سے کسی ادنی دلیل کے پیش نظر بھی خاس کرنا صحیح ہوتا ہے اور جب وجود شفاعت پر واضح دلائل موجود ہیں تو اس کو خاص کرنا ضروری ہے مطلب یہ ہوا کہ عموم لفظ کا اعتبار اس وقت ہوتا ہے جب اس کی تخصیص پر کوئی دلیل قائم نہ ہو سکے۔ اسی طرح ایک اور دلیل منکرین شفاعت نے یہ پیش کی: ما للظالمین من جمیع ولا شفیع یطاع والظالم هولاء فی بالظلم وذلك یتناول الکافر وغیرہ یعنی اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ظالموں کا کوئی مددگار نہیں اور نہ ہی ان کا شفاعت کرنے والا جس کی بات مانی جائے۔ اللہ تعالیٰ کا یہ حکم ظالموں کے متعلق ہے اور ظالم وہ ہے جو ظلم کرے۔ یہ کافر اور غیر کافر سب کو شامل ہے۔ لہذا پتا چلا کہ فاسقوں کی کوئی شفاعت نہیں کر سکے گا۔ اس کا جواب اسی طرح دیا گیا: فالجواب عن ان قوله ما للظالمین من جمیع ولا شفیع نفیض لقولنا للظالمین جمیع وشفیع لکن قولنا

للظالمین جمیع وشفیع موجبة کلیة ونفیض الموجبة کلیة سالبة جزئية والسالبة جزئية یکفی فی صدقها تحقق ذالک السلب فی بعض الصوری ولا یمتاز فیہ الی تحقق ذالک السلب فی الصور وعلی هذا فنحن نقول بموجب لاف عندنا انه لیس لبعض الظالمین جمیع ولا شفیع یجاب وهم الکفار فاما ان یکلم علی کل واحد منهم بسلب الحمیم والشفیع فلا۔

یعنی جواب یہ دیا گیا ہے کہ ما للظالمین من جمیع ولا شفیع یہ نفیض ہے للظالمین جمیع وشفیع کی اور یہ موجبہ کلیہ ہے موجبہ کلیہ کی نفیض سالبة جزئية ہوتی ہے اور سالبة جزئية کے لیے یہ کافی ہے کہ بعض صورتوں میں سلب پائی جائے جمیع صورتوں میں سلب کا پایا جانا ضروری نہیں۔ اس وجہ سے ہم یہ کہتے ہیں کہ بعض ظالموں کا کوئی مددگار اور شفاعت کرنے والا نہیں ہوگا۔ وہ بعض ظالموں سے مراد کافر ہیں۔ اگر تمام ظالم مراد لیے جائیں تو یہ درست نہیں۔

اور نفی شفاعت پر یہ دلیل قائم کی گئی من قبل ان یاتی یوم لا یمیع فیو لا خلة ولا شفاعة۔ ظاہر الاية یقتضی نفی الشفاعة باسرها یعنی اس مذکورہ آیت میں مکمل طور پر شفاعت کی نفی کی گئی ہے کہ قیامت میں کوئی دوستی اور سفارش کام نہیں آئے گی۔ اس کا جواب یہ دیا گیا ہے: فالجواب عنه ما تقدم فی الوجه الاول یعنی اس کا جواب بھی وہی ہے جو ابھی پہلی آیت کا جواب دیا جا چکا ہے۔ اسی طرح اور دلیل نفی شفاعت پر یہ دی گئی ہے: قوله تعالیٰ فما تنفعهم شفاعة الشافعیین ولو اشریت الشفاعة فی اسقاط العقاب لكانت الشفاعة قد تنفعهم وذلك ضد الاية یعنی اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ان کو شفاعت کرنے والوں کی شفاعت نفع نہیں دے گی۔ اگر شفاعت عذاب کے ختم ہونے میں

نفع ہوتی تو اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد نہ ہوتا۔ اس کا جواب یہ دیا گیا ہے: قوله فما
 تفسرهم شفاعۃ الشافعیین فهذا واضح فی حق الکفار وهو مبدل
 بسبب التخصیص علی ضد هذا حکم حق ^{منہ} یعنی یہ آیت کریمہ کافروں کے بارے میں
 نازل ہوئی۔ لہذا یہ حکم ان ہی کو شامل ہے ان کی ضد مومنوں کو یہ حکم شامل ہی نہیں۔
 جب کہ واضح دلائل قرآن پاک اور احادیث مبارکہ سے ثابت ہیں تو گنہگاروں کے
 لیے انبیائے کرام، صلحاء کی شفاعت کا انکار ناممکن ہے۔ قرآن پاک میں ہے:
 لا یملکون الشفاعۃ الا من اتخذ عند الرحمن عهدا اللہ تعالیٰ کے حکم
 اور اجازت سے شفاعت کا حق حاصل ہوگا (۱) واستغفر لهم الرسول میں بھی
 شفاعت کا ہی ذکر ہے کیونکہ گنہگاروں کے لیے طلب مغفرت شفاعت ہی ہے۔
 مذکورہ بیان کے بعد یہ واضح ہو گیا کہ کافروں کے لیے کسی کی شفاعت قابل قبول
 نہیں البتہ مومن گنہگاروں کے لیے شفاعت قبول ہوگی۔ لہذا اعلیٰ حضرت کا ترجمہ ہی
 حق پر مبنی ہے مطلقاً شفاعت کے انکار پر دلالت کرنے والا ترجمہ کسی طرح بھی قابل
 قبول نہیں۔

ثُمَّ اتَّخَذْتُمُ الْعِجْلَ مِنْ بَعْدِهَا (پ ۱۲)

پھر تم نے تم نے گائے کا بچہ (شاہ رفیع الدین)
 پھر تم نے ان کے پیچھے گوسالہ کو اختیار کر لیا۔ (عبد الماجد)
 پھر تم لوگوں نے تجویز کر لیا گوسالہ کو موسیٰ کے بعد۔ (مولانا اشرف علی)
 پھر تم نے بنالیا بچہ اس کے پیچھے۔ (شاہ عبدالقادر)
 پھر تم نے بنالیا بچہ موسیٰ کے بعد (مولانا محمود الحسن)
 پھر اس کے پیچھے تم نے بچہ کی پوجا شروع کر دی۔ (اعلیٰ حضرت)

اس مقام پر بعض تراجم میں ایک تو "موسیٰ" کسی لفظ کا ترجمہ نہیں بلکہ ضمیر
 کے مرجح سے سمجھ میں آتا ہے۔ مخالفین کو یہ اعتراض تو کرنا آتا ہے کہ ضمیر کا مرجح
 نبی کریم ہو تو "محبوب" ترجمہ میں کیوں آتا ہے۔ یہاں بعض تراجم میں "موسیٰ" کیوں آیا
 ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ دیگر تراجم سے صرف اتنا پتا چلتا ہے کہ انھوں نے
 موسیٰ علیہ السلام کے طور پر جانے کے بعد ایک بچہ بنا لیا یا تجویز کر لیا۔ کیا ان پر ایک
 دوسرے کو قتل کرنا فقط اس لیے واجب تھا کہ انھوں نے بچہ کیا کیوں بنا یا بچہ
 کو خدا کیوں مانا؟ اور اس کی پوجا کیوں کی؟ اگر صرف بنانا مقصود تھا تو یہ فعل صرف
 سامری کا تھا، تمام کا نہیں۔ پھر دوسروں کا مواخذہ کیسے۔ یہاں تو یہ ذکر ہے انھوں
 نے بچہ کی پوجا شروع کر دی تھی۔ اس پر اعلیٰ حضرت کا ترجمہ زیادہ
 واضح ہے۔ باقی تراجم سے مقصد واضح نہیں۔ اس پر زیادہ تفاسیر کی عبارات نقل
 کرنے کی ضرورت اس لیے نہیں خود قرآن پاک کے دوسرے مقام پر واضح کیا گیا
 ہے کہ انھوں نے بچہ کی پوجا کرنا تھا۔ اس کی عبادت کرتے رہے فَعَالُوا هَذَا
 (۱) فَكُفُّوا اِلٰهَ مُوسٰی (۲) لای۔ سامری اور اس کے متبعین نے دوسروں کو کہا:
 "یہ ہے تمہارا اور موسیٰ علیہ السلام کا خدا" اس سے آگے ان کا جواب حضرت ہارون
 علیہ السلام کے منع کرنے پر یہ تھا: قَالُوا لَنْ نَبْرَحَ عَلَيْهِ عَاكِفِيْنَ حَتّٰی
 يَنْجِیْعَ (۳) اَلَيْسَ اَمُوسٰی (۴) انھوں نے کہا ہم تو موسیٰ علیہ السلام کے ٹوٹنے
 تک اسی پر (گائے پرستی) پر قائم رہیں گے۔ تاہم صرف بیضاوی شریف کی عبارت پر
 اکتفا کیا جاتا ہے: ثُمَّ اتَّخَذْتُمُ الْعِجْلَ مِنْ بَعْدِهَا (۵) اَلَمْ تَعْبُدُوْا
 تَمُّ نے بچہ کی پوجا، معبود بنالیا۔

فَفَرِيقًا كَذَّبْتُمْ وَفَرِيقًا تَقْتُلُوْنَ (پ ۱۳)

پھر بعض کو تم نے ٹھٹھلایا اور بعض کو تم ہی قتل کرنے لگے۔ (عبد الماجد)

ایک گروہ (انبیاء) کو تو جھٹلاتے رہے اور ایک گروہ کو قتل کرتے رہے۔
پھر ایک جماعت کو جھٹلایا اور ایک جماعت کو مار ڈالتے (شاہ عبدالقادر)
کسی کو جھٹلایا اور کسی کو قتل کر ڈالا۔ (مولانا مودودی)

پھر ایک جماعت کو جھٹلایا اور ایک جماعت کو قتل کر دیا (مولانا محمود الحسن)
سو بعضوں کو قتل کرنے جھوٹا بتلایا اور بعضوں کو قتل ہی کر ڈالتے تھے۔ (مولانا

اشرف علی)

تم ان (انبیاء) میں ایک گروہ کو جھٹلاتے ہو اور ایک گروہ کو شہید کرتے
ہو۔ (اعلیٰ حضرت)

یہاں ایک ان تراجم میں یہ فرق واضح ہے کہ یہاں بھی یہود کا انبیاء کو شہید
کرنے کا ذکر ہے وہاں ہی دیگر حضرات کے تراجم میں لفظ قتل استعمال ہوا ہے۔
اعلیٰ حضرت کے ترجمہ میں لفظ شہید ہے جو ادب و احترام پر دال ہے کیونکہ ہر قتل شہادت
کو مستلزم نہیں۔ اگرچہ انبیائے کرام کی طرف منسوب ہونے کی وجہ سے تخصیص تو ہے
لیکن بات تو یہ ہے کہ ترجمہ کے الفاظ ہی سے کسی کے مقام کا پتا چل جائے اور تفسیر
کی طرف اشارہ ہو جائے یہ ہی ترجمہ کی کمالیت پر دال ہے۔ تفسیر جلالین کی عبارات
ملاحظہ ہو: ففرضوا منہم کذبتم کعیسی و فریقا تقتلون ای کزکریا و یحییٰ
اسی طرح منہم کے ماتحت بن اسطور بخوالہ کمالین ای من الہمسل

الدال علیہ قولہ من سول یعنی انبیاء کی ایک جماعت جیسے عیسیٰ علیہ السلام
کی انہوں نے تکذیب کی اور ایک جماعت جیسے زکریا و یحییٰ علیہما السلام کو شہید کیا۔ اسی
طرح مدارک میں بھی ہے: ففرضوا کذبتم کعیسی و محمد و عیسیٰ علیہما السلام

و فریقا تقتلون کزکریا و یحییٰ علیہما السلام یعنی ایک جماعت جیسے عیسیٰ علیہ السلام
اور نبی کریم کی انہوں نے تکذیب کی اور جماعت جیسے حضرت زکریا اور یحییٰ علیہما السلام

کو انہوں نے شہید کیا۔ یہ مفہوم کون سے ترجمہ سے واضح ہے ذی شعور خود ہی فیصلہ
کر سکتا ہے۔

وَإِذْ جَعَلْنَا الْبَيْتَ مَثَابَةً لِّلنَّاسِ وَأَمْنًا (پ ۱۶)

اور جب ٹھہرایا ہم نے یہ گھر کعبہ اجتماع کی جگہ لوگوں کی اور پناہ۔ (عبدالقادر)
① اور جب ہم نے مقرر کیا ہم نے خانہ کعبہ کو اجتماع کی جگہ لوگوں کے واسطے اور جگہ
امن کی۔ (مولانا محمود الحسن)۔

اور یہ کہ ہم نے اس گھر (کعبہ) کو لوگوں کے لیے مرکز اور امن کی جگہ بنایا (مولانا
مودودی)۔

اور جب ہم نے خانہ کعبہ کو لوگوں کے لیے جمع ہونے اور امن پانے کی جگہ مقرر کیا۔
(فتح محمد)۔

اور یاد کرو جب ہم نے اس گھر کو لوگوں کے لیے مرجع اور امن بنایا۔ (اعلیٰ حضرت)
اس مقام پر مشابہت کا ترجمہ اجتماع کی جگہ کیا گیا ہے اور اعلیٰ حضرت نے مرجع یعنی جائے
رجوع کیا اور یہ ترجمہ لغت کے مطابق ہے اور مقصد بھی بیان کرنے کا یہی ہے کہ لوگ اس
کی طرف باریار لوٹتے ہیں اور دیکھنے کے لیے بے قرار ہوتے ہیں۔ اعلیٰ حضرت کے ترجمہ کی
فوقیت پر جلالین کی عبارت ملاحظہ ہو: مرجعاً یثوبون الیہ من کل جانب
یعنی "مرجع بنایا کہ ہر جانب سے لوگ اس طرف لوٹتے ہیں" جلالین کے حاشیہ پر یہ ہے:
یثوبون ای یرجعون ثوب گرد آمدن مردم (مرا) یہاں بھی معنی ٹوٹتا ہے۔
مدارک میں اس طرح ہے: حجاباً و مرجعاً للعجاج والعماس یتفقدون عندہ
تشریف یثوبون الیہ "حاجیوں اور عمرہ کرنے والوں کے لیے مرجع بنایا جو اس سے جدا
ہوتے ہیں اور پھر اس کی طرف لوٹتے ہیں" بیضاوی میں ہے: مرجعاً یثوبون الیہ
الزفرا و مثالیہم "مرجع ہے کہ اس کی طرف زائرین لوٹتے ہیں" تفاسیر عبارات
سے یہ خود بخود پتا چل جاتا ہے کہ صرف اجتماع کی جگہ ترجمہ کرنے سے اس کا مرجع ہونا

نہیں سمجھ آتا کیونکہ اجتماع تو ایک مرتبہ بھی پایا جائے۔ اگرچہ یہ کہنا درست تو ہے کہ وہ اجتماع کی جگہ ہے لیکن بیت اللہ شریف تو بار بار لوٹنے اور مجتمع ہونے کی جگہ ہے۔ البتہ مرجع ترجمہ کرنے سے اجتماع کی جگہ سمجھ میں آ جاتی ہے کیونکہ حج کے لیے بار بار لوٹنا اجتماع کو بھی مستلزم ہے۔

وَدَاتُ فِي الْآخِرَةِ لِكُلِّ الصَّالِحِينَ (پ ۶)

اور وہ آخرت میں نیکیوں میں ہے۔ (مولانا محمود الحسن)۔

اور آخرت میں نیک ہے۔ (شاہ عبدالقادر)۔

اور آخرت میں اس کا شمار صالحین میں ہوگا۔ (مولانا مودودی)۔

اور وہ آخرت میں بڑے لائق لوگوں میں شمار کیے جاتے ہیں (مولانا اشرف علی)

اور بے شک وہ آخرت میں ہمارے خاص قرب کی قابلیت والوں میں ہیں۔

(اعلیٰ حضرت)

یہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ذکر ہے۔ تراجم میں فرق یہ ہے کہ صرف نیکیوں میں ہوتا حضرت ابراہیم علیہ السلام کی شان کو واضح نہیں کرتا اس لیے نیک تو غیر انبیاء بھی ہونگے حالانکہ مقام انبیاء اور غیر انبیاء میں بہت بڑا فرق ہے۔ لیکن اعلیٰ حضرت کا ترجمہ اس مقصد کو شامل ہے کیوں کہ آپ نے "خاص قرب کی قابلیت والوں میں ہے" ترجمہ کر کے یہ واضح کر دیا کہ خاص قرب کی قابلیت انبیاء کو ہی حاصل ہوگی۔ عام نیکیوں کو وہ مقام حاصل نہیں ہوگا۔ لہذا صحیح مقصد اعلیٰ حضرت کے ترجمہ سے ہی واضح ہوا۔ اسی پر جلالین کی عبارت دیکھیں:

الذین لهم الدساتر العلیٰ صالحین کی تفسیر آپ نے ان الفاظ میں کی جس کا مطلب یہ ہے کہ وہ لوگ جن کو بلند درجات حاصل ہوں گے آپ ان ہی میں ہوں گے۔

اسی طرح شیخ زادہ برصغاری میں ہے: فیل المراد بالصالحین الانبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام لقولہ تعالیٰ ومن ذریتہ ہارود و سلیمان والیوب الخ قولہ کل من الصالحین وان ابراہیم علیہ السلام دعا سرب

وقولہ والحقنی بالصالحین الخ الانبیاء المعاصین فاجاب انہ دعوتہ وین انہ معہم فی الجنة یہاں بھی مقصد یہی بیان کیا گیا ہے کہ صالحین سے مراد انبیاء ہیں کیونکہ قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے۔ آپ کی اولاد میں سے داؤد اور سلیمان اور ایوب، یوسف، موسیٰ، ہارون، زکریا، یحییٰ، عیسیٰ، الیاس علیہم السلام تمام ہی صالحین سے ہیں اور ابراہیم علیہ السلام نے اپنے رب سے دعا کی کہ اے میرے رب مجھے صالحین سے یعنی پہلے انبیاء سے لاحق فرما۔ رب نے اس دعا کو قبول کیا اور آپ کو بتایا کہ تم جنت میں ان کے ساتھ ہو گے۔ گویا یہ اسی خیر کا بیان ہے کہ آپ آخرت میں انبیاء کے ساتھ ہی ہوں گے جو خاص قرب کی قابلیت والے ہیں۔

قُلْ بَلْ مِلَّةِ اِبْرٰہِیْمَ حَنِیْفًا (پ ۶)

کہہ دے کہ مگر نہیں بلکہ ہم نے اختیار کیا ایک ہی طرف کا تھا۔ (مولانا محمود الحسن)

اب کہہ دیجئے کہ ہم تو ملت ابراہیم پر ہیں گے جس میں کبھی کا نام نہیں۔ (اشرف علی)

ان سے کہو بلکہ سب کو چھوڑ کر ابراہیم کا طریقہ۔ (مودودی)

تم فرماؤ بلکہ ہم تو ابراہیم کا دین لیتے ہیں جو ہر پل سے جدا تھے۔ (اعلیٰ حضرت)

اس مقام پر قل کا خطاب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ہے کہ اور تم فرماؤ یہ

دونوں ترجمے اسی لفظ قل کے ہیں۔ ان میں جو فرق ہے وہ بیان وضاحت کا محتاج

نہیں۔ اس مقام پر حنیفا کا ترجمہ بعض حضرات نے کیا ہے "ایک ہی طرف کا"۔ اعلیٰ حضرت

نے اسی لفظ کا ترجمہ کیا ہے "ہر پل سے جدا تھے"۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ عام اردو

زبان کے محاورات سے واقف آدمی سمجھ لے گا۔ ایک ہی طرف کا ہونا اور ہر پل سے

جدا ہونا، ان دونوں میں سے یقیناً دوسرا معنی زیادہ مناسب ہے۔ پھر بھی اعلیٰ حضرت

کا ترجمہ تفسیر کے مطابق ہونا۔ اس پر جلالین نے حنیفا کی جو تفسیر کی ہے وہ شاہد ہے:

حال من ابراہیم مائلا عن الادیان کلہا الی الدین السقیم

یعنی جیسا حنیفا ترکیبی لحاظ سے لفظ ابراہیم سے حال ہے اور اس کا مطلب یہ ہے

کہ تمام باطل دینوں نے جدا ہوتا ایک دین مستقیم پر قائم ہونا۔ مدارک نے اس طرح بیان کیا الحنیف المائل من کل دین باطل الی دین الحق یعنی حنیف کا مقصد یہ ہے کہ ہر باطل دین سے جدا ہونا، دین حق کی طرف متوجہ ہونا بیضیادی میں یہ ہے: (حنیفاً) مائلاً عن الباطل الی الحق باطل سے جدا ہونا۔ حق کی طرف توجہ۔ مولانا مودودی صاحب کا ترجمہ تو حقیقت سے بالکل دور ہے کیونکہ حنیفاً کا ذکر ابراہیم علیہ السلام کے متعلق ہے نہ کہ ملت کے یعنی یہ حال واقع ہو رہا ہے لفظ ابراہیم سے لیکن مودودی صاحب کا ترجمہ صرف خیالی ہے۔ عربی گرامر کی مطابقت سے اسے دور کا واسطہ بھی نہیں۔ اسی طرح مولانا اشرف علی صاحب نے حنیفاً کا ترجمہ کیا ہے۔ (جس میں کبھی کا نام نہیں) یہ کوئی لغوی ترجمہ نہیں اور نہ ہی مقصد کو واضح کرتا ہے۔

لَا نَفِرُّ بَيْنَ أَحَدٍ مِنْهُمْ (پ. ۱۴)

ہمیں جدائی ڈالتے ہم درمیان کسی ان میں سے۔ (شاہ رفیع الدین)۔
 ہم فرق نہیں کرتے ایک میں ان سب سے۔ (شاہ عبدالقادر)۔
 ہم ان پیغمبروں میں سے کسی میں کچھ فرق نہیں کرتے۔ (عبدالماجد)۔
 ہم ان میں سے کسی ایک میں بھی تفریق نہیں کرتے۔ (اشرف علی)
 ہم فرق نہیں کرتے ان سب میں سے کسی ایک میں بھی۔ (مولانا محمد الحسن)
 ہم ان کے درمیان کوئی تفریق نہیں کرتے۔ (مولانا مودودی)۔
 ہم ان میں کسی پر ایمان میں فرق نہیں کرتے۔ (اعلیٰ حضرت)۔

ان تراجم میں فرق سمجھنے سے پہلے اس پوری آیت کا مفہوم ذہن میں رہے کہ اس آیت میں خطاب مومنوں کو ہے کہ تم کہو ینم اللہ پر ایمان لائے اور اس پر جو ہماری طرف آتا رہا یعنی قرآن پاک اور جو ابراہیم علیہ السلام اور اسمعیل اور اسحاق اور یعقوب علیہم السلام اور ان کی اولاد پر آتا رہا یعنی صحیفے اور جو عطا کیا گیا مومنوں

علیہ السلام اور عیسیٰ علیہ السلام کو یعنی تورات اور انجیل اور یحیٰی انبیائے کرام کو ایسے
رب کی طرف سے عطا ہوئے یعنی کتب و آیات۔ ہم ان میں کسی ایک پر ایمان میں فرق
نہیں کرتے۔۔

اب اس آیت کریمہ کے مفہوم کے بعد واضح ہو کہ صرف اتنا کافی نہیں کہ ہم ان میں فرق نہیں کرتے کیونکہ فرق تو ہم کرتے ہیں اور قرآن پاک کو افضل الکتاب مانتے ہیں۔ لہذا یہاں جس فرق کی نفی ہے وہ یہی ہے کہ ہم ایسا فرق نہیں کرتے کہ بعض کتب پر ایمان ہو اور بعض پر نہ ہو۔ اسی مقصد کے پیش نظر جلالین میں اس طرح تفسیر پیش کی گئی ہے: **فَنُؤْمِنُ بِبَعْضٍ وَنُكَفِّرُ بِبَعْضٍ** کا یہی معنی **وَالنَّصَارَى** ہم ایسا نہیں کرتے کہ بعض پر ایمان رکھیں اور بعض کے ساتھ کفر کریں جس طرح یہود و نصاریٰ کرتے تھے۔ مدارک میں بھی اسی طرح یا لفظ دیگر مفہوم پیش کیا گیا ہے: **اِیْ لَا نُؤْمِنُ بِبَعْضٍ وَنُكَفِّرُ بِبَعْضٍ** کما فعلت الیہود و النصارى علی حضرت کا ترجمہ مقصد کے مطابق ہے جب کہ دیگر تراجم قابلِ اعتراض ہیں۔

فَسَيَكْفِيكُمْهُمُ اللَّهُ (١٦)

تو تمھاری طرف سے عنقریب ہی نمٹ لیں گے۔ (اشرف علی)۔
 سواب کفایت ہے تیری طرف سے ان کو اللہ۔ (شاہ عبدالقادر)۔
 سواب کافی ہے تیری طرف سے اللہ۔ (مولانا محمود الحسن)۔
 سواب اللہ آپ کی طرف سے ان کے مقابلہ میں ہے۔ (عبدالماجد)
 تو اے محبوب! عنقریب اللہ ان کی طرف سے تمھیں کفایت کرے گا (علی حضرت)
 یہاں لفظ اللہ فاعل ہے اور "ک" ضمیر اور "ہم" ضمیر مفعول ہیں۔ بظاہر وہ
 معنوں کو عقل تسلیم کرتی ہے کہ یہ مطلب ہو کہ اللہ نبی کریم کی طرف سے ان کو کافی ہو۔
 یعنی عذاب دے۔ یا یہ معنی ہو کہ اللہ ان کی طرف سے نبی کریم کو کافی ہو کہ وہ آپ کو کوئی
 تکلیف نہ پہنچا سکیں بلکہ خود ہی گرفت میں آجائیں۔ علی حضرت کا ترجمہ تفاسیر کے عین

مطابق ہے۔ مدارک میں ہے: ضمان من الله لا يظلمكم رسول الله صلى الله عليه وسلم
 قد اخذ وعده بقتل بعضهم واجلاء بعض يعني الله تعالى ان
 ذمہ داری اٹھائی ہے کہ نبی کریم کو غالب کر لیا جائے ان پر یعنی اللہ ان کی طرف سے تمہیں کفایت
 کرے گا۔ اسی وعدہ کو اللہ نے اس طرح پورا فرمایا کہ بعض ان میں سے قتل ہو گئے اور
 بعض جلاوطن۔ ایسے ہی جلالین میں یا محمد شقائقم سے تفسیر کی گئی جس کا مطلب
 ہے کہ اے نبی کریم آپ کو اللہ کافی ہے ان کی مخالفت کے باوجود کیونکہ شقائق کا
 ترجمہ خود مفسر نے پہلے خلاف کر دیا ہے۔ اس آیت کریمہ کے اختتام پر بھی جلالین میں
 مدارک کے مطابق ہی عبارت ہے: وقد كفاه الله اياهم بقتل قريظة
 وحنى النصير وحنى العجوة عليهم الله تعالى نے نبی کریم کی ان کی طرف سے
 کفایت کی تو قریظہ قتل ہو گئے اور نصیر جلاوطن ہوئے اور ان پر جزیرہ مقرر ہوا۔ شیخ
 زادہ حاشیہ بیضاوی میں بھی اسی قسم کا مضمون ہے: حنى النصير وحنى العجوة اياهم
 اليهود والنصارى بحفظك من شرهم وخصوك عليهم يعني الله تعالى آپ
 کی یہود و نصاریٰ کی طرف سے کفایت کرے گا۔ ان کے ناپاک ارادوں کو ختم کر کے
 آپ کی حفاظت فرمائے گا اور آپ کو ان پر غالب فرمائے گا۔
 تفاسیر کے بیان کے بعد اعلیٰ حضرت کے ترجمہ پر نظر کریں تو آپ کی وسعت علمیت
 کا اعتراف کرنے کے بغیر کوئی چارہ کار نہیں رہے گا۔

وَيَكُونُ الرَّسُولُ عَلَيْكُمْ شَهِيدًا (پ ۶)

اور ہووے پیغمبر اور تمہارے گواہ۔ (شاہ رفیع الدین)۔
 اور رسول ہووے پر بتانے والا۔ (شاہ عبدالقادر)۔
 اور پیغمبر آخر الزمان تم پر گواہ بنیں۔ (فتح محمد)۔
 اور رسول تم پر گواہی دینے والا۔ (محمود الحسن)۔
 اور رسول تم پر گواہ ہو۔ (مولانا مودودی)

اور رسول گواہ میں تم پر (عبدالماجد) اور تمہارے لیے رسول اللہ صلی علیہ وسلم
 گواہ ہوں۔ (اشرف علی)۔ اور یہ رسول تمہارے نگہبان و گواہ (اعلیٰ حضرت)۔
 نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی امت لوگوں پر گواہی دے گی اور آپ اپنی امت کی
 صداقت کی گواہی دیں گے اور ان کے نگہبان ہوں گے۔ دیگر تراجم نے صرف گواہ
 ذکر کیا جب کہ اعلیٰ حضرت نے نگہبان و گواہ ذکر کیا ہے۔ اس معنی پر مدارک دال ہے:
 لما كان الشهيد كالقريب جئى بكلمة استعمله كقولہ تعالى كنت انت
 الرقيب عليهم چونکہ گواہ نگہبان کی طرح ہوتا ہے اسی وجہ سے جس طرح
 رقيب (نگہبان) کے بعد کلمہ علی آتا ہے اسی طرح یہاں بھی لایا گیا ہے بیضاوی نے
 بھی اسی طرح بیان کیا کہ جب پہلی امتیں تبلیغ انبیاء کا انکار کر دیں گی تو رب تعالیٰ
 باوجود علم کے منکرین پر حجت قائم کرنے کے لیے تبلیغ پر گواہ طلب کرے گا۔ انبیائے
 کرام امت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو گواہ پیش کریں گے۔ پہلی امتیں کہیں گی، تم ہمیں
 کیسے پہچانتے ہو؟ تو یہ کہیں گے کہ ہمیں اپنے سچے نبی نے اللہ کا کلام اس کی کتاب کے
 ذریعے پہنچایا۔ ہمیں علم حاصل ہوا۔ پھر ان پر گواہی کے لیے نبی کریم کو لایا جائے گا۔ آخر
 مقصود ہی عبارت ملاحظہ ہو: فيؤتى بمحمد صلى الله عليه وسلم فيستال
 عن حال امة فيشهد بعد التمام وهذه الشهادة وان كانت
 لهم لكن لما كان الرسول عليه السلام كالقريب المهيمن على
 امة عدى بعلى نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو لایا جائے گا۔ آپ اپنی امت
 کی عداوت کی گواہی دیں گے۔ آگے علامہ بیضاوی نے ایک سوال کا جواب دیا
 ہے کہ شہادت کے بعد علی آئے تو یہ شہادت کسی کے خلاف ہوتی ہے۔ جب کسی کے حق
 میں شہادت دینی ہو تو شہادت کے بعد لام آتا ہے۔ اس کا جواب علامہ نے دیا کہ اگرچہ
 نبی کریم کی شہادت ان کے حق میں ہوگی لیکن آپ چونکہ ان کے لیے قریبوں (نگہبانوں) کی
 طرح ہیں اس وجہ سے علی سے متعبدی کیا ہے۔ چونکہ آپ نگہبان ہیں نہ کہ یہ مراد ہے
 کہ ان کے خلاف گواہی دیں گے۔ اسی سوال و جواب کو اعلیٰ حضرت نے ترجمہ میں نگہبان کا

لفظاً بڑھا کر مندرج کر دیا جس کی حقیقت سے دیگر مترجمین بے خبر رہے۔

وَمَا جَعَلْنَا الْقِبْلَةَ الَّتِي كُنْتَ عَلَيْهَا إِلَّا لِنَعْلَمَ رُوحَنَا

اور جس قبلہ پر تم (پہلے) تھے اس کو ہم نے اس لیے مقرر کیا تھا کہ معلوم کریں (فتح محمد)۔ اور جس سمت قبلہ پر آپ رہ چکے ہیں وہ تو محض اس کے لیے تھا کہ ہم کو معلوم ہو جاوے (اشرف علی)۔ نہیں مقرر کیا تھا ہم نے وہ قبلہ جس پر تو پہلے تھا مگر اس واسطے کہ معلوم کریں (محمود الحسن)۔ اور وہ قبلہ جو ہم نے ٹھہرایا جس پر تو تھا، نہیں مگر اسی واسطے کہ معلوم کریں۔ (شاہ عبدالقادر)۔ اور اے محبوب تم پہلے جس قبلہ پر تھے ہم نے وہ اسی لیے مقرر کیا تھا کہ دیکھیں۔ (اعلیٰ حضرت)۔ اور نہیں کیا تھا ہم نے قبلہ جو تھا تو اوپر اس کے مگر تو کہہ جائیں ہم۔ (شاہ رفیع الدین)۔

یہاں تخیل قبلہ کا ذکر ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا قبلہ پہلے کعبہ تھا۔ مدینہ طیبہ میں آکر سولہ یا سترہ ماہ تک بیت المقدس قبلہ بنایا گیا۔ پھر نبی کریم کی مرضی کے مطابق کعبہ کو قبلہ بنا دیا گیا۔ اس واقعہ کو رب قدوس نے ذکر فرمایا کہ تخیل قبلہ کا مقصد یہ تھا کہ مسلمان اور کافر میں فرق ہو جائے کہ کون نبی کریم کی تابعداری کرتا ہے اور کون شک کرتا ہے اور رُگردانی کرتا ہے۔ اب اس تمہید کے بعد واضح ہوا کہ عام تراجم میں یہ معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قبلہ کو اس لیے تبدیل کیا کہ اسے متبعین اور منکرین کا علم ہو جائے۔ اس میں ایک وہم ہوتا ہے جو تفاسیر میں ہے وہ دیکھیں: خان نہیں ہوتا بلکہ اس وہم کو تقویت ملتی ہے۔ وہ وہم جو تفاسیر میں ہے وہ دیکھیں: خان قبلہ کیسے یوں علم تعالیٰ غایتہ الجعل وھولہ یسئل علما۔ بیضاوی۔

اعتراض کیا جاتا ہے کہ علم کو جعل کی غایہ بنانا صحیح نہیں کہ قبلہ اس لیے بنایا کہ ہم جائیں کیونکہ اللہ تعالیٰ تو ازل لاً عالم ہے۔ جواب اس طرح دیا گیا ہے قلت هذا ولا شباۃ باعتبار ما يتعلق الخالی الذی ھو مناط الخلاء والمعنی لیتعلق علمنا بہ موجوداً۔ یعنی یہاں جزا کا تعلق موجود کے علم سے ہے۔ اسی جواب

کو مدارک میں زیادہ واضح طور پر بیان کیا گیا ہے۔ قال الشیخ ابو منصور مہنوی فی شرحہ لنظم کائناتنا موجود اما قد علمنا ھو انہ یکون ویوجد فاما اللہ تعالیٰ عالم فی الازل بکل ما اسماہ وجودہ انہ یوجد فی الوقت الذی شاع وجودہ فیہ ولا یوصف بانہ عالم فی الازل بانہ موجود کائن لانہ لیس بموجود فی الازل کیف یعلمہ موجود اذا صا سرام موجودا یدخل تحت علمہ الا انہ فیہ سیر معلوم مالہ موجودا کائناتنا والتغیر علی المعلوم لا علی العلم۔

اس عبارت کا خلاصہ یہ ہے کہ شیخ ابو منصور فرماتے ہیں کہ اگرچہ اللہ تعالیٰ کو علم ازلی حاصل ہے کہ فلاں چیز نے موجود ہونا ہے لیکن پہلے علم کا تعلق غیر موجود سے جو بعد میں موجود ہونا ہے لیکن جب وہ چیز موجود ہوگی اب موجود سے متعلق ہوگا۔ یہاں علم میں تبدیلی نہیں بلکہ معلوم میں تبدیلی ہے۔ پہلے علم وہ تھا کہ معلوم مقام ظہور میں نہیں تھا۔ اب علم ہے کہ معلوم مقام ظہور میں ہے۔

اب آپ تراجم میں فرق دیکھیں کہ یہ کہا جائے تاکہ ہم معلوم کریں تو یہ اعتراض مندرج ہو گا یا یہ کہا جائے کہ ہم دیکھیں تو اعتراض مندرج ہو گا۔ یہ ہے مولینا احمد رضا خاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی علمی بصیرت جس میں صاحب نظر کو اعتراف کرنے میں کوئی کلام نہیں۔

وَلَئِنْ أَتَيْتَ أَهْوَاءَهُمْ مِّنْ بَعْدِ مَا جَاءَكَ مِنَ الْعِلْمِ

اور اگر تم باوجود اس کے کہ تمہارے پاس دانش (یعنی وحی خدا) آچکی ہے ان کی خواہشوں کے پیچھے چلو گے تو ظالموں میں داخل ہو جاؤ گے۔ (فتح محمد) اور کبھی تو چلا ان کی پسند پر بعد اس علم کے جو تجھ کو پہنچا تو بیشک تو بھی بے انصافوں میں۔ (شاہ عبدالقادر)

اور اگر آپ ان کے (ان) نفسانی خیالات کو اختیار کر لیں اور (اور وہ بھی) آپ کے پاس علم (وحی) آئے پیچھے لقیں آپ ظالموں میں شمار ہونے لگیں۔ (اشرف علی)

اگر تو چلا ان کی خواہشوں پر بعد اس علم کے جو تجھ کو پہنچا تو بے شک تو بھی ہوا
بے انصافی میں۔ (مولانا محمود الحسن)۔

اور اگر تم نے اس علم کے بعد جو تمہارے پاس آپکا ہے ان کی خواہشات کی پیروی کی
تو یقیناً تمہارا شمار ظالموں میں ہوگا۔ (مولانا مودودی)۔

اور اگر (کہیں) آپ ان کی خواہشوں کی پیروی کرنے لگیں بعد اس کے کہ آپ کے
پاس علم آپکا ہے تو یقیناً آپ (بھی) ظالموں میں (شمار) ہوں گے۔ (عبدالماجد)۔

اگر تو پیروی کرے گا خواہشوں ان کے کی پیچھے اس چیز کے کہ آئی تیرے پاس علم
سے تحقیق تو اس وقت ظالموں سے ہے۔ (شاہ رفیع الدین)۔

اور (اے سننے والے) کہے باشند اگر تو ان کی خواہشوں پر چلا بعد اس کے کہ
تجھے علم مل چکا تو اس وقت تو ضرور ستم گار ہوگا۔ (اعلیٰ حضرت)۔

یہاں دیگر تراجم میں اخذ من الظالمین کی نسبت نبی کریم کی طرف کی
گئی جس میں ولین انتعت کے ساتھ کوئی بالفرض کی قید کا اضافہ نہیں ہوا۔

بظاہر عام ترجمہ سے یہ سمجھ آتا ہے کہ نبی کریم سے یہود و نصاریٰ کی خواہشات کی تابعداری
ممکن ہے اور اگر آپ نے تابعداری کر لی تو معاذ اللہ آپ بے انصافوں، ظالموں سے

ہوں گے۔ حالانکہ یہ تصور بھی ممکن نہیں۔ اسی وجہ سے جلالین میں ہے: **اذا ان**
انتعتهم فرضنا من الظالمین یعنی یہ کلام بالفرض محال پر مبنی ہے۔

صاحب مدارک نے کہا: **وفي ذلك لطف للسامعین وتفهيم للشعاب**
على الحق وتخذير من يترتب الدليل بعد انارتہ ويتبع

القول وقيل الخطاب في الظاهر للنبي صلى الله عليه وسلم والمؤمنين اس میں سامعین پر
مہربانی ہے اور حق پر نیت رہنے کے لیے براہِ گنجتہ کیا گیا ہے۔ اور جو شخص دلیل

کے روشن ہونے کے بعد چھوڑتا ہے اور خواہشات کے درپے ہوتا ہے اس کو ڈرایا
گیا ہے اور یہ کہا گیا ہے کہ یہ خطاب بظاہر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ہے لیکن مراد

امت ہے۔ اسی لیے اعلیٰ حضرت نے اپنے ترجمہ میں (اور اے سننے والے) کہے باشند کا

اضافہ کیا ہے تاکہ تفاسیر کا مفہوم ترجمہ سے ہی واضح ہو جائے۔ بیضاوی نے بھی
علی بسبیل الفرض والتقدير ذکر کیا ہے محشی نے کہا ہے کہ یہ سوال کا

جواب ہے اتباع اهواء المخالفین لیس بہ محتمل فی حقہ علیہ السلام
للقطع بعصمة من المعاصی کیونکہ نبی کریم سے مخالفین کی خواہشات کی اتباع کا قطعی

احتمال منقطع ہے کیونکہ آپ تو معاصی سے معصوم ہیں۔ بیضاوی نے علی بسبیل
الفرض والتقدير کے الفاظ ذکر کر کے جواب دیا ہے کہ یہ کلام بالفرض ہے نہ کہ

حقیقت۔ محشی نے اس کا جواب بھی نقل کیا ہے **وفي عادة الناس ان يوجهوا**
امرهم فيهم الى من هو اعظم منزلة عندهم اس شاذ اللفظ و تاکیدا

کہ عام لوگوں کی عادت ہے اوامر و نہی کو بڑے کی طرف متوجہ کر دیتے ہیں اگرچہ مقصود
اس سے غیروں کو ہدایت دینی ہوتی ہے۔ اس مقام پر یہی صورت ہے جس کو اعلیٰ حضرت نے

اختیار کیا ہے۔

الْحَقُّ مِنْ رَبِّكَ فَلَا تَكُونَنَّ مِنَ الْمُسْتَرِينَ (پہلے)

تو وہی ہے جو تیرا رب کہے پھر تو نہ ہوشک لانے والا۔ (محمود الحسن)۔

حق ہے پروردگار تیرے کی طرف سے پس مت ہوشک لانے والوں سے (شاہ رفیع الدین)
(اے پیغمبر یہ نیا قبلہ) تمہارے پروردگار کی طرف سے حق ہے تو تم ہرگز شک کرنے

والوں میں نہ ہونا۔ (فتح محمد)۔
حق وہی جو تیرا رب کہے پھر تو نہ ہوشک لانے والا (شاہ عبدالقادر)۔

یہ قطعی ایک امر حق ہے تمہارے رب کی طرف سے لہذا اس کے متعلق تم ہرگز کسی
شک میں نہ پڑو۔ (مولانا مودودی)۔

یہ امر حق سے تمہارے پروردگار کی طرف سے تو کہیں شک کر نیا والوں میں ہرگز
نہ ہو جانا۔ (عبدالماجد)۔

سو ہرگز شک و شبہ کرنے والوں میں شمار نہ ہونا۔ (اشرف علی)۔

(اے سننے والے) یہ حق تیرے رب کی طرف سے (یا حق وہی ہے جو تیرے رب کی طرف سے ہو) تو خبردار تو شک نہ کرنا۔ (اعلیٰ حضرت)۔

اس مقام پر بھی مترجمین نے شک کی نسبت نبی کریم کی طرف کی اور یہ ترجمہ کیا کہ تو نہ ہو شک لانے والا۔ لیکن اعلیٰ حضرت نے اس نازک مقام کو تفاسیر پر نظر رکھتے ہوئے اپنے ترجمہ سے حل فرمایا۔ (اے سننے والے) لفظ کا اضافہ کیا تاکہ نبی میں مخاطب نبی کریم نہ ہوں بلکہ عام امتی ہو۔ اعلیٰ حضرت کے ترجمہ پر بیضاوی کی عبارت بطور تائید دیکھیے و لیس المراد منہ الرسول صلی اللہ علیہ وسلم عن الشک فیہ لانہ غیث منوقع منہ و لیس بقصد واختیار بل ما تحقیق الامر انہ بحیث لا یشک فیہ ناظر اول الامر انہ بالکتاب المعاصر المزیج للشک علی الوجه الابلغ

اس پر بخشی کی عبارت اس طرح ہے: فان الانسان کمالا ینھی عمالا یتوقع منہ لا ینھی امیضا عمالا مدخل فیہ للقصد والاختیار کالشک والجهل والجور والحطش فاذا اوصفت صورة النبی فی مثل هذه المواضع لا یراد بها حقیقة النبی بل یقصد بها شئی اخر فقولہ تعالیٰ فلا تکن من المعتبرین

من قبیل الخطاب العام الی ساد علی صورة النبی والمقصود منہ اخبار کافة الناس بان المقام لیس بمظنہ لان یشتاب فیہ عن الالنام دونوں عبارتوں کا خلاصہ کلام اس طرح ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو شک سے نہیں روکا گیا کیونکہ آپ سے تو شک کی توقع بھی نہیں کی جاسکتی کیونکہ جس مقام پر نبی کی توقع نہ کی جاسکے وہاں نبی نہیں پائی جاسکتی۔ اسی طرح جہاں قصد اختیار نہ پایا جاسکے وہاں بھی نبی نہیں پائی جاتی۔ لہذا یہاں حقیقتاً نبی نہیں پائی گئی بلکہ یہاں عام خطاب ہے جو صورتہ نبی ہے۔ مقصد یہاں عام لوگوں کی خبر دینا ہے کہ یہ مقام ایسا ہے کہ اس میں کسی ایک کو شک نہیں کرنا چاہیے حقیقت یہ ہے کہ جس طرح اعلیٰ حضرت کا ترجمہ ایمان افروز ہے اس کا کوئی ثانی نہیں جس میں علمی بصیرت تفاسیر و لغات پر نظر ہوتی ہے محبت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک

درس ہے۔

وَمَا أَهْلٌ بِهِ لَغَيْرِ اللَّهِ (پ ۲۵)

(محمود الحسن)

اور جس چیز کا نام پکارا جائے اللہ کے سوا کسی اور کا نہ اور کوئی ایسی چیز نہ کھاؤ جس پر اللہ کے سوا کسی اور کا نام لیا گیا ہو (مولانا مودنی) اور جو (جانور) غیر اللہ کے لیے نامزد کیا گیا ہے حرام کیا ہے۔ (عبدالحمید) اور جس پر نام پکارا اللہ کے سوا کا۔ (شاہ عبدالقادر)۔

اور جو کچھ پکارا جانے والا ہے اوپر اس کے واسطے بغیر اللہ کے (شارفیع الدین)

اور وہ جانور جو غیر خدا کا نام لے کر ذبح کیا گیا۔ (اعلیٰ حضرت)

مسئلہ یہ ہے کہ جو جانور ذبح کرتے وقت اللہ کے نام کے بغیر کسی اور نام سے ذبح کیا گیا وہ حرام ہے جس طرح کفار اپنے بتوں لات و عزی کے ناموں سے اپنے جانوروں کو ذبح کرتے تھے ایسے باطل طریقوں سے روکا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ ایسے مذکورہ جانور حرام ہوں گے۔ اسی طرح اگر ذبح میں غیر خدا کا تقرب حاصل کرے گویا اس کو معبود سمجھے تو یقیناً وہ جانور حرام ہوگا اگرچہ اس کے ذبح کے وقت اللہ کا نام بھی لیا گیا ہو لیکن اگر ذبح کے وقت اللہ کا نام لیا گیا ہے اور اس مذکورہ کا گوشت اولیاء اللہ کے ایصالِ ثواب کے لیے تقسیم کیا گیا ہے یہ ارادہ خواہ قبل از ذبح موجود تھا یا بعد از ذبح، ہر حال میں وہ جانور حلال ہوگا۔ اس مسئلہ پر قطب القادری حضرت پیر مہر علی شاہ گوٹروی رحمہ اللہ کی اعلیٰ کلمۃ اللہ ایک جامع اور تحقیقی پر مبنی کتاب ہے۔ اس کا مطالعہ کیا جائے۔ یہاں تو صرف بیان کرنا مقصود ہے کہ کون سا ترجمہ تفاسیر کے مطابق ہے۔ و ما اهل به لغير الله اي خبم على اسم غيره تعالى والاهل

رفع الصوت وكانوا يرفعونه عند الذبح لا اله الا الله

(جلالین) جو جانور غیر اللہ کا نام لے کر ذبح کیا گیا ہو۔ اہلال کا معنی آواز بلند کرنا۔ بشرین ذبح کے وقت اپنے معبودوں کا نام لیتے تھے ای دفع به الصوت عند ذبح

للصوم (ریضاوی) یعنی ذبح کے وقت بتوں کا نام لیا جائے اسی ذبح للاصنام
فذكر عبد بن عباس اسم الله واصل الاصل كخم الصلوات في خم بالصوم للصوم وذلك قول اهل الحلية
باسم اللات والعزى (بتوں) یعنی غیر خدا کا نام لے کر ذبح کیا گیا۔ اصل اہلال آواز کو بلند کرنا
ذبح کے وقت بت کا نام لیا جائے۔ زبانہ جاہلیت میں وہ باسم اللات، باسم العزى کہتے
تھے۔ غیر کے تقرب کی وجہ سے ذبح کرنا ارتداد اور ذبیحہ حرام۔ اس کی وضاحت بھی
شیخ زادہ میں موجود ہے جس کا مقصد غیر اللہ کے لیے جانور کو خاص کرنا اور اسے مجبوء
سمجھنا ذبح کے وقت بھی یہی ارادہ ہو فمعنى قوله وما اهل بلغيث والله ما
ذبح للاصنام والصلوات غيت قال العلماء لو ذبح مسلم ذبيحة وقصد بها
التقرب الى غير الله صاير موقداً وذبائحته ميتة (غیر خدا) بتوں شیطانوں
کے نام ذبح کے وقت استعمال کرنا یا مسلمان کا غیر خدا کو معبود سمجھ کر اس کا تقرب چاہنا
یقیناً یا عشا ارتداد و حرمت ہے۔ بات تو اس مسئلہ میں ہے کہ ذبح کے وقت خدا کا
نام لیا جائے۔ اسی کو مجبوء وحدہ لا شریک لہ سمجھا جائے فقط کسی جانور کے گوشت
کی تقسیم سے کسی بزرگ کے لیے ایصال ثواب مقصود ہو اس میں کوئی قیاحت نہیں
یہ مسئلہ علامہ حضرت کے ترجمہ سے بخوبی واضح ہے۔

قَالَ تَنْبَأُ شُرُوهُنَّ (پ ۳۴)

پھر ملو اپنی عورتوں سے۔ (محمود الحسن)۔
اب تم اپنی بیویوں کے ساتھ شب باشی کرو۔ (مولانا مودودی)
سواب تم ان سے ملو ملاؤ۔ (عبد المجید)
اب تم کو اختیار ہے کہ ان سے مباشرت کرو۔ (فتح محمد)
پس اب ملا کرو ان سے۔ (شاہ رفیع الدین)
تو اب ان سے صحبت کرو۔ (اعلیٰ حضرت)

وَلَا تَنْبَأُ شُرُوهُنَّ (پ ۳۴)

وَلَا تَنْبَأُ شُرُوهُنَّ (پ ۳۴)

اور نہ ملو عورتوں سے (محمود الحسن) تو بیویوں سے مباشرت نہ کرو (مولانا مودودی)
بیویوں سے صحبت نہ کرو (عبد المجید) ان سے مباشرت نہ کرو (فتح محمد)
اور مت ملو ان سے (شہ رفیع الدین) اور عورتوں کو ہاتھ نہ لگاؤ (اعلیٰ حضرت)
یہاں اعلیٰ حضرت کے ترجمہ اور دوسروں میں فرق سمجھنے کے لیے ایک توجہ خیال
کیا جائے عورتوں سے ملو، یا ان سے صحبت کرو یا ان سے شب باشی کرو۔ ایک ہی معنی
میں استعمال ہوئے ہیں یعنی جماع کرنا۔ نہ ملو عورتوں سے یا ان سے مباشرت نہ کرو۔
یہ اسی پہلے معنی کی نفی ہے یعنی جماع نہ کرو۔ لیکن اعلیٰ حضرت کے ترجمہ میں "صحبت کرو"
پر نفی نہیں کہ ترجمہ یہ ہوتا ان سے صحبت نہ کرو۔ لیکن آپ نے ترجمہ کیا ہے "اور عورتوں
کو ہاتھ نہ لگاؤ" وجہ فرق کیا ہے؟ اس مسئلہ کو سمجھنے سے پہلے یہ سمجھا جائے کہ
باشی و ہن میں امر کا تعلق رمضان کی راتوں سے ہے اور ولا تَنْبَأُ شُرُوهُنَّ
کی نہی کا تعلق اعتکاف سے ہے۔ باشی و ہن کا ترجمہ سمجھنے سے پہلے اصل وجہ نزو
کو ذہن میں رکھیں: عن ابن عباس كانوا على عهد رسول الله عليه وسلم
اذا صلوا العشاء حرم عليهم الطعام والشراب والنساء وفي البخاري عن النبي
كون المنع مفقدا بالنوم قال الحافظ يحتمل ان يكون التقيد بالحقيقة
انما هو بالنوم وذكر صلوة لكون ما بعد ما مظنة
النوم غالباً۔ - حاشیہ جلالین بحوالہ کمالین -
حضرت ابن عباس فرماتے ہیں کہ نبی کریم کے زمانہ میں عشاء کی نماز ادا کرنے کے
بعد کھانا پینا، جماع کرنا منع تھا۔ بخاری شریف میں حضرت برابر سے مروی ہے کہ یہ
حکم سوتے کے بعد تھا۔ ان دونوں حدیثوں میں محاکمہ اس طرح کیا گیا ہے کہ حکم حقیقتاً
نہیں ہے ہی مقید تھا لیکن چونکہ بعد از نماز عشاء عام طور پر سویا جاتا ہے لہذا ایک جگہ
نماز عشاء کا ذکر ہے دوسری جگہ نہی کا۔ لیکن یہ حکم کئی صحابہ کرام کی معذرت پر
نسوخ کر دیا گیا اور جماع کو یا کھانے پینے کی رات میں جائز کر دیا گیا۔ لیکن رمضان کے
دن میں شہوت سے ہاتھ لگانا، بوس و کنار منع نہیں جب کہ انسان کو اپنے آپ پر اعتقاد

ہو۔ انہوں نے ہو یا وہ بے صبری سے کام لے کر غلطی نہ کر دے لیکن اعتکاف کی حالت میں جس طرح صحبت کرنا منع ہے اسی طرح اس کے دوائی بھی منع ہیں یعنی شہوت سے ہاتھ لگانا یا بوس و کنار۔ اب اس مسئلہ کی حقیقت جاننے کے بعد دونوں ترجموں میں پھر توجہ کریں۔ یہ مسئلہ صرف اعلیٰ حضرت کے ترجمہ سے واضح ہو گا کہ رمضان شریف میں جماع کی قید کو اٹھایا گیا لیکن اعتکاف کی حالت میں جماع سے اور اس کے اسباب سے بھی ممانعت ہے ھدایۃ کتاب الصوم میں دیکھیں ولا یأس بالقبلة اذا امن علی نفسه ای الجماع والامتزالی ویکره اذا الحیا من روزے کی حالت میں جماع یا انزال کی فکر نہ ہو تو بوسہ لینے میں کوئی حرج نہیں لیکن اگر یہ خطرہ ہو تو مکروہ ہے (بشرطیکہ انزال یا جماع نہ ہو ورنہ دونوں کا حکم علیحدہ لیکن اعتکاف میں کیا حکم ہے ھدایۃ باب الاعتکاف - ویحرم علی المعتکف الوطی لقوله تعالیٰ ولا تنباشی وھن وانتم عاکفون فی المساجد و کذا اللیس والقبلة لانه دواعیہ فیحرم علیہ اذھو محظوبہ کما فی الاحکام بخلاف الصوم لان الکف مکنت لا محظوبہ فلم یستعدالی دواعیہ

حالت اعتکاف میں وطی حرام ہے اور اسی طرح بوس و مس بھی منع ہے جس طرح احرام میں منع ہیں لیکن یہ روزے کا حکم نہیں کیونکہ وہاں جماع سے رکنا رکن صوم ہے یہ فرق واضح کرنے کے لیے اعلیٰ حضرت کا ترجمہ موزوں ترین ہے۔ ارباب ناظرین! اقدار انصاف کریں۔ اسی فقہی فرق پر کون سا ترجمہ دال ہے اور کون سا کوسوں دور ہے۔ اسی پر شیخ زادہ کی عبارت بھی شاہد ہے: واما اذا المسہا بشہوة او قبلھا او بالشر یا فساد فی الفرج فہو حرام علی المعتکف شہوت کے ساتھ مس اور بوسہ اور پیچیدہ و تطہین سب ہی معتکف پر حرام ہیں۔

وَعَلَى الَّذِينَ يُطِيقُونَهُ فِدْيَةٌ طَعَامُ مَسْكِينٍ (پ ۶۱)

اور جن کو طاقت ہے روزہ کی ان کے ذمہ بدلہ ہے ایک فقیر کا کھانا (محمود الحسن) جو لوگ روزہ رکھنے کی قدرت رکھتے ہوں (پھر نہ رکھیں) تو وہ فدیہ دیں (محمود حسن) اور جو لوگ اسے مشکل سے برداشت کر سکیں ان کے ذمہ فدیہ ہے کہ (وہ) ایک مسکین کا کھانا ہے۔ (عبد الماجد)۔

اور جو لوگ روزہ رکھنے کی طاقت رکھیں (لیکن رکھیں نہیں) وہ روزے کے بدلے محتاج کو کھانا کھلائیں (فتح محمد) اور اوپر ان لوگوں کے کہ طاقت رکھتے ہیں اس کی بدلہ ہے کھانا ایک فقیر کا۔ (شاہ رفیع الدین)

اور جنہیں اس کی طاقت نہ ہو وہ بدلہ دے ایک فقیر کا کھانا (اعلیٰ حضرت)۔ یہاں روزے کا فدیہ دینے کا ذکر ہے۔ آیا فدیہ وہ شخص دے جو روزہ رکھ سکتا ہے۔ پھر یہ حکم منسوخ ہو گیا۔ یا کہ حکم ابھی باقی ہے۔ فدیہ دینے کا حکم اس شخص کو ہے جو روزہ رکھنے کی طاقت نہیں رکھتا۔ اس مقام پر اعلیٰ حضرت کا دوسرا قول ہے۔ یہ ہی زیادہ معتبر ہے اگرچہ پہلے قول کو بھی ذکر کیا گیا ہے: وعلی الذین لا یطیقونہ کلبر او مرض لا یرجی برؤہ (جلالین) فدیہ ان لوگوں پر ہے جو روزہ رکھنے کی طاقت نہیں رکھتے بڑھاپے کی وجہ سے یا مرض دائمی کی وجہ سے۔

حاشیہ جلالین میں اس طرح ہے: قوله علی الذین لا یطیقونہ واعلم ان عند اکثر المفسرین فیہ قولان احدهما ان المراد بالذین یطیقون الا صحاء المقیمین خیرھم فی ابتداء الاسلام بین الامرین بین ان یصوموا و بین ان یغطروا ویغسلوا و لا یشتق علیہم لانہم کانوا المیتعوجون ثم تسخیر التیسیر و نزولت العزیمۃ بقوله فمن شہد مسکرا شہرا فلیصوم و ثانیہا ان یکون لا محذور فاعلم ان واقع فی کثیر من استعمال الفقہاء کما فی قوله تعالیٰ یبیین لکم

اَنْ تَصُومُوا وَكَانَ الْمُحْفَرُ عَلَى الدِّينِ لَا يُطِيقُونَ فِدْيَةَ طَعَامِ مُسْكِينٍ -
 بے شک اکثر مفسرین کے اس میں دو قول ہیں۔ ایک یہ ہے کہ اس سے مراد وہ
 لوگ ہیں جو طاقت رکھتے ہیں، صحیح ہوں، مقیم ہوں۔ ان کو ابتدائے اسلام میں
 اختیار دیا گیا تھا کہ وہ روزہ رکھیں یا افطار کریں اور فدیہ دیدیں تاکہ ان پر شاق
 نہ ہو کیونکہ ان کو روزہ رکھنے کی پہلے طاقت نہ تھی۔ پھر اس اختیار کو منسوخ کر دیا گیا :
 مِنْ شَهِدَ مِنْكُمْ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ - دوسرا قول یہ ہے کہ یہاں مخدوف
 ہے۔ نصیحت کے استعمال میں ایسا کثیر الوقوع ہے جیسے اللہ تعالیٰ کے ارشاد گرامی میں
 يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا تَصُومُوْا (یہاں بھی لا مخدوف ہے اور معنی ان
 لا تفعلوا ہے)۔ اس مذکورہ آیت میں معنی یہ ہے کہ علی الذین لا یطیقونہ
 فدیۃ اور جنہیں اس کی طاقت نہ ہو وہ فدیہ دیں۔ اسی نفی والے قول پر ایک اور
 صورت پیش کی گئی ہے۔ قوله یطیقونہ قال فی تفسیر الشیخ یطیق
 من اطاق فلان اذا سالت طاقته والمهمزة للسلب ای لا یقدرون
 علی الصوم یطیقونہ باب افعال سے جس کا ہمزہ سلب کے لیے آتا ہے۔ اطاق
 فعل کہتے ہیں جب کسی کی طاقت سلب ہو جائے۔ یہاں بھی ہمزہ سلب کے لیے ہے
 معنی یہ ہو گا کہ جو روزہ رکھنے کی طاقت نہیں رکھتے۔ زیادہ پسندیدہ قول یہ ہی
 ہے کہ یہ حکم منسوخ نہیں بلکہ شیخ فانی کے حق میں باقی ہے۔

اَحِلَّ لَكُمْ لَيْلَةَ الصِّيَامِ الرَّفَثُ اِلَى نِسَائِكُمْ (پ ۶۴)

حلال کی گئی واسطے تمہارے رات روزے کی رغبت کرنا طرف بیسیوں اپنی کی۔
 (شاہ رفیع الدین)

تمہارے لیے روزوں میں راتوں کو اپنی بیسیوں کے پاس جانا حلال ہوا (مولانا مودودی)
 حلال ہوا تم کو روزہ کی رات میں بے حجاب ہونا اپنی عورتوں سے (محمود الحسن)
 حلال ہوا تم کو روزے کی رات میں بے پردہ ہونا اپنی عورتوں سے (شاہ عبدالقادر)

روزوں کی راتوں میں تمہارے لیے اپنی عورتوں کے پاس جانا جائز کر دیا گیا۔
 روزوں کی راتوں میں اپنی عورتوں کے پاس جانا تمہارے لیے حلال ہوا۔ (فتح محمد)

فَلَا رَفَثَ (پ ۶۴)

تو بے حجاب ہونا جائز نہیں (مولانا محمود الحسن)۔

کوئی شہواتی فعل سرزد نہ ہو۔ (مولانا مودودی)۔

تو بے پردہ ہونا عورت سے۔ (شاہ عبدالقادر)

تو دلچسپی کے دنوں میں نہ عورتوں سے اختلاط کرے۔ (فتح محمد)

تو نہ عورتوں کے سامنے صحبت کا تذکرہ ہو۔ (اعلیٰ حضرت)

ان دونوں مقاموں میں رفث کا معنی ایک ہی لیا گیا۔ ایک جگہ مثبت، ایک
 جگہ منفی۔ لیکن اعلیٰ حضرت نے مثبت مقام میں جماع معنی لیا ہے کیونکہ عورتوں کے
 پاس جانا محاورۃ جماع ہی ہے۔ برخلاف دوسرے مقام کے وہاں صرف جماع
 کی نفی نہیں بلکہ عورتوں کے ساتھ صحبت کا تذکرہ بھی منع کیا گیا ہے۔ وجہ فرق کیا
 ہے؟ پہلی آیت کی وجہ تو باشی و حق کے ضمن میں گزر چکی ہے کہ رمضان شریف
 میں رات کی قیود کو اٹھایا اور جماع کو حلال کیا گیا۔ اب معنی بے حجاب ہونا یا بے
 پردہ ہونا، رغبت کر لیا جائے، یا عورتوں کے پاس جانا کر لیا جائے، ایک ہی صورت
 ہے۔ لیکن دوسرا مقام حج کے احکام میں ہے کہ حج میں رفث منع ہے۔ اب یہاں
 صرف جماع منع ہونا کافی نہیں بلکہ عورتوں کے سامنے ذکر صحبت بھی منع ہے۔

مدا رک میں ہے: فلا رفث هو الجماع ای ذکرہ عند النساء الخ
 رفث جماع ہے یا جماع کا عورتوں کے سامنے ذکر کرنا۔ ہدایہ میں بھی رفث کے

معنی ذکر الجماع بجزرة النساء موجود ہے۔ اسی طرح درمختار میں ہے: یتقی
 الرفث ای الجماع ای ذکر محضرة النساء یعنی رفث سے بچے۔ رفث کا معنی جماع
 ہے اور اسی طرح عورتوں کے سامنے صحبت کا تذکرہ کرنا۔ علامہ شامی نے

بعضہ الناس پر تحریر فرمایا: قول ابن عباس یعنی حضرت ابن عباس کا قول یہ ہے کہ عورتوں کے سامنے صحبت کا تذکرہ کرنا منع ہے۔ اب اعلیٰ حضرت کے ترجمہ کی فوقیت پر نظر کی جائے تو یقیناً سمجھ آئے گا کہ آپ نے اس فقہی باریکی کو مد نظر رکھ کر ترجمہ کیا جب کہ دیگر حضرات اس کو نہ سمجھ سکے۔

ثُمَّ أَفِيضُوا مِنْ حَيْثُ أَفَاضَ النَّاسُ (پ: ۴۶)

پھر طواف کے لیے پھر وہاں سے سب لوگ پھریں (مولانا محمود الحسن) پھر طواف کو چلو جہاں سے سب لوگ چلیں۔ (شاہ عبدالقادر) پھر بات یہ ہے کہ اے قریشیو! تم بھی وہیں سے پلٹو جہاں سے لوگ پلٹتے ہیں۔ (اعلیٰ حضرت)۔

زمانہ جاہلیت میں قریش کا دستور تھا کہ حج میں یہ عام لوگوں کے ساتھ مقامِ عرفات پر کھڑے نہیں ہوتے تھے بلکہ تکبر کی وجہ سے یہ مزدلفہ میں ٹھہرتے تھے۔ رب قدوس نے ان کو اس طریقہ سے روکا کہ تم بھی لوگوں کے ساتھ ہی ٹھہرو اور وہاں سے ہی ٹوٹو جہاں سے اور لوگ ٹوٹتے ہیں۔ تم مزدلفہ ہی سے پلٹ کر نہ آ جاؤ۔ یہ مفہوم اعلیٰ حضرت کے ترجمہ سے بہت واضح ہے جب کہ دیگر تراجم میں اس طرح نہیں کیونکہ دیگر تراجم سے یہ نہیں پتا چلتا کہ یہ حکم قریش کو ہے یا اور لوگوں کو۔ جلالین کی عبارت ملاحظہ ہو: ثُمَّ أَفِيضُوا بِأَفْجَاسِهِمْ مِنْ حَيْثُ

أَفَاضَ النَّاسُ أَيْ مِنْ عَرَفَاتٍ بَانَ تَقْفُوا أَبْهَاءَ بَعْضِهِمْ بِمَعْرَمِ أَيْ مَعَ سَائِرِ النَّاسِ وَكَانُوا لَا يَقْفُونَ بَعْضُهُمْ بَعْضًا وَكَانُوا يَقْفُونَ بِالْمَنْزِلَةِ مَتَرَفَعًا عَنْ الْوُقُوفِ أَيْ قَرِشِيو! تَمَّ وَهِيَ مِنْ (عرفات) سے پلٹو جہاں سے لوگ پلٹتے ہیں۔ مدارک میں بھی ایسے ہی ہے: هَذَا مِنْ قَرِيشٍ بِالْأَضَافَةِ مِنْ عَرَفَاتٍ أَيْ جَمْعٍ وَكَانُوا يَقْفُونَ

بِجَمْعٍ وَسَائِرِ النَّاسِ بَعْضُهُمْ بَعْضًا وَيَقُولُونَ هُنَّ فُطَانٌ (سكان) حرمِ فلاحی میں قریش کو حکم ہے کہ تم بھی عرفات سے پلٹ کر مزدلفہ میں آؤ کیونکہ وہ مزدلفہ میں ٹھہرتے تھے اور دوسرے لوگ عرفات میں ان کا کہنا یہ تھا کہ ہم چونکہ حرم کے رہنے والے ہیں لہذا حرم سے نہیں نکل سکتے۔

هَلْ يَنْظُرُونَ إِلَّا أَنْ يَأْتِيَهُمُ اللَّهُ فِي ظُلَلٍ مِنَ الْغَمَامِ (پ: ۴۷)

کیا وہ اس کی راہ دیکھتے ہیں کہ آوے ان پر اللہ ابر کے سائبانوں میں (محمود الحسن) کیا لوگ یہی انتظار رکھتے ہیں کہ آوے ان پر اللہ ابر کے سائبانوں میں (شاہ عبدالقادر) یہ لوگ صرف اس امر کے منتظر ہیں کہ حق تعالیٰ اور فرشتے بادل کے سائبانوں میں ان کے پاس آویں۔ (اشرف علی)۔

کیا اب وہ اس کے منتظر ہیں کہ اللہ بادلوں کا پتھر لگائے فرشتوں کے پرے ساتھ لیے خود سامنے آ موجود ہو (مولانا مودودی)۔

لڑیہ لوگ تو بس اسی کا انتظار کر رہے ہیں کہ ان کے پاس خدا بادل کے سائبانوں میں آجائے۔ (عبدالمجاہد) نہیں انتظار کرتے مگر یہ کہ آوے ان کے پاس اللہ بیچ سایوں کے بادلوں سے (شاہ رفیع الدین)۔

کا ہے کے انتظار میں ہیں مگر یہی کہ اللہ کا عذاب آئے چھائے ہوئے بادلوں میں۔ (اعلیٰ حضرت)۔

اس مقام پر بھی ترجمہ اعلیٰ حضرت کا تفسیر کے مطابق ہے لیکن دوسرے تراجم میں یہ ذکر ہے کہ اللہ آئے، خود سامنے آ موجود ہو۔ سب تراجم اللہ تعالیٰ کی شان کے لائق نہیں اور تفسیر کے برخلاف ہیں۔ کسی مفسر نے خود اللہ تعالیٰ کے آنے کا ذکر نہیں کیا۔ توحید کے دعوے دار نشان الوہیت کو سمجھنے میں قاصر ہے: الا ان یأتیہم اللہ اى امرة لقوله اى بآتی امرا بآتی اى عذابہ فی

ظلل جمع ظلة من الغمام السحاب (جلالین)

مگر یہی کہ اللہ کا امر آئے جس طرح دوسرے مقام پر آیا تو اس کی بک ہے۔ وہاں بھی اس کا عذاب مراد ہے یعنی اللہ کا عذاب آئے چھائے ہوئے بادلوں میں: الا ان یاتیمہ اللہ ای امرہ و باسہ (مدارک) یعنی اللہ کا امر اور عذاب آئے الا ان یاتیمہ اللہ ای یاتیمہ امرہ او باسہ (بیضاوی) مگر یہی کہ اللہ کا امر اور عذاب

فَاتَوَاحَرْتُكُمْ اَنۡی شِئْتُمْ (پ ۴۸)

جاؤ اپنی کھیتی میں جہاں سے چاہو۔ (محمود الحسن)۔

سو جاؤ اپنی کھیتی میں جہاں سے چاہو۔ (شاہ عبدالقادر)۔

تو او اپنی کھیتی میں جس طرح چاہو۔ (اعلیٰ حضرت)۔

اس مقام پر بھی ایک فرق تو یہ ہے کہ فاتوا، اتیان سے ہے جس کا معنی آنا ہے نہ کہ جانا۔ البتہ اس کے دوسرے معانی میں سے ایک معنی کسی سے گزرتا۔ اس تو جہیہ سے جانا معنی کیا جائے تو کچھ بات بنتی ہے۔ تاہم یہ وجہ کوئی اتنی اہم نہیں۔ زیادہ جو باعث گرفت بات ہے وہ یہ ہے کہ انی شئتم کا معنی۔ جہاں سے چاہو یہ سراسر تمام تفاسیر اور اصول فقہ کی جمیع کتب کے مخالف ہے اس لیے کوئی شخص اردو پر مکمل دسترس رکھنے والا کبھی تائید نہیں کر سکے گا کہ لفظ جہاں کیفیت کا معنی دیتا ہے بلکہ یہ مکانیت کا معنی دیتا ہے۔ اگر کسی آدمی کو یہ کہنا ہو کہ تو لاہور، کراچی، پشاور، اسلام آباد میں سے جس شہر میں جانا چاہے جاسکتا ہے۔ اسے یہ کہا جائے گا۔ تو جہاں چاہے جاسکتا ہے۔ لیکن اس کے برخلاف اگر یہ کہنا مقصود ہو تو سبق یاد کر چاہے بیٹھ کر یا کھڑے ہو کر یا لیٹ کر۔ یعنی جس حال میں چاہے اسی طرح تو یاد کر سکتا ہے مقصود تو سبق یاد کرنا ہے۔ اب اس جملے کو اردو گرامر میں اس طرح بیان کیا جاتے، جہاں چاہے سبق یاد کر۔ یہ غلط ہے۔ اردو زبان کی مشہور کتاب فیروز اللغات نے بھی لفظ جہاں کا استعمال اس طرح کیا ہے۔ جہاں۔

جس جگہ جس وقت جس گھڑی۔

اب اس مسئلہ کو سمجھنے کے بعد اصل آیت کے مقصود کی طرف آئیں۔ آیت کریمہ میں اپنی عورتوں سے جماع کا ذکر ہے۔ عورتوں کو کھیتی سے تشبیہ دی ہے۔ عربی زبان میں لفظ انی بمعنی این کے بھی آتا ہے اور کیف کے بھی صرف لفظ انی کو دیکھنے سے تو دونوں معنی صحیح ہیں۔ لیکن جب یہ دیکھا جائے کہ انی بمعنی این (جگہ) کے لینے میں خرابی ہے تو یقیناً یہ ایسی غلطی ہے جس کی کوئی توجہ نہیں ہو سکتی۔ یہ کہنا کافی نہیں کہ یہودی عورت سے دبر کی طرف سے فرج میں وطی کرنے سے بچے کے بھینگا ہونے کے قائل تھے۔ اس کا رد کیا ہے کہ دبر کی جانب سے وطی فرج میں کرنے سے یہ صورت نہیں۔ اس تفسیر سے انی کو بمعنی جہاں کے کرنا کیسے صحیح ہے۔ پھر بھی جس طرح ہی معنی کرنا صحیح ہوگا۔

اب اصل مسئلہ سمجھنے کے بعد دیکھیں۔ اسی مسئلہ کو نور الانوار نے اس طرح بیان کیا: ^{مشالہ} _{المشکل} قوله تعالى فاتواحرثکم انی شئتم فان کلمۃ انی مشکل فجاءت تاسما بمعنی من این کما فی قوله تعالى انی لک هذا ای من این لک هذا الرزق الا انی کل یوم وتاسما بمعنی کیف کما فی قوله تعالى انی یکون لی غلام ای کیف یکون لی غلام فاشبه ههنا انه بای معنی هو فان کان بمعنی این یکون المعنی من ای مکان شئتم قبل او دبراً فتعل اللواطة من امرئته وان کان بمعنی کیف فیکون المعنی بایئہ کیفیۃ شئتم قائما او قاعدا او مضطجعا فیدل علی تعمیم الاحوال دون المحال فاذا تأملنا فی لفظ الحرث علمنا انه بمعنی کیف لان الدبر لیس بموضع الحرث بل موضع الفرات اصول فقہ میں اسی کو مشکل کی مثال بنایا گیا ہے فاتواحرثکم انی شئتم۔ اس جگہ کلمہ انی مشکل ہے۔ کبھی این کے معنی میں آتا ہے جیسا قرآن پاک میں ہی استعمال ہے انی لک هذا حضرت زکریا نے حضرت مریم سے یہ سوال کیا کہ ہر دن آنے والا رزق

تمہارے پاس کہاں سے آتا ہے اور کبھی یہی نلفظانی معنی کیف کے آتا ہے جس طرح قرآن پاک میں آیا ہے: **انی یکون لی غلام** حضرت زکریا کو جب بیٹے کی نشأت دی گئی تو آپ نے کہا کہ میرا بیٹا کیسے ہوگا۔ اب مذکورہ مثال میں جب غور کیا کہ کس معنی میں لیا جائے کیونکہ یہاں اشتیاء ہوا۔ دیکھا کہ اگر این کے معنی میں لیا جائے تو معنی یہ ہوگا جس مکان سے چاہو وہی کر سکتے ہو۔ اس طرح قبل اور دبر دونوں مکانوں کا ثبوت ہو گیا۔ اس طرح لواطت ثابت ہوگی۔ اگر معنی کیف کے لیں تو معنی یہ ہوگا جس طرح چاہو، کھڑے ہو کر، بیٹھ کر، لیٹ کر۔ یہ معنی عموم احوال پر دال ہوگا۔ لیکن عموم محلیت پر دال نہیں ہوگا۔ اب تامل کیا کہ لفظ حرث کا استعمال معنی کھیتی کے ہے تو خود واضح ہو کہ خطر کے معنی میں لینا ہی درست ہے اس لیے کہ مقام پیداوار قبل ہے نہ کہ دبر بلکہ دبر تو فقط ایک گندگی کا مقام ہے۔ اسی طرح مدارک میں ہے: **فالتوا حرثکم ائی شتم جامعوہن منی شتم ائی کیف شتم** بارکۃ او مستلقیۃ او مضطجعة۔ ان سے جب چاہو جس طرح چاہو جماع کرو خواہ وہ حالت بر دک، استلقا یا اضطجاع ہو۔ جلالین میں ہے **فالتوا حرثکم ائی محلۃ و هو القبل ائی کیف شتم من قیام و قعود و اضطجاع و اقبال و ادبار من ذل و القول الیہود من ائی امرئۃ فی قبلہا من جہۃ دبرہا جاء الولد احوال** جماع فرج میں ہی ہو جس طرح چاہو حالت قیام ہو یا قعود و اضطجاع ہو۔ خواہ آگے کی جانب سے یا پیچھے کی جانب سے ہو۔ یہود کا رد کیا گیا ہے کہ ان کا گمان تھا کہ اگر پچھلی جانب سے جماع ہو تو بچہ احوال ہوگا۔ اب یہاں سے بھی واضح ہو کہ صحیح معنی جس طرح ہے۔ اگر معنی جہاں کیا جائے تو ساری توجہات باطل ہوں گی۔ حقیقت پسندی سے کام لیا جائے تو ضرور ماننا پڑے گا کہ یہ معنی جہاں والا کرتا غلط ہے۔

و للمطلقات متاع بالمعروف حقا علی المتقین (پہلے آیت)
اس آیت کریمہ کے ترجمہ میں اعلیٰ حضرت پر بہت اعتراض کیا گیا ہے۔ جس انداز پر زبان استعمال کی گئی وہ اور اعتراض کی پوری تفصیل بیان کرتا ہوں تاکہ آپ کو جواب سمجھنے میں دقت درپش نہ آئے۔

معرض کی بحث دیکھنے کے بعد تبصرہ تفاسیر کے آئینے میں دیکھیں۔

اعلیٰ حضرت کے ترجمہ پر معرض کی بحث: **طلاق شدہ عورت (عنوان) البقرہ میں طلاق کے احکام بیان کرنے کے بعد قرآن کریم نے طلاق شدہ عورتوں کے ساتھ حسن سلوک کرنے اور ان کے ساتھ احسان سے پیش آنے کا حکم بطور یاد دہانی کے مکرر فرمایا اور کہا: و للمطلقات متاع بالمعروف حقا علی المتقین** اس جگہ مترجم حضرات نے متاع بالمعروف کا ترجمہ، کچھ نہ کچھ فائدہ پہنچانا (تھانوی) فائدہ دینا ساتھ اچھی طرح کے (شاہ رفیع الدین) خرچ دینا ہے موافق دستور کے (شاہ عبدالقادر) کپڑے کے جوڑے وغیرہ سے کچھ سلوک کرنا (ڈپٹی تدبیر احمد) کیا تاکہ اس آیت میں طلاق شدہ عورتوں کے حقوق واجبہ اور اخلاقی حسن سلوک کی تمام صورتیں شامل ہو جائیں۔ وہ صورتیں حسب ذیل ہیں:-

- ۱۔ مہر مقرر تھا اور اب خلوت و ملاقات کے بعد طلاق دے دی گئی تو اب عورت کو پورا مہر دیا جائے گا۔ اور تا عدت نان و نفقہ ادا کرنا واجب ہوگا۔
- ۲۔ مہر مقرر نہ تھا اور خلوت کے بعد طلاق دے دی گئی تو اب مہر مثل واجب ہوگا۔ اور عدت کا نان نفقہ بھی۔
- ۳۔ مہر مقرر تھا اور خلوت سے پہلے طلاق دے دی گئی تو اب آدھا مہر واجب ہوگا۔

۴۔ لڑکی صغیرہ اور ناقابل خلوت ہے یا قابل خلوت ہے مگر خلوت نہیں ہوئی تو اب اسے کپڑا ایک جوڑا دینا واجب ہوگا اور اس پر عدت نہ

ہوگی۔ ان تمام صورتوں میں عورت کو فائدہ پہنچانا صادق آتا ہے کہیں پورے مہر کی صورت کہیں مہر مثل کی صورت میں اور کہیں آدھے مہر کی صورت اور آخری مسئلہ میں صرف ایک جوڑا کپڑے دینے کی صورت میں۔

اس آیت مذکورہ میں تمام صورتیں شامل ہیں اور قرآن کریم نے اس کے لیے ایک عام لفظ (متاع بالمعروف) استعمال کیا ہے لیکن مولانا احمد رضا خاں صاحب نے متاع بالمعروف کا ترجمہ یہ فرمایا ہے "اور طلاق لینے والیوں کے لیے بھی مناسب تان نفقہ ہے یہ واجب ہے پر میزگاروں پر" خاں صاحب کے ترجمہ کے مطابق مذکورہ چوتھی صورت بھی آیت کے حکم (تان نفقہ) میں شامل ہے کیونکہ وہ بھی طلاق والیوں میں شامل ہے حالانکہ یہ وہ طلاق والی ہے جس پر عدت واجب نہیں تو پھر شرعی تان نفقہ کید بطور حسن سلوک کے صرف کپڑے کا ایک جوڑا دینا کافی ہے ہو سکتا ہے کہ مولینا بریلوی کے سامنے کوئی ترجمہ ایسا بھی ہو جس کی مرہوم نے پیروی کی ہے لیکن بقول رضا خاں صاحب حضرات کے جس مجتہد و فقیہ بے مثال نے فتاویٰ رضویہ کے نام سے بارہ ہزار صفحات پر مشتمل فقہی مسائل کا خزانہ امت کے لیے چھوڑا ہو اس کی نظر آیت پاک کی اس باریکی کی صورت کی طرف کیوں نہیں گئی اور آیت کے مفہوم کو ایک صورت میں خالص کر کے آیت کی حقیقی روح کو بے اثر کر دیا۔ اس پر تعجب ہوتا ہے۔ حضرت شاہ عابد القادر صاحب کا محققہ تفسیری حاشیہ ملاحظہ فرمائیے اور دیکھئے کہ قرآن فہمی کی خداداد صلاحیت کیا چیز ہوتی ہے۔ لکھتے ہیں۔ پہلے فروع فرمایا تھا یعنی جوڑا اس طلاق پر کہ مہر نہ ٹھہرا ہوا اور ہاتھ نہ لگایا ہو۔ یہاں سب پر حکم فرمایا، سب طلاق والیوں کو جوڑا دینا بہتر ہے اور اس پہلی کو ضرور ہے۔ شاہ صاحب بتانا چاہتے ہیں کہ طلاق شدہ عورت کو مہر واجب کے ساتھ ساتھ کپڑے کا جوڑا دینا بھی مستحسن ہے تاکہ علیحدگی کے باوجود آپس میں صلح و احسان کے جذبات موجود رہیں۔ اور پہلی صورت میں یہ جوڑا دینا اور کچھ نہ کچھ فائدہ پہنچانا ضروری ہے۔ امید کی جاسکتی تھی کہ محشی مرحوم اس آیت پر تشریحی نوٹ لکھ کر مسئلہ

کو صاف کرتے لیکن مرحوم محشی بھی یہاں سے صاف بچ کر نکل گئے اور قرآن کریم کی ایک فقہی آیت کا ترجمہ تشنہ رہ گیا۔ میں نہیں چاہتا کہ خاں صاحب مرحوم کے ترجمہ کا علمائے دیوبند کے تراجم اور تفاسیر سے موازنہ کر کے اپنے رضا خانی بھائیوں کو تکلیف پہنچاؤں لیکن جو حضرات علمی مسائل کو علمی مسائل کی نظر سے دیکھتے ہیں ان سے گزارش ہے کہ وہ حضرات شیخ الہند کا تفسیری حاشیہ اور مولانا اثر علی خاں صاحب تھانوی کی بیان القرآن اور مولینا عبدالحق صاحب خفائی کی تفسیر خفائی کا مطالعہ کریں اور دیکھیں کہ ان حضرات نے البقرہ کی قانونی آیات طلاق کو قانونی اسلوب و انداز میں کس سلیقہ سے واضح کیا ہے اور کنسر الایمان ان تفاسیر کے مقابلہ میں ایک سطحی اور طالب علمانہ تفسیر نظر آتی ہے۔ (مقررہ کی بحث ختم)

تبصرہ | آپ فقہ کی باریکیوں سے بے خبر ہیں، خود مقررہ صاحب نے جو چوتھی صورت مطلق ذکر کی ہے مہر کے مقرر ہونے یا نہ ہونے کی کوئی قید نہیں لگائی۔ وہ محل نظر ہے کیونکہ لڑکی صغیرہ اور ناقابل خلوت ہے اور مہر مقرر تھا تو طلاق کی صورت میں نصف مہر ہے صرف جوڑا کپڑوں کا دینا کافی نہیں۔ ہاں اگر مہر مقرر نہ ہو تو یہ صورت ہے لیکن مقررہ صاحب نے مہر کے مقرر ہونے یا نہ ہونے کی کوئی قید نہیں لگائی۔ اسی طرح یہی دو صورتیں اس عورت میں بھی ہیں جو قابل خلوت تو ہے لیکن اس کو طلاق قبل از خلوت دیجائے تو مہر مقرر ہونے کی صورت میں نصف مہر اور مہر کے مقرر نہ ہونے کی صورت میں متعہ کپڑوں کا جوڑا، لیکن مقررہ صاحب کی عبارت سے یہ سمجھ آ رہا ہے کہ صغیرہ لڑکی کو ہر حال میں کپڑوں کا جوڑا دیا جائیگا حالانکہ مہر کے مقرر ہونے کی صورت میں یہ غلط ہے : وان تزوجھا ولم یسما لھا مہرا او تزوجھا علی ان لا مہر لھا فلھا مہر مثلھا ان دخل بھا او مات عنها ولو طلقھا قبل الدخول بھا فلھا المثل بعد الدخول کیا لیکن مہر مقرر نہیں کیا یا نکاح ہی اس شرط پر کیا کہ مہر نہیں دیا جائے گا۔ ایسی صورت میں اس عورت کو طلاق دخول

کے بعد دی گئی یا اس کا خاوند فوت ہو گیا تو اس عورت کو مہر شمل دیا جائے گا۔ فوت ہونے کی صورت میں دخول عدم دخول کی قی نہیں۔ اگر اسی صورت میں یعنی مہر مقرر نہیں کیا گیا تھا یا مہر کی نفی کر دی گئی تھی تو طلاق دخول سے پہلے دیدی گئی تو کپڑوں کا جوڑا دینا واجب ہوگا۔

دوسری بات یہ سمجھیں کہ مقرض صاحب نے خود اعتراف کیا ہے کہ میں نے اپنے ہی حضرات کے تراجم اور تفسیر کو دیکھا جو اردو زبان میں ہیں کیونکہ وہ خود لکھتے ہیں کہ ہو سکتا ہے مولانا بریلوی کے سامنے کوئی ترجمہ ایسا بھی ہو جس کی مرحوم نے پیروی کی ہے۔ یہ اعتراف حقیقت ہے جس کی وضاحت ابھی آتی ہے۔ تیسری بات یہ ہے کہ اس آیت کریمہ کا فقہی مسائل سے تعلق ہے جس کا اعتراف مقرض صاحب نے برملا کیا ہے۔ لہذا فقہی مسائل کی تفسیر احاف کی پیش کردہ ہی فقہ حنفی میں مقبرہ سوگی۔

آئیے! احاف کی مقبرہ تفسیر مدارک کو دیکھیں۔ آپ نے اس طرح تفسیر کی :
وللمطلقات متاع ای نفقة العدة کہ متاع سے مراد عدت کا نفقہ ہے۔ اب یہ کہنا کہ یہ ترجمہ جو فقہی صورت کو شامل نہیں کہ وہاں عدت نہیں۔ یہ فقہی باریکی سے بخیر ہے۔ یہ غلط ہے بلکہ حقیقت اس کے برعکس ہے جب کہ اعلیٰ حضرت کا ترجمہ تفسیر مدارک کے عین مطابق ہے۔ تو جب یہ کہا جائے گا کہ کثر الایمان ایک طالب علمانہ تفسیر ہے تو اس سے یہ کہنا خود بخود لازم آئے گا کہ مدارک بھی ایک طالب علمانہ تفسیر ہے لیکن ایک ایسے محقق و مدقق کو طالب علم کی حیثیت دینا جن کی کتاب متاراد کثر الدقائق کو درس نظامی کے کورس میں داخل کیا ہوا ہے یہ سورج کے سامنے منہ مٹھ چڑھانے کے مترادف ہے۔ اور اپنی جہالت و حماقت کا اعتراف کرتا ہے۔

اور اگر مطلقاً کچھ نفع دینا معنی کیا جائے تو اس میں تکرار ہے کیونکہ وہ عورت جس کا مہر مقرر نہیں کیا گیا اور خلوت بھی نہیں اس کو متعہ رکپڑوں کا جوڑا دینا تو مالہ تسوہن او فقہ منولہن من ریضۃ ومنعوهن میں آپکا ہے۔ یہ پھر تکرار ہے۔ اسی وجہ سے حاشیہ جلالین میں ہے وضمن صاحب العلامت المتاع بنفقة

العدة فلا تکرار یعنی صاحب مدارک نے متاع کا معنی عدت کا نان نفقہ لیا ہے لہذا اس میں کوئی تکرار نہیں۔ تفسیر کے مطالعہ سے تو اعلیٰ حضرت کے ترجمہ کی فوقیت واضح ہوتی ہے۔ لیکن جس شخص کے علم کا محور شیخ الہند کا تفسیری حاشیہ در بیان القرآن اور تفسیر حقانی ہو وہ نہ سمجھ سکے تو کوئی اعتراض بھی نہیں کیونکہ کم علم کو معذوری سمجھنا چاہیے۔ البتہ جہل مرکب کے حامل کو سمجھنا بھی ممکن نہیں لیکن اگر قصد اور عناد کو چھوڑ کر حقیقت پسندی کی طرف آنا ہو تو معتبر تفسیر کی عبارات کو اعلیٰ حضرت کے ترجمہ کی تائید پر پیش کر رہا ہوں تاکہ حق راہ نظر آئے اور محققین کو طالب علمانہ حیثیت دینے کی حماقت کرنے سے اجتناب کیا جائے ورنہ ان مفسرین کی شان میں کوئی فرق نہیں آئے گا۔ اور اپنی حماقت ثابت ہو جائے گی۔

البحر المحیط میں ہے : وقيل لمراد بالمتاع ههنا نفقة العدة متاع سے مراد عدت کا نفقہ ہے۔ یہاں سے بھی پتا چلا کہ نان نفقہ ترجمہ اعلیٰ حضرت کا ہی نہیں بلکہ اس میں اور ارباب تفسیر بھی شریک ہیں۔ الجامع لاحکام القرآن نے بھی اختلاف بیان کرتے ہوئے مقرض صاحب کی چوتھی صورت کو ایک قول میں خالص کیا ہے۔ الجامع کی عبارت کو ملاحظہ کریں : وقال عطاء ابن سباح وغيره هذه الآية في الثيبات اللواتي قد جو معن اذ تقدم في غير هذه الآية ذكر بيت المتعة اللواتي لم يدخل بهن عطاء وابن رباح وغيره نے کہا ہے کہ یہ ان عورتوں کے بارے میں ہے جن سے جماع کیا گیا ہو، ثیبہ ہوں۔ اس لیے کہ جن عورتوں سے دخول نہیں ہوا ان کے متعہ کا پہلی آیت میں ذکر آچکا ہے تفسیر منظر میں ہے : قيل المراد به متاع في هذه الآية نفقة أيام العدة كما هو المراد فيما سبق من قوله تعالى وصية لا تروا جہم متاعا الى الحول بجامع ان المراد في كل الصورتين الموت والطلاق محبوسا لحقوق الزوج فيجب الاتفاق في ماله متاع سے مراد زمانہ عدت کا نان و نفقہ مراد ہے جیسا کہ پہلے اللہ تعالیٰ کے قول وصية لا تروا جہم متاعا الى الحول میں عدت کے نان و

نفقہ کا بیان ہے۔ دونوں صورتوں یعنی موت و طلاق میں وجہ جامع یہ ہے کہ عورت چونکہ دورانِ عدت اپنے آپ کو حقوقِ زوج میں پابند رکھتی ہے اس لیے خاوند کے مال سے اس کا نفقہ لازم ہے۔ اسی طرح روح المعانی میں ہے: وقيل المسود بالعتاع نفقة الحدة متاع سے مراد عدت کا نان و نفقہ ہے۔

ناظرین کرام! آپ نے مذکورہ بالا عبارات سے سمجھ لیا ہوگا کہ اس آیتِ کریمہ میں متاع کا ترجمہ نان و نفقہ کرنے میں اعلیٰ حضرت منفرد نہیں بلکہ اکابرین مفسرین کرام کے اقوال بھی موجود ہیں۔ اب مخالفت یرائے مخالفت کے اصول پر عمل کرتے ہوئے جویش عناد کی وجہ سے جنبشِ قلم کی زد میں اکابرین مفسرین کرام کو لپیٹنا کہاں کا انصاف ہے۔ میں یہ عرض کرنے کی جسارت کروں گا۔ یہ کہنا کہ ہو سکتا ہے کوئی ترجمہ ایسا ہو اس سے پہلے تفاسیر کو دیکھ لیا جائے تاکہ بعد میں خود ہی صیاد اپنے دام میں نہ پھنس جائے۔

لطف کی بات یہ ہے کہ شاہ عبدالقادر صاحب کا ترجمہ بھی اعلیٰ حضرت کے ترجمہ کے مطابق ہے لیکن اس کی تعریف کر دی۔ اعلیٰ حضرت کے ترجمہ پر اعتراض۔ یہ انصاف سے بعید ہے۔ خیال کریں، مناسب نان و نفقہ یا خرچ دینا ہے موافق کے دستور کے، ان میں کتنا فرق ہے۔

وَالْاُخْلَةُ وَالْاُخْلَةُ (پ ۳۱)

اور نہ آشنائی اور نہ سفارش (محمود الحسن)

نہ دوستی کام آئے گی اور نہ سفارش چلے گی۔ (مولانا مودودی)

اور نہ دوستی اور نہ سفارش (عبدالمجید)

اور نہ آشنائی سے اور نہ سفارش (شاہ عبدالقادر)

اور نہ دوستی اور نہ سفارش ہو سکے۔ (فتح محمد)

اور نہیں دوستی اور نہیں سفارش۔ (شاہ رفیع الدین)

نہ (کافروں کے لیے) دوستی اور نہ شفاعت۔ (اعلیٰ حضرت)

اعلیٰ حضرت کے ترجمہ میں دوستی اور شفاعت کو کافروں کے ساتھ مختص کیا گیا ہے۔ جب کہ دوسرے ترجمہ میں عام طور پر نفی کی گئی ہے جس سے یہ بتا نہیں چلتا کہ مسلمانوں کی شفاعت ہو سکے گی یا نہیں۔ آئیے تفاسیر کی نظر میں اعلیٰ حضرت کے ترجمہ کو دیکھیں تو روزِ روشن کی طرح عیاں ہوگا کہ جس مسئلہ کو تفاسیر نے اعتراضات و جوابات کی شکل میں پیش کیا ہے اعلیٰ حضرت نے اس کو ایک لفظ کی زیادتی سے بیان فرما دیا ہے۔

وَالْاُخْلَةُ صِدَاقَةٌ تَنْفَعُ (جلالین) دوستی نہیں ہوگی جو کسی کو قیامت میں نفع پہنچائے۔ قوله صِدَاقَةٌ تَنْفَعُ لان الخلة لا تنفع يوم القيمة بين الاخلاء

الامتنين المتقين لقوله تعالى الاخلاء يومئذ بعضهم لبعض عدو الا المتقين (حاشیہ جلالین) دوستی کسی کے لیے قیامت میں نفع مند نہیں ہوگی سوائے امتقین کے دشمن ہونگے سوائے متقین کے: ولا شفاعت بغیر اذنه و هو يوم القيمة

(جلالین) اللہ تعالیٰ کی اجازت کے بغیر قیامت کے دن کسی کو شفاعت کرنے کا حق حاصل نہیں ہوگا۔ قوله بغیر اذنه هو جواب سوال کیف يصم نفی الشفاعة

على سبيل الاستغاث وقد ثبتت شفاعته الا قليلاً يوم القيمة

بالاحاديث كحديث انس سألت النبي صلى الله عليه وسلم ان يشفع لي يوم

القيمة فقال انا فاعل حسنة الترمذی وایضاً حسان الایته مقیداً لا من

اذن له الرحمن وسمی له قولاً والنبي ما ذون له ولا یستاذن فی ذن

ہ (جمل) مفسر رحمۃ اللہ علیہ نے بغیر اذنه کی قید کا کیوں اضافہ

کیا؟ اس لیے کہ یہ ایک سوال مقدر کا جواب ہے۔ وہ سوال یہ ہے کہ مطلقاً شفاعت

کی نفی کیسے کی گئی ہے کہ کسی کو کسی کی شفاعت کام نہیں آئے گی حالانکہ حدیثِ پاک

انبیائے کرام کی شفاعت کا ثبوت ہے کہ ان کو قیامت کے دن یہ حق حاصل ہوگا جیسا

کہ حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال

کیا کہ قیامت کے دن آپ میری شفاعت فرمائیں گے؟ آپ نے فرمایا کہ میں شفاعت کروں گا۔ (ترمذی نے اس حدیث کو حسن کہا ہے)۔

واضح ہوا کہ آیت کریمہ مقید ہے کہ جس کو رب کی طرف سے اجازت ہوگی اور رب نے جس کی بات کو پسند کیا وہ شفاعت کر سکے گا۔ اسی وجہ سے انبیائے کرام کو شفاعت کی اجازت ہوگی۔ اگر انبیائے کرام شفاعت کی اجازت طلب کریں پھر بھی ان کو اجازت دی جائے گی لیس لا یدعون عندہ الا باذنہ وهو بیان ملکوتہ وکبریائیہ وان احدا لا یتکلم عنہ الا بامره ان یتکلم یوم القیامت الا اذا اذن له فی الکلام وغیرہ۔ (مدارک) کسی ایک کو رب کے پاس اس کی اجازت کے بغیر سفارش کرنے کا حق نہیں ہوگا۔ یہاں اللہ تعالیٰ کی بادشاہی اور اس کی کبریائی کا ذکر ہے کہ قیامت کے دن کسی کو اس کی اجازت کے بغیر اس سے کلام کرنے کی اجازت نہیں ہوگی۔

اس سے کافروں کا رد کیا جا رہا ہے کہ وہ سمجھتے تھے کہ ہمارے بڑے ہمای سفارش کریں گے۔ یہاں سے بھی واضح ہوا کہ رب تعالیٰ کی طرف سے اجازت نہیں وہ سفارش نہیں کر سکتے۔ والشفاعة ثابتة للرسول والاخیار فی حق اهل الکتاب والمسئفین من الاخیار خلافا للعترة (شرح عقائد) رسولوں اور اخیار کو شفاعت کا حق گناہ کبیرہ کے مرتکبین کے لیے اخبار مشہورہ سے ثابت ہے اس میں معتزلہ کا خلاف ہے۔ قوله علیه السلام قوله عليه السلام شفاعتی لاهل الکتاب من امتی وهو مشہور بالاحادیث فی باب الشفاعة متواترة (شرح عقائد) نبی کریم کا ارشاد کہ میری شفاعت میری امت کے گناہ کبیرہ کے مرتکبین کے لیے بھی ہوگی یہ حدیث مشہور ہے بلکہ احادیث شفاعت متواترة المعنی ہیں والاخیار سے مراد کون لوگ ہیں نیز اس میں ہے: وهو الملک والصلحاء والشهداء وہ فرستے اور نیک لوگ اور شہید لوگ۔ نیز اس کے اسی مقام پر حاشیہ میں ہے:

قال الغزالی: علم انه اذا حق دخول النار علی طوائف من المومنین فان الله تعالى بفضلہ یقبل فیهم شفاعتہ الانبیاء والصدیقین بل شفاعتہ العلماء والصلحاء من کل من له عند الله تعالى جاه وحسن معاملة فان له شفاعتی اهلہ وقربائہ واصدقائہ ومعاصیہ فکل من جرد له علی ان یتکلم لنفسک عندہم من تبة الشفاعة علامہ غزالی فرماتے ہیں جب یہ حقیقت ہے کہ مومنوں کا ایک گروہ (گنہگار) جہنم میں جائیں گے بے شک اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے ان کے لیے انبیاء اور صدیقین کی شفاعت قبول فرمائے گا بلکہ علماء اور نیک لوگ، ہر وہ شخص جو اللہ کا مقرب ہے اور اس کا معاملہ ہے اللہ تعالیٰ سے اہل کی طرف سے یہ حق دیا جائے گا کہ وہ اپنے اہل اقرباء، احباب اور اپنی شناخت والے لوگوں کی شفاعت کر سکیں۔ لہذا اے عام مخاطب! تو بھی ان کے ہاں اپنی ذات کے لیے مرتبہ شفاعت حاصل کرنے میں حریص ہو جا۔ شفاعت کا ذکر احادیث میں بہت بساطت سے کیا گیا ہے۔ یہاں تو مختصار کے پیش نظر اس پر بحث نہیں کی جا رہی ورنہ یہی باب ایک ضخیم کتاب کو مستلزم ہے۔ ایک مختصر حدیث پر اکتفا کیا جاتا ہے: عن عثمان بن عفان قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم یشفع یوم القیمة ثلثة الانبیاء ثلثة العلماء ثلثة الشهداء (سواء ابن ماجہ) نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: قیامت کے دن تین حضرات انبیائے کرام علماء، شہداء و شفاعت کریں گے تین کا ذکر اتفاقی ہے۔ ان تین میں انحصار نہیں: شافعا و مشفعا تو آپ نماز جنازہ میں بچوں کے لیے دعائیں بھی پڑھتے ہیں جو ان کی شفاعت کرنا اور مقبول ہونے کی خود دعا کرتے ہیں۔ اب حقیقت حال واضح ہو چکی ہے کہ اعلیٰ حضرت کے ترجمہ میں کیا خوبیاں نہاں ہیں۔

فَبِئْسَ الَّذِي كَفَرَ (پ ۶)

تب حیران رہ گیا وہ کافر (محمود الحسن)۔

یہ سن کر وہ متحیر رہ گیا۔ (مولانا مودودی)۔

اس پر وہ جو کافر تھا دنگ رہ گیا۔ (عبد الماجد)۔

اس پر متحیر رہ گیا وہ کافر۔ (مولانا اشرف علی)۔

تب حیران رہ گیا وہ منکر۔ (شاہ عبدالقادر)۔

یہ (سن کر) کافر حیران رہ گیا۔ (فتح محمد)۔

تو ہوش اڑ گئے کافر کے۔ (المنصور)۔

اس مقام پر حضرت ابراہیم علیہ السلام کے نمرود کو جواب کرنے کا ذکر ہے کیونکہ جب نمرود کو آپ نے یہ فرمایا کہ میرا اللہ تعالیٰ تو زندہ کرتا ہے اور مارتا ہے۔ اس نے کہا کہ یہ کام تو میں بھی کر سکتا ہوں۔ اس نے دو قیدیوں کو لاکر نمرائے موت مانے والے کو بری کر دیا اور بری ہونے والے کو قتل کر دیا۔ کہا اگر میں ایسا نہ کرتا تو قتل ہونے والا زندہ رہتا اور زندہ رہنے والا قتل ہو جاتا۔ جب ابراہیم علیہ السلام نے اس غبی کی حماقت کو دیکھا کہ سمجھنے کی اہلیت سے محروم ہے تو آپ نے دوسری دلیل پیش فرمادی کہ میرا رب تو سورج کو مشرق سے نکالتا ہے اور تو مغرب سے نکال۔ وہ کافر جواب دینے سے عاجز آ گیا۔ اسی بات کو رب قدوس نے خیمت الذی کہنا سے ذکر فرمایا۔

اب آپ دیکھیں کہ یہ ترجمہ کرنا کہ کافر حیران رہ گیا ہش شد رہ گیا، دنگ رہ گیا۔ یہ اس لیے مقصد کو مکمل طور پر واضح نہیں کر رہا کہ اردو زبان میں لفظ حیران کبھی مقام پر بھی بولا جاتا ہے جیسے کبھی خوب صورت مقام کو دیکھ کر کہا جاتے ہیں اس کی خوبصورتی کو دیکھ کر حیران رہ گیا۔ یہاں تو معنی لا جواب ہونا ہے لیکن المنصور کا ترجمہ "تو ہوش اڑ گئے کافر کے" یہ صرف اسی معنی کو شامل ہے کہ وہ جواب دینے کی ہمت نہ کر سکا تحیر و دھشت (مدارک، جلالین) تفاسیر نے بھی متحیر و مدہوش کیا۔ یعنی اس کے ہوش اڑ گئے۔

الشَّيْطَانُ يَعِدُكُمُ الْفَقْرَ (پ ۶)

شیطان وعدہ دیتا ہے تم کو تنگدستی کا۔ (محمود الحسن)۔

شیطان وعدہ دیتا ہے تم کو تنگی کا۔ (شاہ عبدالقادر)۔

شیطان وعدہ دیتا ہے تم کو فقر کا۔ (شاہ رفیع الدین)۔

شیطان تمہیں اندیشہ دلانا ہے محتاجی کا۔ (اعلیٰ حضرت)۔

اس مقام پر مقصد کے قریب و تفاسیر کے مطابق المنصور کا ترجمہ نظر آتا ہے

يَعِدُكُمُ الشَّيْطَانُ الْفَقْرَ (جلالین)

ہے اگر تم نے صدقہ دیا تو محتاج ہو جاؤ گے۔ لہذا اپنا مال اپنے پاس ہی محفوظ

رکھو۔ يَعِدُكُمُ الشَّيْطَانُ الْفَقْرَ وَيَقُولُ لَكُمْ اِنْ عَاقَبْتُمُ الْفُقَرَاءَ تَقْتُلُوهُمْ

وَالْوَحْدُ يَسْتَعْمِلُ فِي الْخَيْرِ وَالشَّرِّ (مدارک) شیطان تمہیں

خرچ کرنے سے ڈراتا ہے محتاجی سے اور تمہیں کہتا ہے کہ تمہارے خرچ کرنے کا

انجام تمہارا محتاج ہونا ہے۔ اس سے آگے ایک ضابطہ کی طرف اشارہ کیا کہ وعدہ کا

لفظ خیر اور شر دونوں میں استعمال ہوتا ہے یعنی اگر خیر میں استعمال ہو تو جواب اور

اچھائی کی امید دلانا، اور شر میں استعمال ہو تو بمعنی وعید ہوگا یعنی ڈرانا۔ اس سے

پتا چلا کہ "شیطان تمہیں اندیشہ دلانا ہے محتاجی کا" یہ معنی یہ نسبت "وعدہ دیتا ہے"

کے زیادہ اور اک کے قریب ہے۔ بلکہ یوں کہا جائے کہ یہ مقام شر ہے اس لیے

اندیشہ دلانا، ڈرانا معنی کرنا ہی حقیقت ہے۔

اَوْ نَذَرْتُم مِّنْ نَّذْرٍ (پ ۶)

یا قبول کرو گے کوئی منت۔ (محمود الحسن)۔

یا قبول کرو گے کوئی منت۔ (شاہ عبدالقادر)۔

یا منت مانو۔ (اعلیٰ حضرت)۔

نذر، تمت کو قبول کرنا۔ عام اردو محاورہ وصول کرنے کو کہا جاتا ہے لیکن یہاں پورا مضمون ماقبل کا اور ان الفاظ مبارکہ کا یہ ہے۔ اللہ کی راہ میں جو مال تم خرچ کرو (زکوٰۃ، صدقات) یا نذر مانو۔ بے شک اللہ تعالیٰ اسے جانتا ہے (تمہیں بخرا دیگا) اور ظالموں کے لیے کوئی مددگار نہیں ظالموں سے مراد زکوٰۃ نہ دینا، نذر کو پورا نہ کرنا یا مال ناجائز کاموں میں خرچ کرنا یا معاصی کی نذر ماننا۔

اب اس وضاحت کے بعد تفاسیر کو دیکھیں: او مذنیتم من مذر بشروط او بغیر شیطانی طاعة او معصية فان الله يعلمه فيجازيكم عليه یعنی تم کوئی نذر مانو شرط سے متعلق ہو یا نہ ہو، خواہ نذر نیک کام کی ہو یا بد کی اللہ تعالیٰ اس کا اسی کے مطابق بدلہ دیگا او مذنیتم من مذنی طاعة الله او مخ معصيته فان الله يعلمه لا يخفى عليه هو مجاز یکہ علیہ (مدارک) یعنی کوئی نذر تم مانو نیک کام میں ہو یا معصیت میں، اللہ پر مخفی نہیں وہ تمہیں اس کا ایسا ہی بدلہ دے گا۔

اب بخوبی واضح ہوا کہ تمت ماننا معنی اس مقام کے مناسب ہے، تمت قبول کرنا مناسب نہیں۔

وَاصْطَفٰكِ عَلٰی نِسَاءِ الْعَالَمِيْنَ (پ ۳۴)

اور جہان کی عورتوں کو منتخب کیا ہے۔ (فتح محمد)۔
اور برگزیدہ کیا تم کو اوپر عورت عالموں کے۔ (شاہ رفیع الدین)۔
اور پسند کیا تجھ کو سب جہان کی عورتوں پر۔ (محمود الحسن)۔
او تمام دنیا کی عورتوں پر تجھ کو ترجیح دے کر اپنی خدمت کے لیے چن لیا۔ (مولانا مودودی)۔

اور آپ کو دنیا جہان کی عورتوں کے مقابلہ میں برگزیدہ کر لیا ہے۔ (عبدالماجد)
اور تمام جہان کی بیبیوں کے مقابلہ میں منتخب فرمایا ہے۔ (مولانا اشرف علی)

اور پسند کیا تجھ کو سب جہان کی عورتوں سے (شاہ عبدالقادر)۔

اور آج سارے جہاں کی عورتوں سے تجھے پسند کیا۔ (علی حضرت)۔

یہاں حضرت مریم علیہا السلام کو خطاب ہے۔ علی حضرت کے ترجمہ میں لفظ ”آج“ کی زیادتی ہے جو بظاہر وہم واقع ہوتا ہے۔ اس کا تفسیر نے بھی ازالہ کیا اور اس وہم کے ازالہ کے لیے تفسیر کے مطابق اعلیٰ حضرت نے بھی ایک لفظ کی زیادتی کی۔ وہ یہ وہم ہوتا ہے کہ حضرت مریم کو تمام جہان کی عورتوں پر فضیلت کیسے حاصل ہے حالانکہ حضرت فاطمہ اور حضرت عائشہ پر حضرت مریم کو فضیلت حاصل نہیں۔

اس کا جواب دیا گیا ہے اہل علماء (جلالین) معنی تمہیں اپنے زمانے کی عورتوں پر فضیلت حاصل ہے۔ اسی مقام پر جلالین کے حاشیہ پر وضاحت موجود ہے۔

وَاصْطَفٰكِ عَلٰی نِسَاءِ الْعَالَمِيْنَ اٰی بَانَ وَهَبَ لَكَ عِيسٰی مِنْ غِيَابٍ وَلَمَّا كَانَ ذَلِكَ لَاحِدًا مِنْ النِّسَاءِ هَذَا وَانْ كَانَ مِنْ خِصَالِ مَنْ مَرَّ بِهَا

السلام لکن لا یلزم من هذه الفضیلة افضیلتها مطلقاً علی فاطمہ بنت

محمد صلی اللہ علیہ وسلم وعائشہ زوجة النبی صلی اللہ علیہ

وسلم ففاطمہ وعائشہ رضی اللہ عنہما افضل نساء العالمین

من الاولین والاخرین۔ کما هو المذهب المحقق عند العلماء یعنی مفسر

الرحمۃ نے اہل زمانہ کے الفاظ کو کیوں زیادہ کیا۔ اس لیے کہ حضرت مریم کو بغیر باب

کے حضرت عیسیٰ کا عطا ہونا اگرچہ آپ کی خصوصیت ہے لیکن اس سے یہ لازم نہیں آتا

کہ آپ کو مطلقاً حضرت فاطمہ بنت النبی صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت عائشہ زوجہ النبی صلی

اللہ علیہ وسلم پر بھی فضیلت حاصل ہو۔ اگرچہ یہ خصوصیت تو ان دونوں کو حاصل نہیں لیکن

ان دونوں کو کثرتِ خصائل حاصل ہیں جو احادیث مبارکہ میں وارد ہیں جو فضائل حضرت

مریم میں نہیں پائے جاتے پس فاطمہ اور عائشہ رضی اللہ عنہما کو تمام جہان کی عورتوں

پر فضیلت ہے۔ اس پر علماء کی تحقیق و اتفاق موجود ہے۔ یہ وجہ تھی جس کا مفصل

بیان علی حضرت کے ایک لفظ سے سمجھ میں آتا ہے لیکن اگر مطلقاً عام تراجم کی طرح

ترجمہ کیا جاتا تو اعتراض کا اندفاع ممکن نہیں تھا۔

نَحْنُ أَنْصَارُ اللَّهِ (پ ۲۶، پ ۲۷)

ہم ہیں مدد کرنے والے اللہ کی۔ (محمود الحسن)۔ ہم اللہ کے مددگار ہیں (موسیٰ)
ہم ہیں اللہ کے مددگار (عبدالماجد)۔ ہم ہیں مدد کرنے والے اللہ کے (شاہ عبدالقادر)
کہ ہم ہیں مدد دینے والے اللہ کے۔ (شاہ رفیع الدین)۔
ہم اللہ کے دین کے مددگار ہیں۔ (اعلیٰ حضرت)۔

یہاں ذکر کیا جا رہا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا کہ کون شخص ہے جو اللہ کے دین میں میری مدد کرے گا۔ آپ کے حواریوں نے کہا کہ ہم اللہ کے دین کی مدد کریں گے۔ اب اس مفہوم کو ان الفاظ میں ادا کرتا کہ ہم ہیں اللہ کی مدد کرنے والے۔ یہ بظاہر بہت بڑی غلطی کا عام آدمی کے لیے سبب بن جاتا ہے کیونکہ عام لوگ صرف ترجمہ کو دیکھ کر خود بخود مطالب حاصل کرنے میں کوشاں رہتے ہیں جو یقیناً اس سے مطلب حاصل کریں گے کہ معاذ اللہ اللہ تعالیٰ بھی مدد کا محتاج ہے لیکن جب یہ ترجمہ کیا جائے ”ہم دین خدا کے مددگار ہیں“ تو اس میں یہ وہم نہیں ہوتا بلکہ مطلب صاف واضح ہو جاتا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم کو دین خدا کے پھیلانے میں مدد کرنے کا ارشاد فرمایا اور اسی کا انھوں نے جواب دیا کہ ہم دین خدا کے مددگار ہیں۔ اعلیٰ حضرت کے ترجمہ کو ہی تفاسیر بھی واضح کرتی ہیں: نحن انصار الله اعوان دينه (مدارک) ہم اس کے دین کے مددگار ہیں۔ بعینہ ان الفاظ سے ہی جلالین میں تفسیر کی گئی ہے۔

وَمَكْرُوا وَمَكَرَ اللَّهُ وَاللَّهُ خَيْرُ الْمَكِرِينَ (پ ۲۶)

اور مکر کیا ان کافروں نے اور مکر کیا اللہ نے اور اللہ کا مکر سب سے بہتر ہے۔ (محمود الحسن)۔

فریب کیا ان کافروں نے اور فریب کیا اللہ نے اور اللہ کا داؤ سب سے بہتر ہے۔ (شاہ عبدالقادر)۔

(یعنی یہود قتل عیسیٰ کے بارے میں) ایک چال چلے اور خدا بھی (عیسیٰ کو بچانے کے لیے) چال چلا اور خدا خوب چال چلنے والا ہے۔ (فتح محمد)۔
اور مکر کیا انھوں نے یعنی کافروں نے اور مکر کیا اللہ نے اور اللہ بہتر مکر کرنے والا ہے۔ (شاہ رفیع الدین)۔

اور کافروں نے مکر کیا اور اللہ نے ان کے ہلاک کی خفیہ تدبیر فرمائی اور اللہ سب سے بہتر تدبیر والا ہے (اعلیٰ حضرت)

اس آیت کریمہ کا ترجمہ کرتے وقت عام مترجمین نے اس مقام کی نزاکت کو نہیں سمجھا اور براہ راست مکر، فریب، دھوکا، دغا، داؤ جیسے الفاظ کی نسبت ربّ قدّوس بے عیب ذات کی طرف کر دی۔ عام انسان جو مفسرین کرام کے نکات سے بے خبر ہے ضرور یہ سمجھے گا کہ حقیقتہً اللہ تعالیٰ مکار، دھوکا باز وغیرہ ہے (معاذ اللہ) اسی وجہ سے مفسرین کرام نے اس مقام پر نہایت غور و فکر کے بعد بتایا کہ یہاں مکر کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف کیسے ہے: وَمَكَرَ اللَّهُ عِبَارَةً عَنْ الْاِخْتِيَالِ فِي الْيَصَالِ الشَّرِّ وَالْاِخْتِيَالِ عَلَى اللَّهِ تَعَالَى مُحَالٌ فَصَارَ لِفِظِ الْمَكْرِ فِي حَقِّهِ مِنَ الْمِثْلَابَاتِ وَذَكَرُوا فِي تَاْوِيلِهِ وَجْهًا اَحَدًا اَنَّهُ تَعَالَى سَمَّى جَزَاءَ الْمَكْرِ مَكْرًا اَقُولُهُ تَعَالَى وَجْهًا سَيِّئَةً سَيِّئَةً مِثْلَهَا سَمَّى جَزَاءَ الْمَخَادَعَةِ بِالْمَخَادَعَةِ وَجْهًا اَلَا سَمَّيْتُ بِالْاِسْتِهْزَاءِ وَالْثَانِي اَنَّهُ مُعَامَلَةٌ لِلَّهِ مَعَهُمْ كَانَتْ شَبِيهَةً بِالْمَكْرِ فَسَمَّى بِذَلِكَ. وَالثَّالِثُ اَنَّهُ هَذَا الْفِظُ لَيْسَ مِنَ الْمِثْلَابَاتِ لِأَنَّهُ عِبَارَةٌ عَنْ التَّدْبِيرِ الْمَحْكَمِ الْكَامِلِ ثُمَّ اخْتَصَّ فِي الْحَرْفِ بِالتَّدْبِيرِ فِي الْيَصَالِ الشَّرِّ إِلَى الْغَيْبِ وَذَلِكَ فِي حَقِّ اللَّهِ تَعَالَى غَيْبٍ مُّقْتَضٍ وَاللَّهُ اعْلَمُ (کبیر)

اعتراض یہ ہوا کہ مکر کا معنی ہوتا ہے کہ کسی کو شہر پہنچانے میں جیلہ کرتا اور اللہ تعالیٰ کا ایصالِ شہر میں جیلہ کرنا محال ہے۔

جواب : یہ لفظ اللہ تعالیٰ کی شان میں استعمال ہونے سے تشابہات سے ہے۔ اس کی مختلف تاویلیں کی گئیں۔ ایک یہ ہے کہ یہاں جزاء مکر کو مکر سے تعبیر کیا گیا ہے جس طرح قرآن پاک میں جزاء مسیحیہ کو سنیہ کہا گیا ہے۔ اسی ضابطہ کے مطابق جزاء مخادعہ کو مخادعہ سے اور جزاء استہزار کو استہزار سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اب اس تاویل کے مطابق مکر اللہ کا معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ مکر کی جزا دیتا ہے۔ دوسری تاویل یہ کی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ ان سے ایسا معاملہ فرماتا ہے کہ جو ان کے مکر کے مشابہ ہوتا ہے یعنی مکر کا اصل مطلب یہ ہے کہ کسی کو نقصان پہنچانے میں خفیہ طور پر حیلہ کرنا جس سے وہ بے خبر ہو۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ ان کو اس فعل کی جزا دے گا جس جزا (عذاب) سے وہ بے خبر ہیں۔

تو اس طرح مکر کی مشابہت ہوئی کیونکہ وہ کسی ایک صورت میں کافی ہوتی ہے وہ فقط خفا ہے۔ انھوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو قتل کرنے کا حیلہ ان سے مخفی رکھا اللہ تعالیٰ کا عذاب ان سے مخفی ہے۔ اب اس صورت میں مکر اللہ کا معنی ہوا اللہ تعالیٰ ان کے مکر کا معاملہ ان سے ایسا ہی فرمائے گا۔ تیسری صورت یہ ہے کہ یہ لفظ تشابہات سے نہیں بلکہ اس کا معنی تدبیر محکم و کامل۔ پھر عرف میں اس کا معنی مختص ہو گیا کہ کسی کو عذاب پہنچانے، ہلاک کرنے میں خفیہ تدبیر کرنا اور یہ اللہ تعالیٰ کے حق میں منتخ نہیں۔ اب تفسیر کبیر کی اس بحث کے بعد علحضرت کے ترجمہ کو دیکھیں آپ کا ترجمہ اسی تیسری صورت کے عین مطابق ہے کہ اللہ نے ان کے ہلاک کی خفیہ تدبیر فرمائی۔ لیکن باقی تراجم کو بھی دیکھا جائے کہ ان تینوں صورتوں میں کسی کے مطابق بھی نہیں ہیں۔ جب تراجم کا مقصد عام اردو دان کو سمجھانا مقصود ہے وہی ترجمہ اس کو راہ راست پر لا سکتا ہے جس میں وہ غلطیوں میں واقع ہو کر اللہ تعالیٰ پر عیب ثابت کرنے شروع نہ کر دے۔ اسی طرح پہلے ۱۹ء میں بھی تراجم میں فرق موجود ہے۔ اسی طرح پہلے ۲۰ء کے ترجمہ میں بھی مترجمین نے ایسی ہی غلطی کی۔

اِنْ مَّتَوْفِيكَ (پہلے)

میں نے لوں گا تجھ کو۔ (محمود الحسن) اب میں تجھے واپس لے لوں گا (موردی) اے عیسیٰ میں تم کو موت دینے والا ہوں۔ (عبد الماجد)۔ بے شک میں تم کو وفات دینے والا ہوں۔ (اشرف علی)۔ میں تجھ کو پھر لوں گا (شاید القادر) تحقیق میں پھر لینے والا تجھ کو (رفیع الدین) میں تجھے پوری عمر تک پہنچاؤں گا۔ (علحضرت)۔ یہ خطاب ہے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو۔ اگر ترجمہ کیا جائے کہ میں نے لوں گا تجھ کو، موت دینے والا ہوں۔ اس میں کئی احوال ہیں۔ تجھے لے لوں گا یعنی تیری روح کو قبض کر لوں گا۔ تجھے اپنی حفاظت میں لے لوں گا۔ یہ الفاظ احمدیوں کے عقائد کا رد نہیں کرتے۔ اور موت دینے والا ہوں۔ یہ ترجمہ ان کی امداد کرتا ہے کیونکہ ان کا عقیدہ ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام تو فوت ہو چکے ہیں ان کے متعلق تورب فرما چکا ہے۔ اِنْ مَّتَوْفِيكَ لہذا حدیث پاک میں مسیح موعود کا ذکر ہے۔ اس سے مراد ہمارا نبی (کذاب) مرزا غلام احمد دیا نی (لعنہ اللہ علیہ) ہی ہے لیکن ان کے اس نظریے کے ابطال کے لیے علحضرت کا ترجمہ موزوں ترین ہے حقیقت یہ ہے کہ علحضرت کا ترجمہ تفسیر کبیر کے مطابق ہے۔ یہ احمدیوں کا فروں کا گروہ توکل کی پیداوار ہے۔ علامہ رازی نے پہلے ہی ایسی تفسیر کی جو ان کے اس وہم کو دور کرنے کے لیے کافی ہے: محبتی قولہ اِنْ مَّتَوْفِيكَ اِی اِنِّی مَتَمِّمُ عَمَلِکَ فَحَبِیْتُ ذَا اِنْفَاکَ فَلَا اَمْرَ کَہُمْ حَقَّ یَقْتُلُوکَ بَلْ اَنَا فَعَلْتُ اِلٰی سَمَاعِیْ وَ مَقَرِّکَ بِمَلَا مَکَتِیْ وَ اَصَوْنُکَ عَنْ اَنْ یَّمْکُنَا مِنْ قَتْلَکَ وَ هَذَا تَاوِیْلٌ حَسَنٌ میں تمہیں پوری عمر تک پہنچاؤں گا پھر تمہیں وفات عطا کروں گا۔ ان کو نہیں چھوڑوں گا کہ وہ تمہیں قتل کر سکیں بلکہ میں تمہیں آسمانوں کی طرف اٹھاؤں گا۔ اپنے ملائکہ کے ساتھ تمہیں اُٹھاؤں گا۔ میں آپ کی حفاظت کروں گا۔ وہ تمہیں قتل کرنے کی قدرت نہیں رکھ سکتے۔ یہ تاویل

اچھی ہے معلوم ہوا کہ جس تاویل کو علامہ رازی نے اچھا کہا ہے، پسند کیا ہے وہ یہی ہے کہ میں تمہیں پوری عمر تک پہنچاؤں گا۔ ان کے قتل کرنے کے دعوے باطل ہیں۔ وہ کسی طرح بھی اس پر قادر نہیں ہو سکتے۔ یہ ہی ترجمہ اعلیٰ حضرت کا بھی ہے اور اسی سے احمدیوں کا رد کامل طور پر ایک اردو دان بھی ترجمہ سے سمجھ سکتا ہے۔ اسی طرح مدارک نے بھی تفسیر کی: انفی منوفیت اسی مستوفی اجلاک یعنی تمہیں پوری عمر تک پہنچاؤں گا۔

ثُمَّ جَاءَكُمْ رَسُولٌ (پت ۱۱)

پھر آوے تمہارے پاس کوئی رسول۔ (محمود الحسن)۔

کل اگر کوئی دوسرا رسول آئے۔ (مولانا مودودی)۔

پھر تمہارے پاس کوئی رسول آئے۔ (عبدالمجاہد)۔

پھر تمہارے پاس کوئی اور پیغمبر آئے۔ (اشرف علی)۔

پھر آوے تمہارے پاس کوئی رسول۔ (شاہ عبد القادر)۔

پھر تمہارے پاس کوئی پیغمبر آئے۔ (فتح محمد)۔

پھر تشریف لائے تمہارے پاس وہ رسول (اعلیٰ حضرت)۔

وجہ فرق آوے، آئے اور تشریف لائے میں ثابت ہے۔ ہر ذی شعور کے

فہم و ادراک سے بعید نہیں کہ "تشریف لائے" جس طرح ادب و احترام پر دال ہے

اس طرح لفظ آوے میں کیسے ادب و احترام؟ دوسرا فرق "کوئی رسول" عام ہے وہ

رسول خاص ہے۔ اس فرق کو سمجھنے سے پہلے اس آیت کریمہ کے سیاق و سباق کا کچھ

مطلب ذہن نشین کریں۔

وہ یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے انبیائے کرام سے وعدہ لیا کہ جب میں تمہیں

کتاب و حکمت عطا کروں پھر تمہارے پاس وہ رسول تشریف لائیں جو تمہاری کتاب و

حکمت کی تصدیق کرنے والے ہوں تو ضرور بر ضرور ان پر ایمان لانا اور ان کی امداد کرنا۔

پھر رب تعالیٰ نے ان کو فرمایا کہ کیا تم نے اقرار کر لیا اور اس میرے وعدے کو قبول

کر لیا؟ تو انہوں نے عرض کیا کہ ہم نے اقرار کر لیا۔ اب اس مفہوم کے سمجھنے کے بعد واضح ہو کہ یہاں جن رسول مقبول علیہ الصلوٰۃ والسلام کے متعلق انبیائے کرام سے وعدہ لیا گیا وہ خاص رسول حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ اگر یہاں یہ وہم پیش کیا جائے کہ آیت کریمہ میں لفظ رسول نکرہ ہے اس کے مطابق کوئی رسول ہی ترجمہ ٹھیک ہے تو وہ رسول یہ تو خاص ہے۔ یہ ترجمہ کیسے درست ہے۔ تو اس کا جواب یہ دیا جائے گا کہ نکرہ کا تنوین تعظیم سے خاص ہو جاتا نحو کی کتب میں موجود ہے اور تنوین کا تعظیم کے لیے ہونا بھی علم معانی میں مذکور ہے۔ جب معنی رسول مقبول کیا جائے گا تو تخصیص ہوگی جس سے مراد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہی ہوں گے۔ اسی پر لغاتیر بھی دال ہیں: ثم جاءكم رسول مصدق لما معكم من الكتاب والحكمة وہو محمد صلی اللہ علیہ وسلم (جلالین) پھر تمہارے پاس وہ رسول تشریف لائے جو تصدیق کر نیوالے ہوں تمہاری کتاب و حکمت کی۔ وہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ یہ حکم اگرچہ بظاہر انبیائے کرام کو ہے لیکن ان کی امتیں بھی ان کے تابع ہونے کی وجہ سے اس حکم میں داخل ہیں و امم مطہر تتبع لهم في ذلك (جلالین) انبیائے کرام کی امتیں بھی ان کے تابع ہونے کی وجہ سے اسی حکم میں داخل ہیں۔ اب یہاں پر اگر یہ وہم پیش کیا جائے کہ انبیائے کرام سے وعدہ لینے اور اقرار کرنے کی وجہ کیا ہے جب کہ نبی کریم آخر الزماں ہیں۔ انبیائے کرام نے تو آپ کا زمانہ پانا ہی نہ تھا۔ اس کا جواب صاوی میں ہے سوال و جواب اس طرح پیش کیا گیا ہے: قول اقرئنا جواب عن سوال مقدس تفيده ما اذا قالوا حينئذ وشوق المعاهدة على محمد مع علماء الله انه لا يأتي في زمن من من انبياء النوايا على العزم بالاتباع والبعث على العزم بعدم الايمان فجميع الانبياء يشاؤون على الايمان بمحمد ومن عزم على عدم الايمان به لو ظن عوقب سوال یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کو علم ہے کہ انبیائے کرام میں سے کوئی بھی نبی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں نہیں آئیں گے تو اس وعدہ و اقرار کا کیا فائدہ

اس کا جواب یہ دیا گیا ہے کہ یہاں مقصود یہ ہے کہ جو نبی کریم پر ایمان لائے
کا عزم کرے اس کو ثواب دیا جائے اور جو ایمان نہ لائے کا عزم کرے اس کو عذاب
دیا جائے۔ گویا جمیع انبیائے کرام کو نبی کریم پر ایمان لانے کا ثواب دینا مقصود تھا۔
اور اگر یہ ظاہر ہو جائے کہ کسی نے نبی کریم پر ایمان لانے کا ارادہ کیا ہے تو اس کو
عذاب دیا جائے یعنی اس حکم میں انبیائے کرام کے ساتھ چونکہ ان کی امتیں بھی
داخل ہیں اس لیے امتوں میں سے جس شخص نے عدم ایمان کا عزم بھی کیا ہوگا، وہ
عذاب میں داخل ہوگا۔

اب اس بیان کے بعد سمجھنے میں کوئی مشکل نہ رہی کہ یہ حکم نبی کریم کے متعلق ہی
ہے۔ لہذا ایسا معنی کرتا جو عموم پر دلالت ہو جس سے مقصد واضح نہ ہو، یقیناً اس سے
بہتر وہی ترجمہ ہوگا جو تخصیص پر دلالت ہوگا اور مقصد کو واضح کرے گا۔ وَلَكِنَّ صِرَ
اٰی الرسول وهو محمد صلی اللہ علیہ وسلم

وَأَنْتُمْ أَذِلَّةٌ (پہلے)

تم کمزور تھے۔ (محمود الحسن)۔ حالانکہ تم اس وقت بہت کمزور تھے (مردکی)
حالانکہ تم پست تھے (عبد الماجد)۔ اور تھے ذلیل (شارفیع الدین)
تم بالکل بے سر سامان تھے۔ (اعلیٰ حضرت)۔ وَأَنْتُمْ أَذِلَّةٌ بَقَلَّةِ الْعَدَدِ
والسلاح (جلالین) تم تعداد اور ہتھیاروں کے لحاظ سے کم تھے یعنی بے سر سامان
تھے۔ وَأَنْتُمْ أَذِلَّةٌ بَقَلَّةِ الْعَدَدِ وَالسَّلَاحِ لَمْ تَدِينَا فِي مَدَائِلِ هَذِهِ الْآيَةِ
وَاللَّهِ الْعِزَّةُ وَلِلَّهِ الْمُنْتَبِهُ وَالْفَيْضَةُ الْعِزَّةُ وَالْعُزَّةُ وَالْعُزَّةُ بے سر سامان ہونے
سے یعنی قلتِ عدد اور ہتھیاروں کی قلت سے تفسیر کی گئی ہے تاکہ بظاہر قلت کا مفہوم
رب قدوس کے اس ارشاد کے منافی نہ ہو کہ اللہ اور اس کے رسول اور مومنوں کے
لیے عزت ہے اس لیے کہ ذلت کی نقیض عزت، قوت، غلبہ ہے لیکن یہاں تو
معنی تعداد کی کمی اور ہتھیاروں کی کمی مراد ہے: رَوَى أَنَّ الْمُسْلِمِينَ كَانُوا

ثَلَاثًا وَثَلَاثَةً عَشْرًا جَلَسَتْ وَسَبْعُونَ مِنَ الْمُهَاجِرِينَ وَبَقِيَّتُهُمْ
مِنَ الْأَنْصَارِ وَمَا كَانَ فِيهِمْ إِلَّا فَرَسٌ وَاحِدٌ وَالْكَفَّارُ قَرِيبٌ مِنَ الْفِ مَقَاتِلِ
وَمِنْهُمْ مَائَةٌ فَهِيَ مَعَ الْأَسْلِحَةِ الْكَثِيرَةِ۔

مسلمانوں کی کل تعداد تین سو تیرہ تھی پچھتر مہاجرین اور باقی انصار تھے۔ ان
کے پاس صرف ایک گھوڑا تھا جب کہ کافر ایک ہزار کے قریب تھے اور ان کے پاس
ایک سو گھوڑے اور کثیر ہتھیار موجود تھے۔ وَأَنْتُمْ أَذِلَّةٌ بَقَلَّةِ الْعَدَدِ (مدارک)
”تم قلیل تعداد میں تھے“ اب اس وضاحت کے بعد علحضرت کے ترجمہ پر نظر کی جائے
کہ آپ کا ترجمہ کس طرح شانِ صحابہ کے مطابق ہے لیکن اس کے برخلاف دوسرے
تراجم کو دیکھیں۔ تم ذلیل تھے۔ تم بہت پست تھے۔ کتنے شانِ صحابہ کرام کے خلاف تراجم
ہیں۔ اور تم بہت کمزور تھے۔ یہ ترجمہ بھی مقصد کو واضح کرنے میں ناکام ہے کیونکہ تم بہت
کمزور تھے، اس کا مقصد یہ بھی ہو سکتا ہے، تم جسمانی طور پر کمزور تھے۔ العیاذ باللہ!
تم ایمانی طور پر کمزور تھے، اسی لیے علحضرت کا ترجمہ حقیقت کو سمجھانے میں اوصحابہ
کرام کی شان کو ثابت کرنے میں ایک منفرد حیثیت رکھتا ہے۔

وَلْيَعْلَمْ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا (پہلے)

اور اس لیے کہ معلوم کرے اللہ جن کو ایمان ہے۔ (محمود الحسن)۔
تاکہ اللہ ایمان والوں کو جان لے۔ (عبد الماجد)۔
تاکہ اللہ تعالیٰ ایمان والوں کو جان لیویں۔ (اشرف علی)۔
اور اس واسطے کہ معلوم کرے جن کو ایمان ہے۔ (شاہ عبدالقادر)۔
اور اس لیے کہ اللہ پہچان کرادے ایمان والوں کی۔ (اعلیٰ حضرت)۔
جنگِ احد کا ذکر ہو رہا تھا کہ اے مسلمانو! اگر تمہیں احادیث کوئی تکلیف پہنچی
تو کفار کو بدر میں اسی طرح تکلیف پہنچ چکی۔ یہ دن لوگوں کے درمیان ہم بدلتے رہتے
ہیں۔ اس کے بعد ذکر ہے: وَلْيَعْلَمْ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا۔ اس پر جلالین نے علم

ظہور سے تفسیر کی۔ اس پر حاشیہ یہ ہے:۔ علم ظہور ای علوی جو د
ای علمنا متعلق بالوجود الخارجی
یعنی یہاں علم کا تعلق وجود خارجی سے ہے جس کو اللہ تعالیٰ پہلے ہی جانتا
ہے اس کو خارج میں ظاہر فرمائے: والعلم فیہ بحال من التمییز من
باب لطلاق اسم السبب علی السبب ای لیمیز التامیز علی ایمان من غیرہم روح المعانی
یہاں علم کا مجازی معنی جُدا کرنا، تمیز پیدا کرنا۔ یعنی سبب کا نام سبب پر اطلاق ہے
(مجاز مرسل ہے) یعنی معنی یہ ہوا کہ ایمان پر ثابت رہنے والوں کو ان کے غیروں سے
ممتاز کر دے۔ اب اس تفسیر روح المعانی کی تفسیر کے مطابق اعلیٰ حضرت کے ترجمہ پر غور کریں
اللہ پہچان کرادے ایمان والوں کی کہ یہ نفس ترجمہ ہے جس میں کوئی سطحی ذہن والا
بھی وہم و گمان نہیں کر سکتا کہ شاید اللہ تعالیٰ نے معاذ اللہ ان کو آزمائش میں ڈال کر
جانا، پہلے علم نہیں تھا۔

وَلَمَّا يَعْلَمِ اللَّهُ الَّذِينَ جَاهَدُوا مِنْكُمْ وَيَعْلَمِ الصَّابِرِينَ (پ ۳۴)
ابھی اللہ نے تم میں سے ان لوگوں کو جاننا ہی نہیں جنہوں نے جہاد کیا اور نہ صبر
کرنے والوں کو جاننا۔ (عبد الماجد)
حالانکہ ابھی اللہ نے یہ تو دیکھا ہی نہیں کہ تم میں کون وہ لوگ ہیں جو اس کی را
میں جانی لڑنے والے اور اس کی خاطر صبر کر رہے ہیں۔ (مودودی)
حالانکہ ابھی خدا نے تم میں سے جہاد کرنے والوں کو تو ابھی طرح معلوم نہیں
کیا کہ اور یہ بھی مقصود ہے کہ وہ ثابت قدم رہنے والوں کو معلوم کرے (فتح محمد)
اور ابھی تک معلوم نہیں کیا کہ اللہ نے جو لڑنے والے ہیں تم میں اور معلوم نہیں
کیا ثابت رہنے والوں کو۔ (محمود الحسن)
اور ابھی معلوم نہیں کیا کہ اللہ نے جو لڑنے والے ہیں تم میں اور معلوم کرے ثابت
رہنے والے۔ (شاہ عبد القادر)

اور ابھی اللہ نے تمہارے غازیوں کا امتحان نہ لیا اور نہ صبر کرنے والوں
کی آزمائش کی۔ (اعلیٰ حضرت)۔

اس مقام پر اعلیٰ حضرت کے ترجمہ سے مفسرین کی بحث بآسانی سمجھ میں آتی ہے کہ
یہاں اللہ کے علم کی کیسے نفی ہے۔ یہ تو ممکن نہیں کہ کہا جائے ابھی تک اللہ نے
معلوم نہیں کیا: ای ولما تجاہدوا لأن العلم متعلق بالمعلوم فتدل نفی
العلم بمنزلة نفی متعلق لانه منتف باشتقائه تقول ما علم الله في
فلان خیر ای ما فیہ خیر حتی یعلمہ (مدارک) یعنی یہاں مقصد نفی جہاد ہے
نفی علم نہیں اس لیے کہ علم کا تعلق معلوم سے ہے نفی معلوم کی جگہ نفی علم کو رکھا گیا
ہے۔ کیونکہ معلوم کے انتفاء سے علم کا انتفاء ہوتا ہے جیسے تم کہو ما علم الله في
فلان خیر اس کا یہ معنی نہیں کہ اللہ نے فلاں میں خیر کو جاننا نہیں بلکہ اس کا معنی یہ ہے
کہ فلاں میں خیر ہے ہی نہیں جو اللہ کے علم میں آئے مقصود بھی یہی ہے کیونکہ ما قبل
آرہ ہے کیا تم گمان کرتے ہو کہ تم جنت میں داخل ہو جاؤ گے۔ ابھی تو اللہ نے تمہیں جہاد
میں آزمایا بھی نہیں اور نہ صبر کرنے والوں کی آزمائش کی۔ فان جاء الاجر من غیر
عمل من یعلم انه منوط به مستبعد عند المعقول۔ ولما ثقیل تنجوا المصا
ولم تسلكها سالکها۔ ان السفینة لا تجری علی الییس۔ وسمو من شہر من
حوشب طلب الجنة من غیر عمل ذنب من الذنوب وانتظار الشفاعة
بلا سبب نوع من الغرور وانتحاء الرحمة ممن لا یطاع حمق
وجہالۃ (روح المعانی) اجر کی امید بغیر عمل کے جانتے
ہوئے کہ اس کا دار و مدار بھی اسی پر ہے یہ عقل سے بعید ہے۔ اسی وجہ سے یہ کہا
گیا۔ نجات کی امید اس راہ پر چلنے کے بغیر کشتی کو خشکی پر چلانے کے مترادف ہے۔
شہر کن حوشب کہتے ہیں۔ بغیر عمل کے طلب جنت گناہ ہے۔ انتظار شفاعت بلا سبب
دھوکا میں مبتلا ہونا۔ رحمت کی امید بغیر اطاعت کے جہالت و بے وقوفی ہے۔
اس تقریر سے واضح ہوا کہ یہاں نفی آزمائش جہاد و صبر ہے نہ کہ نفی علم:

نفی اللہ ہم لازم نفی الملزم و کثیرا ما یقال ما علما مثله تعالیٰ فی خلون
خیرا و یزاد ما فیہ خیر حتی یعلمہ (روح المعانی) اس عبارت کا مفہوم وہی
ہے جو پہلے مدارک کے حوالہ سے گزر چکا ہے۔ ام سبب ان تدخلوا الجنة والحال
انہم یتحقق منہم الجہاد والصبور (روح المعانی) یہاں بھی نفی بہا
وصبر ہے نہ کہ نفی علم۔

اَفَاِنَّ مَاتَ اَوْ قُتِلَ (پ ۱۰)

پھر اگر وہ مر گیا یا مارا گیا۔ (محمود الحسن)۔
پھر کیا وہ اگر مر جائیں یا قتل کر دیے جائیں۔ (مودودی)۔
سو اگر یہ وفات پا جائیں یا قتل ہو جائیں۔ (عبد الماجد)۔
پھر کیا اگر وہ مر گیا یا مارا گیا۔ (شاہ عبد القادر)۔
بھلا اگر یہ مر جائیں یا مارے جائیں (فتح محمد)۔

تو کیا اگر وہ انتقال فرمائیں یا شہید ہوں۔ (اعلیٰ حضرت)
نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق ذکر کیا جا رہا ہے جنگ احد میں جب شیطان
نے نبی کریم کے شہید ہو جانے کی افواہ پھیلا دی صحابہ بہت زیادہ پریشان ہو گئے
اس وقت رب تعالیٰ نے فرمایا کہ آپ سے پہلے بھی انبیاء کرام کا انتقال ہو چکا ہے
تو کیا اگر آپ کا انتقال ہو جائے یا شہید ہو جائیں تو تم دین سے روگردانی کر جاؤ گے
اب توجہ طلب بات یہ ہے کہ کون سا معنی نبی کریم کی شان کے لائق ہے۔ ادب و
احترام پر دل ہے جس میں شہید ہونے کا ذکر ہے یا مارا جانا، قتل ہو جانے کا ذکر ہے
تو یقیناً یہ ترجمہ بہتر ہے۔ یہ اہل دانش پر مخفی نہیں۔

بَعْضِ مَا كَسَبُوا (پ ۱۱)

ان کے گناہ کی شامت سے۔ (محمود الحسن)۔

ان کے بعض کرتوتوں کے سبب (عبد الماجد)۔
کچھ ان کے گناہ کی شامت سے۔ (شاہ عبد القادر)۔
ان کے بعض اعمال کے باعث (اعلیٰ حضرت)۔

جنگ احد میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک درہ میں صحابہ کرام کی جماعت کو کھڑا
کیا کہ تم نے یہاں ہی کھڑے رہنا ہے۔ جب صحابہ کرام کو فتح حاصل ہوئی تو وہ جماعت
بھی اس جگہ کو چھوڑ کر مال غنیمت کے اجتماع میں دوسرے صحابہ کرام کے ساتھ شریک
ہو گئے۔ یہ صحابہ کرام کی اجتہادی خطا تھی۔ ان کا خیال یہ تھا کہ شاید فتح تک بٹھرنے کا
ہمیں حکم دیا گیا۔ نبی کریم کی اجازت کا انتظار نہ کرنے کی وجہ سے آزمائش میں آ گئے۔
اسی درہ سے کفار نے حملہ کر دیا صحابہ کرام کو تکلیف پہنچائی۔ اسی درہ کو چھوڑنے کا ذکر
رب نے فرمایا کہ ان کے بعض اعمال کی وجہ سے شیطان نے انہیں بھسلا دیا۔ پھر بیشک
اللہ تعالیٰ نے انہیں معاف فرمایا۔ اسی مقصد کو اعلیٰ حضرت نے صحابہ کرام کے ادب کا
محافظ کرتے ہوئے، ان کے بعض اعمال کے باعث، ترجمہ کیا۔ ان کے بعض اعمال کی
شامت سے۔ ایسا ترجمہ نہیں کیا جس میں گناہ کی نسبت صراحت صحابہ کرام کی طرف ہو لطف
کی بات یہ ہے کہ اعلیٰ حضرت کے ترجمہ پر اعتراض کرنا کہ ”اے محبوب“ کس عربی لفظ کا ترجمہ ہے
اس پر گناہ کس عربی لفظ کا ترجمہ ہے۔

وَلْيَعْلَمِ الْمُؤْمِنِينَ وَلْيَعْلَمِ الَّذِينَ نَافَقُوا (پ ۱۲)

یہ مقصود تھا کہ خدا مومنوں کو اچھی طرح معلوم کرے اور منافقوں کو بھی معلوم
کر لے۔ (فتح محمد)۔

اور اس واسطے کہ معلوم کرے ایمان والوں کو اور تاکہ معلوم کرے ان کو جو
منافق تھے۔ (محمود الحسن)۔

تاکہ اللہ دیکھ لے تم میں سے مومن کون ہیں اور منافق کون (مودودی)
تاکہ اللہ مومنین کو جان لے اور ان لوگوں کو بھی جنہوں نے منافقت کی۔
(عبد الماجد)

اور اس واسطے کہ معلوم کرے ایمان والوں کو اور معلوم کرے جو منافق تھے۔

(شاہ عبدالقادر)

اس لیے کہ پہچان کرانے ایمان والوں کی اور اس لیے کہ پہچان کرانے جو منافق ہوئے۔ (اعلیٰ حضرت)۔

اس مقام پر بھی اللہ تعالیٰ کی شان کو مد نظر رکھتے ہوئے اعلیٰ حضرت کا ترجمہ ہی مناسب ترین ہے جو اوہام باطلہ کو رد کرتا ہے ورنہ وہم ہو سکتا ہے کہ اللہ کا علم اس واقع کے بعد حاصل ہوا حالانکہ ایسا وہم کرتا ایمان کو ضائع کرنا ہے کیونکہ رب تعالیٰ کے اس ارشاد سے پہلے جو آرہا ہے اس کا مفہوم یہ ہے: ”جو بھی تمہیں (احد) میں تکلیف پہنچی وہ اللہ کے ارادہ ہی سے ہے تاکہ مومنوں اور منافقوں کی پہچان کرادے:

والمواد لیظہم للناس ویثبت لدیہم ایمان المؤمن (روح المعانی) مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ لوگوں پر ظاہر کرے مومنوں کے ایمان اور منافقوں کے نفاق کو۔ اعلیٰ حضرت کے ترجمہ اور روح المعانی کی تفسیر میں مطابقت ہے۔ لوگوں پر ظاہر کرے یا پہچان کرانے ایک مفہوم کو شامل ہے لیکن معلوم یا جانے اس قسم کے الفاظ سے غلط مفہوم لینا یقینی ہو جاتا ہے

لَا یَعْرِضُ لَكَ تَقَلُّبُ الَّذِينَ كَفَرُوا فِي الْبِلَادِ (پہ ۱۱)

تجھ کو دھوکا نہ دے کافروں کا شہروں میں۔ (محمود الحسن)۔

نزدیک میں ڈالے تجھ کو پھر نالوں لوگوں کا کہ کافر ہوتے بیچ شہروں کے۔ (شاہ رفیع الدین)۔

(اے پیغمبر) کافروں کا شہروں میں چلنا پھرنا تمہیں دھوکا نہ دے۔ (فتح محمد)

تو نہ بہک اس پر کہ آتے جلتے ہیں کافر شہروں میں (شاہ عبدالقادر)

اے نبی دنیا کے ملکوں میں خدا کے نافرمان لوگوں کی چلت پھرت تمہیں کسی دھوکا

میں نہ ڈالے۔ (مودودی)

یہ کافروں کا شہروں میں چلنا پھرنا کہیں تجھے دھوکے میں نہ ڈال دے عیال ماجد۔
اے سننے والے کافروں کا شہروں میں اہل گمراہی پھرنا ہرگز تجھے دھوکا نہ دے۔
(اعلیٰ حضرت)۔

یہ عام مخاطب کو خطاب ہے کہ کافروں کا شہروں میں گھومنا پھرنا تجارت کرنا مال حاصل کرنا انہیں دھوکے میں نہ ڈالے۔ دنیا کا سامان تھوڑا ہے پھر ان کا ٹھکانا جہنم ہے۔ اس مقام پر اعلیٰ حضرت کے ترجمہ سے یہ بات واضح ہے کہ اس خطاب کے مخاطب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نہیں بلکہ آپ کی امت ہے لیکن دیگر تراجم میں اے سننے والے کے الفاظ زائد نہیں۔ لہذا بظاہر ہی معلوم ہوتا ہے کہ یہ خطاب نبی کریم کو ہے حالانکہ یہ درست نہیں اور مولانا مودودی صاحب اور مولانا فتح محمد صاحب نے تو صراحتہ نبی کریم کی حراف نسبت کر دی جو تغاسیر سے لاعلمی کی علامت ہے: والخطاب

لکل احد والنبی صلی اللہ علیہ وسلم والمراد به غیر لان قدوة القوم ومقدمهم
یخاطب بشئ فیقوم خطابه مقام خطابه جمیعاً فکانہ قبیل لا یغض نکر

ولان الرسول علیہ السلام کان غیر مفروض بحالہ
(مدارک) ہر آدمی کو خطاب ہے یعنی اے سننے والے۔ یا خطاب تو نبی کریم کو ہے لیکن مراد آپ خود نہیں بلکہ آپ کے پیروں اس لیے کہ آپ قوم کے پیشوا و مقتدا ہیں لہذا مقتدا کو خطاب تمام کو خطاب ہے گویا یہ کہا گیا ہے تمہیں دھوکا نہ دے کیونکہ نبی کریم کو کفار کا تجارت کرنا اور مال و دولت دھوکا نہیں دے سکتا الخطاب للنبی

صلی اللہ علیہ وسلم والمراد منہ امتہ وکثیر ما یخاطب سید القوم بشئ
ویراد اتباعہ فیقوم اتباعہ مقام خطابه (روح المعانی) نبی کریم صلی

اللہ علیہ وسلم کو خطاب ہے اور مراد آپ کی امت ہے۔ اکثر طور پر قوم کے ہر دار کو

خطاب کیا جاتا ہے اور مراد اس کے متبعین ہوتے ہیں۔ لہذا یہی مناسب ہو گا جس سے

یہ سمجھا جاسکے کہ یہ خطاب نبی کریم کی امت کو ہے۔ اگر یہ ترجمہ کیا جائے اے سننے والے

تجھ کو دھوکا نہ دے پھر یہ واضح ہو سکتا ہے۔ لیکن اگر یہ ترجمہ کیا جائے ”تجھ کو دھوکا نہ دے

تو اس سے یہ مقصد تو واضح نہیں ہوتا البتہ لوگوں کو گمراہ کرنا اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی شان کو سمجھنے سے برگشتہ کرنا آسان ہے۔

إِنَّمَا التَّوْبَةُ عَلَى اللَّهِ (پہ)

توبہ قبول کرنی اللہ کو ضرور۔ (محمود الحسن)۔

اللہ پر توبہ کی قبولیت کا حق ہے (مودودی)۔

توبہ جس کا قبول کرنا اللہ کے ذمہ ہے۔ (عبد الماجد)

توبہ جس کا قبول کرنا اللہ تعالیٰ کے ذمہ ہے۔ (اشرف علی)

توبہ قبول کرنی اللہ کو ضرور۔ (شاہ عبدالقادر)۔

وہ توبہ جس کا قبول کرنا اللہ نے اپنے فضل سے لازم کر لیا۔ (علی حضرت)۔

علی حضرت کا ترجمہ تفاسیر کے مطابق ہے۔ ایسا ترجمہ جو وہم کا ازالہ بھی کر رہا ہے وہ وہم یہ ہوتا ہے کہ اللہ پر کوئی چیز لازم نہیں تو کیسے توبہ قبول کرنی اللہ کو ضرور۔ یہ ترجمہ صحیح ہوا جب کہ کسی چیز کو ضرور کرنا وجوب کے مترادف ہے۔ اللہ پر کوئی چیز واجب نہیں، اسی وہم کا ازالہ جلالین میں کیا گیا۔ اسی کے مطابق علی حضرت کا ترجمہ ہے: إِنَّمَا التَّوْبَةُ عَلَى اللَّهِ أَيُّ التَّوْبَةِ كَتَبَ عَلَى نَفْسِهِ قَبُولَهَا بِفَضْلِهِ وَهِيَ تَوْبَةُ

جس کو اللہ نے اپنے فضل سے لازم کر لیا، وَلَيْسَ الْمَسْلُوبُ بِهِ الْوَجُوبُ

اذا لا يجب على الله شيء ولكنه تأكيد للوعد ليعرف انه يكون له محالة كالوعد الذي لا يتحقق (مدارك) اور اس سے مراد وجوب نہیں جب کہ اللہ تعالیٰ پر کوئی چیز لازم نہیں لیکن البتہ وعدہ کی تاکید ہے یعنی اللہ تعالیٰ اپنے وعدہ کو پورا فرماتا ہے جب وہ اپنے وعدہ کا تخلف نہیں فرماتا توبہ واجب کی طرح ہو جس کو چھوڑا نہیں جاسکتا۔ یہ معنی ہی مقصد کے مطابق ہے کہ وہ اپنے فضل سے اپنے آپ پر توبہ کو لازم کیے ہوئے ہے ورنہ حقیقتہً اس پر کچھ لازم نہیں۔ لہذا توبہ کو ضرور قبول کرنا لازم پر دال ہے اور لزوم سے اللہ تعالیٰ پاک ہے۔

فَلَوْ أَنَّهُمْ إِذْ ظَلَمُوا أَنْفُسَهُمْ جَاءُوكَ (پہ)

کاش کہ جس وقت اپنی جانوں پر زیادتی کر بیٹھے تھے آپ کے پاس آجاتے پھر اللہ سے مغفرت چاہتے اور رسول بھی ان کے حق میں مغفرت چاہتے تو یہ ضرور اللہ کو توبہ قبول کرنے والا مہربان پالتے۔ (عبد الماجد)۔

اگر انھوں نے یہ طریقہ اختیار کیا ہوتا کہ جب یہ اپنے نفس پر ظلم کر بیٹھے تھے تو تھکے پاس آجاتے اور اللہ سے معافی مانگتے اور رسول بھی ان کے لیے معافی کی درخواست کرتا تو یقیناً اللہ کو بخشنے والا اور رحم کرنے والا پالتے (مودودی)۔

اگر وہ لوگ جس وقت انھوں نے اپنا برا کیا تھا آتے تیرے پاس اللہ سے معافی چاہتے اور رسول بھی ان کو بخشواتا تو البتہ اللہ کو پالتے معاف کر دیتا مہربان (محمود الحسن) اور اگر جس وقت وہ اپنا نقصان کر بیٹھے تھے اس وقت آپ کی خدمت میں حاضر ہو جاتے تو پھر اللہ تعالیٰ سے معافی چاہتے اور رسول بھی ان کے لیے اللہ تعالیٰ سے معافی چاہتے تو ضرور اللہ تعالیٰ کو توبہ قبول کرنے والا اور رحمت کرنے والا پالتے۔ (اشرف علی)

اور اگر جب وہ اپنی جانوں پر ظلم کریں تو اے محبوب تمہارے حضور حاضر ہوں اور پھر اللہ سے معافی چاہیں اور رسول ان کی شفاعت فرمائیں تو ضرور اللہ کو بہت توبہ قبول کرنے والا مہربان پائیں۔ (علی حضرت)

ان تراجم میں پہلا فرق توبہ ہے کہ ”آتے تیرے پاس“ اور اسی طرح یہ الفاظ رسول بھی ان کو بخشواتا، ان الفاظ کو اردو محاورہ کے مطابق دیکھیں۔ پھر ان کے مقابل ”اے محبوب تیرے حضور حاضر ہوں“ اسی طرح یہ الفاظ رسول ان کی شفاعت فرماتے۔ اس ترجمہ کو بھی اردو محاورہ کے مطابق دیکھیں، یہ سمجھنے میں کوئی مشکل درپیش نہیں آئے گی کہ کون سا ترجمہ ادب و احترام کے مطابق ہے یا کون سا نہیں۔

دوسری وجہ فرق یہ ہے کہ اٹھتے کے ترجمہ سے یہ پتا چلتا ہے کہ یہ حکم عام ہے۔
نبی کریم کی ظاہری حیات میں بھی یہ حکم تھا اور اب بعد از وصال بھی حکم یہ ہی ہے۔ لیکن دوسرے
ترجمہ سے یہ سمجھا جاتا ہے کہ یہ حکم آپ کی ظاہری حیات سے متعلق تھا۔ حالانکہ یہ درست
نہیں زیادہ طور پر وہ اس دلیل پر انحصار کرتے ہیں لا تشدد الرجال الا الى ثلاث
مساجد مسجد الحرام والمسجد الاقصیٰ ومسجدی نبی کریم صلی اللہ علیہ
وسلم نے تین مساجد کے بغیر کہیں اور رختِ سفر باندھنے سے روکا ہے۔ وہ تین مسجدیں مسجد
حرام، مسجد اقصیٰ اور مسجد نبوی ہے۔ اس حدیث پاک سے دلیل یہ پیش کی جاسکتی ہے کہ یہاں
سے ثابت ہوا کہ زیارتِ قبورِ صالحین بھی منع ہے حالانکہ یہ اسناد لال صحیح نہیں کیونکہ
اس حدیث کے ماتحت مسلم شریف کی شرح میں علامہ نووی نے فرمایا: والصحيح عند
اصحابنا وهو الذي اختاره امام الحرمين والمحققون انه لا يحرم ولا يكره
ہماتے نزدیک صحیح یہ ہے جس کو امام الحرمین اور محققین حضرات نے بھی پسند کیا ہے کہ یہ
نہ حرام ہے اور نہ مکروہ ہے۔ اسی طرح مرقاة شرح مشکوٰۃ میں بھی ہے: في الشرح
المسلم للنووي قال ابو محمد يحرم شد الرجال الى غير الثلاثة وهو غلط وفي الاخبار
ذهب بعض العلماء الى الاشدلال على المنع من الرحلة لزيادة المشاهدة وقبور
العلماء والمصلحين وما تبين لي ان الامر ليس كذلك بل الزيادة مأمور
بها لخير الاقربى وها انما ورد فيها عن الشد بخير الثلاثة من المسجد
لما ظنوا ان المشاهدة تساوي بل ببركة زيارتها على قدر درجاتهم
عند الله هل يمنع ذلك القائل عن شد الرجال بقبور الانبياء
كاسرائيل وموسى ويحيى والمنع من ذلك في غايته الاحالة
والاولى ان في معناه فلا يبعد ان يكون ذلك من اغراض الرحلة
كما ان في زيادة العلماء في الحيلة يعنى علامہ نووی نے ایک قول ابو محمد کا تین
مساجد کے بغیر سفر کرنا حرام ہے نقل کر کے اس پر خود کہا کہ یہ غلط ہے۔ احبار العلوم میں بھی
ہے کہ بعض علماء نے تبرک مقامات اور علماء و صالحین کی قبور کی طرف زیارت کے لیے سفر کرنے

کو منع کیا ہے لیکن یہاں بھی علامہ غزالی نے خود ہی بیان کیا ہے۔ مجھے جو پتا چلتا ہے وہ یہ
ہے کہ اس طرح صحیح نہیں کیونکہ قبور کی زیارت کرنا تو خود حدیث پاک سے ثابت ہے کہ نبی کریم
نے فرمایا لا تغتسلوا عن قبري ولا قبري من قبوري ولا قبري من قبوري۔ لیکن یہاں بھی مطلب یہ ہے
کہ تمام مساجد برابر ہیں۔ اگر کسی مسجد کی طرف زیادتی ثواب کی غرض سے جاتا ہے تو ان
تین مساجد کی طرف جائے کسی اور کی طرف نہ جائے۔ اس تحقیق پر لا تشدد الرجال
للمسجد الا الى ثلاث الخ معنی ہوگا یعنی تم مساجد کی طرف زیادتی ثواب کی غرض سے سوائے
ان تین کے نہ جاؤ۔ پھر فرماتے ہیں کہ یہ حکم تبرک مقامات کا نہیں بلکہ ان کی زیارت میں حرج
ورجاء تبرک ہے۔ اسی طرح انبیائے کرام جیسے ابراہیم، موسیٰ اور یحییٰ علیہم السلام کی قبور کی
زیارت سے منع کرنا بہت ناممکن ہے۔ اولیائے کرام کا بھی یہی حکم ہے جس طرح علماء کی
زندگی میں ان کی طرف جانا کسی نہ کسی مقصد پر مشتمل ہوتا ہے اسی طرح اولیائے کرام کی قبور کی زیارت
کرنے میں بھی کوئی غرض ہو سکتی ہے۔

اب اس بیان کے بعد بخوبی واضح ہوگا جب ابراہیم علیہ السلام، انبیائے کرام اور اولیائے
عظام کی قبور کی زیارت باعثِ برکت ہے تو سید الانبیاء علیہ الصلوٰۃ والسلام کے مزار پر انوار کی
زیارت بھی باعثِ شفاعت ہے نبی کریم کے مزار پر انوار پر شفاعت کی غرض سے حاضر
ہو کر التجا کرنا اور نبی کریم کا شفاعت کرنے کے بعد مغفرت کی خوشخبری دینا مدارک سے
ثابت ہے قیل جاء اعرابي بعد دفنه عليه السلام فرمى بنفسه على قبره وحنامت
نواب علی ساسہ وقال يا رسول الله قلت فسمعتك كان فيما اتيتك عليك
ولو انهم اذ ظلموا انفسهم الاية وقد ظلمت نفسي وجئتك استغفر الله ذنبي
واستغفر لي من ربي فنودي من قبره قد غفر لك (مدارک) نبی کریم صلی اللہ علیہ
وسلم کے دفن ہونے کے بعد ایک اعرابی آیا اور قبرِ اطهر سے لپٹ کر قبرِ نور کی خاک سر پر
ڈالتے ہوئے نہایت حالتِ زار سے عرض کر رہا ہے، یا رسول اللہ! میں نے اپنی جان پر
ظلم کیا۔ آپ نے اللہ کا نازل کردہ ارشاد فرمایا، ہم نے تمنا دلو انہم اذ ظلموا
انفسهم پوری آیت اعرابی نے تلاوت کرنے کے بعد عرض کیا یا رسول اللہ میں نے اپنی

جان پر ظلم کیا اور میں آپ کے پاس حاضر ہوا ہوں۔ میں خود تو اپنے رب سے اپنے گناہوں کی معافی طلب کر رہا ہوں آپ بھی رب سے میرے لیے استغفار (شفاعت) فرمائیں۔ قبرِ ظہر سے آواز آئی تھیں بخش دیا گیا۔ صاحبِ مدارک کے اس بیان سے پتا چلتا ہے کہ اعلیٰ حضرت کا ترجمہ ہی قابلِ تعریف ہے جس میں نبی کریم کا شفاعت کرنا آج بھی ایسے ہی ثابت ہے جیسے ظاہری حیات میں ثابت تھا۔

وَالْمُحَصَّنَاتُ مِنَ النِّسَاءِ الْأَمَّا مَلَكَتْ أَيْمَانُكُمْ (پ ۶)

اور یہاں ہی عورتوں میں سے مگر جن کے مالک ہوئے ہیں وہ اپنے ہاتھ نہ مارے۔

(شاہ رفیع الدین)

اور شوہر والی عورتیں بھی (تم پر حرام ہیں) مگر وہ جو اسیر ہو کر لونڈیوں کے طور پر رہیں قیضے میں آجائیں۔ (مولوی فتح محمد)

اور نکاح بندھی عورتیں مگر جن کو مالک ہو جائیں تمہارے ہاتھ۔ (شاہ عبدالقادر) اور وہ عورتیں جو کہ شوہر والیاں ہیں مگر جو کہ تمہاری مملوک ہو جائیں۔ (اشرف علی)۔ اور حرام ہیں شوہر والی عورتیں مگر کافروں کی عورتیں جو تمہاری ملک میں آجائیں۔ (اعلیٰ حضرت)

اس مقام ان عورتوں کا ذکر کیا جا رہا ہے جن سے تعلقات ازدواجی حرام ہیں اسی کے ضمن میں وَالْمُحَصَّنَاتُ مِنَ النِّسَاءِ کو ذکر کیا اور اس سے ماملکت ایما نکم کو مستثنیٰ کیا۔ مدارک میں اسی طرح ذکر کیا گیا ہے الْأَمَّا مَلَكَتْ أَيْمَانُكُمْ بِالْجَبْرِ وَنَوَاجِہِی دَاۤیِمًا الْحَرْبَ وَالْمَعْفٰی وَحَرَمٌ عَلَیْکُمْ نِكَاحُ الْمَسْكُو حَاتِی الْاَلَاۤفِی لِمَنْ اَزَاحَ الْأَمَّا مَلَكَتْ وَهَنْ بِسَبِیْہِہُنَّ وَاَخْرَاجَہُنَّ بَدُوۡنَ اَنْوَاجِہُنَّ لَوْ قَوَّعَ الْفَرْقَةُ بِنَبَاۤیِنَ الدَّارِیْنِ لَا بِالْجَبْرِ فَتَحُلُ الْغَنَائِمُ بِمَلَکِ الْیَمِیْنِ بَعْدَ الْاِسْتِیْسَاءِ یعنی الْأَمَّا مَلَكَتْ اِیْمَانُكُمْ سے مراد وہ عورتیں ہیں جن کو قید کر کے لایا جائے اور ان کے خاوند دارِ حرب میں رہ

جائیں ان میں دارِ حرب اور دارِ اسلام کے تباین کی وجہ سے فرقت واقع ہوگی صرف قید ہونے سے نہیں کیونکہ وہ وضعِ حمل کے بعد مالِ غنیمت کے طور پر ملکِ یمن کی وجہ سے حلال ہو جائیں گی۔ اعلیٰ حضرت کا ترجمہ اس فقہی ضابطہ کو واضح کر رہا ہے۔ جب کہ دوسرے تراجم وضاحتِ بیان سے قاصر ہیں۔ کیونکہ یہاں شوہر والی عورتوں کی حلت اور شوہر والی عورتوں کی حرمت کا بیان ہے۔ یعنی کافروں کی عورتیں جن کے خاوند دارِ حرب میں رہ گئے ہوں وہ تباینِ دارین کی وجہ سے مسلمانوں پر حلال ہو جائیں گی۔ دوسرے تراجم میں مطلقاً لونڈیوں کا ذکر ہے ان میں خاندوں والی ہوں یا نہ ہوں اس کا پتا نہیں چلتا۔

مَا أَصَابَكَ مِنْ حَسَنَةٍ فَمِنَ اللَّهِ (پ ۷)

جو پہنچے تم کو کوئی بھلائی سو اللہ کی طرف سے ہے اور جو پہنچے تم کو کوئی بُرائی سو تیرے نفس کی طرف سے۔ (محمود الحسن)۔ جو تجھ کو بھلائی پہنچے سو اللہ کی طرف سے اور جو تجھ کو بُرائی پہنچے سو تیرے نفس کی طرف سے۔ (شاہ عبدالقادر)۔ جو پہنچتی ہے تجھ کو بھلائی پس خدا کی طرف سے ہے اور جو پہنچتی ہے تجھ کو بُرائی پس جانِ تیری سے ہے۔ (شاہ رفیع الدین)۔ اے سننے والے! تجھے جو بھلائی پہنچے وہ اللہ کی طرف سے ہے اور جو بُرائی پہنچے وہ تیری اپنی طرف سے ہے۔ (اعلیٰ حضرت)۔

اس مقام پر اعلیٰ حضرت کے ترجمہ کے مطابق یہ ثابت ہے کہ یہاں خطابِ عام انسانوں کو ہے نبی کریم کو نہیں۔ اسی لیے آپ نے ”اے سننے والے“ الفاظ زیادہ کیے۔ لیکن دیگر تراجم میں بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ خطاب نبی کریم کو ہے، حالانکہ یہ درست نہیں: مَا أَصَابَكَ اِیْمَا الْاِنْسَانِ مِنْ حَسَنَةٍ خَیْرٌ فَمِنْ اِلٰہِ اَسْتَکْ فَضْلًا مِّنْ

وما اصابك من سيرة بليدة فمن نفسك انتك حيث انك تكتب ما
يستوجبها من الذنوب (جلالین) اے انسان جو تجھے بھلائی پہنچے
وہ اللہ کی طرف سے ہے اور جو تجھے مصیبت پہنچے وہ تیرے اپنے گناہوں کے ارتکاب
کی وجہ سے ہے۔ یا انسان خطابا عاماً قال النواجہ المخطاط النبوی
صلی اللہ علیہ وسلم والمراد علیہ (مدارک) اے انسان یعنی یہاں خطاب عام ہے۔ اور تہاج
نے کہا خطاب نبی کریم کو ہے لیکن آپ کے غیر مراد ہیں۔ مودودی عن قتادة عام لكل
من يقف عليه الا للنبی صلی اللہ علیہ وسلم (روح المعانی) یہ خطاب عام ہے
نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو نہیں حقیقت بھی یہ ہے کہ معاذ اللہ نبی کریم کی طرف گناہ کی
نسبت اور گناہ کی وجہ سے مصیبت کا آنا یہ ممکن نہیں۔ اسی وجہ سے تفاسیر میں خطاب
عام ہے یعنی ہر انسان۔ یہ مفہوم اسی وقت ادا ہوگا جب کہ ”اے سننے والے“ اے مخاطب
کے یا شدہ اس قسم کے الفاظ زیادہ کیے جائیں۔

أَنْ تَقْصُرَ وَامِنْ الصَّلَاةِ (پ ۱۱)

کہ کچھ کم کرو نماز میں سے۔ (مولانا محمد الحسن)۔

اگر نماز میں اختصار کر دو۔ (مودودی)۔

کہ نماز میں کمی کر دیا کرو۔ (عبد الماجد)۔

کہ تم نماز کو کم کر دو۔ (اشرف علی)۔

کہ کچھ کم کرو نماز میں سے۔ (شاہ عبدالقادر)۔

نماز کو کم کر کے پڑھو۔ (فتح محمد)۔

یہ کہ کوتاہ کر و تم نماز سے۔ (شاہ رفیع الدین)۔

کہ بعض نمازیں قصر سے پڑھو۔ (اعلیٰ حضرت)۔

یہاں مسافر کی نماز قصر کرنے کا ذکر ہے۔ مسافر نماز کو قصر نہیں کر سکتا کیونکہ
نمازیں تین قسم کی ہیں۔ ثنائی۔ ثلاثی۔ رباعی۔ ثنائی دو رکعت والی نماز جیسے فجر کی نماز

ثلاثی تین رکعت والی نماز جیسے مغرب۔ رباعی چار رکعت والی نماز جیسے عصر، عشاء۔
قصر صرف رباعی نماز ہوتی ہے ثنائی اور ثلاثی نہیں ہوتیں۔ اب اگر یہ ترجمہ ہو کہ ”کچھ کم
کر و نماز میں سے“ اس میں یہ وہم ہو سکتا ہے کہ شاید ہر نماز کو قصر کیا جاسکتا ہے۔
لیکن اگر یہ ترجمہ کیا جائے کہ ”بعض نمازیں قصر سے پڑھو“ تو یہ وہم نہیں ہو سکتا بلکہ
ترجمہ سے ہی واضح ہے کہ بعض نمازیں قصر ہوں گی بعض نہیں۔ یہ ہی تفاسیر کی رائے
بھی ہے: من اعداد سمکعات الصلوة فتصلی الرباعیۃ سمکعتین (مدارک)
یعنی تم پڑھو ان گناہ نہیں کہ نماز کی رکعات کی تعداد کم کرو یعنی تم چار رکعت والی نماز کو دو
رکعتیں پڑھو بان تروح و ہا من اربع الی اثنتین (جلالین) یعنی تم چار رکعت
والی نماز کو دو کی طرف لوٹاؤ۔ لہذا اس مقصد کو اعلیٰ حضرت کا ترجمہ بہت زیادہ واضح
کر رہا ہے جب کہ دوسری جگہ غلط مفہوم لیتا عین ممکن ہے۔ مولانا مودودی صاحب
کے ترجمہ میں اگر امر کی یہ صریح غلطی ہے کہ ان کا معنی اگر کیا حالانکہ یہ غلط ہے۔ ہاں
البتہ ان کا معنی اگر ہے۔ شاید ان کے دیکھنے میں غلطی ہو گئی ہو۔

إِنَّ الْمُنَافِقِينَ يُخَادِعُونَ اللَّهَ وَهُوَ خَادِعُهُمْ (پ ۱۲ آخری رکوع)

منافق (ان چالوں سے اپنے نزدیک) خدا کو دھوکا دیتے ہیں (یہ اس کو

کیا دھوکا دیں گے) وہ ان کو دھوکے میں ڈالنے والا ہے۔ (محمود الحسن)۔

یہ منافق اللہ کے ساتھ دھوکے بازی کرتے ہیں۔ حالانکہ درحقیقت اللہ

ہی نے انہیں دھوکا میں ڈال رکھا ہے۔ (مودودی)

اور منافق جو ہیں دغا بازی کرتے ہیں اللہ سے اور وہی ان کو دغا دے گا۔

(شاہ عبدالقادر)

تحقیق منافق فریب دیتے ہیں اللہ کو اور وہ فریب دینے والا ہے ان کو۔

(شاہ رفیع الدین)

بے شک منافق لوگ اپنے گمان میں اللہ کو فریب دیا جانتے ہیں اور وہی ان کو غافل

کر کے مارے گا۔ (اعلیٰ حضرت)۔

اللہ کو دھوکا، قریب دینا، اس سے دعا بازی کرنا ممکن نہیں۔ اسی طرح اللہ کسی کو دعا دے، قریب کرے یا دھوکا دے یہ بھی درست نہیں: (ای یفعلون ما یفعلون)
 انما یدعون فیظہرون الایمان ویضمنون نفیضہم (روح المعانی)
 یعنی وہ اپنے خیال میں قریب کاری کرتے ہیں جیسا کہ مکار، قریب کار، دعا باز کا کام ہوتا ہے کہ وہ ایمان کو ظاہر کرتے ہیں اور دل میں کفر رکھتے ہیں۔ وہ اپنے خیال میں قریب دیتے ہیں کیونکہ حقیقت میں اللہ تعالیٰ سے کسی چیز کو مخفی رکھنا ممکن نہیں:

وہو خادعہما ای فاعل بہم ما یفعل الغالب فی الخداع حبیب
 ترکہم فی الدنیا معصومی اللہ ما لا یدعی والاعمال والاعمال فی الاخوة
 اللہ لا یسفل من الدنیا (روح المعانی) اللہ تعالیٰ ان کو غافل کر کے مارے گا یعنی ان
 سے ایسا معاملہ کرے گا جو نجات دہکتے ہیں ہوتا ہے۔ کیونکہ دنیا میں ان کے جان اور مال
 مسلمانوں کے ہاتھوں سے محفوظ رہتے ہیں کہ ان سے کافروں کی طرح جنگ کر کے
 ان کے مال کو عنایت نہیں بنایا جاتا۔ انہیں قتل نہیں کیا جاتا لیکن قیامت میں ان
 کو سب سے زیادہ عذاب ہوگا جہنم کے سب سے نیچے درجہ میں رکھا جائے گا:

یأظہارہم خلاف ما یظہرون من الکفر لیدفعوا عنہم احکامہ الدنیویۃ (جلالین)
 وہ باطن میں کفر رکھتے تھے اور ظاہر ایمان دار تاکہ دنیا میں کافروں والے احکام ان
 سے دور رہیں۔ یہ بھی وہ اپنے گمان میں ایسا کرتے تھے ورنہ حقیقتاً ایسا کرنا ممکن
 نہیں تھا کیونکہ اللہ تعالیٰ سے کسی چیز کو چھپانا ممکن نہیں وہو خادعہما
 مجاہدین علی خداعہم (جلالین) وہ ان کو خداع کی ہر ادے گا۔ تفسیر کے بیان سے
 یہ مخفی نہ رہے کہ اللہ تعالیٰ کو دھوکا دیتے ہیں یا اللہ دھوکا دیتا ہے۔ یہ تراجم صریح
 غلطی پر مبنی ہیں اور تفسیر سے مکمل لاعلمی کی علامت ہے۔

فَکُلُوا مِنَّمَا أَمْسَکَ عَلَیْکُمْ (پہلے)

سو کھاؤ اس میں سے جو پکڑ رکھیں تمہارے واسطے (محمد الحسن)

وہ جس جانور کو تمہارے لیے پکڑیں اس کو بھی تم کھا سکتے ہو۔ (مودودی)۔

سو کھاؤ اس میں سے جو پکڑ رکھیں تمہارے واسطے (شاہ عبدالقادر)۔

سو کھاؤ اس (شکار) کو جسے (شکاری جانور تمہارے لیے پکڑ رکھیں)۔ (عبدالماجد)

تو جو شکار وہ تمہارے لیے پکڑ رکھیں اس کو کھا لیا کرو۔ (فتح محمد)

پس کھاؤ اس چیز سے جو پکڑ رکھیں اُوپر تمہارے (شاہ رفیع الدین)

تو ایسے شکاری جانور جس شکار کو تمہارے لیے پکڑیں اس کو کھاؤ (اشرف علی)

تو کھاؤ اس میں سے جو مار کر تمہارے لیے رہنے دیں۔ (اعلیٰ حضرت)۔

یہاں شکاری جانوروں جیسے کتا اور درندے وغیرہ شکاری پرندے ان کا ذکر کیا جا
 رہا ہے کہ جو جانور سکھائے جائیں وہ سیکھ جائیں ان کو شکار پر چھوڑتے وقت بسم اللہ پڑھ کر
 چھوڑ دیا۔ اگر ان کے شکار کرنے میں کوئی جانور مر بھی جائے ذبح نہ کیا جائے پھر بھی حلال ہے
 یہ مقصد صرف اس سے کہ پکڑ رکھیں تمہارے واسطے حاصل نہیں جیسا اعلیٰ حضرت کے ترجمے سے
 واضح ہے: وان قتلتمہا لعلی کلن منہ بخلاف غیر المعلمۃ فلا یحل صیدھا

وعلامتھا ان تسترسل اذا اسسلت وتنزجرا ذان حریۃ وتمسک
 الصید ولا تاكل منہ واول ما یعرف بہ ذلک ثلاث مرات فان اكلت

منہ فلا یس مما اسسک علی صاحبھا فلا یحل اکلہ (جلالین) یعنی شکاری جانور دوسرے کو

قتل کر دے اور خود اس سے نہ کھائے۔ وہ سیکھا ہوا جانور ہے بخلاف اس کے جو سیکھا ہوا

نہیں ہے اس کا شکار کھانا حلال نہیں۔ وہ علامات جن سے پتا چل جائے کہ یہ جانور سیکھا

ہوا ہے اور یہ نہیں وہ یہ ہیں کہ جانور کو جب شکار کے لیے چھوڑا جائے وہ شکار کی طرف

چلا جائے جب روکا جائے وہ رک جائے اور جو شکار کرے اسی طرح رہنے دے خود اس

سے نہ کھائے۔ یہ کم از کم تین مرتبہ اس کی آزمائش کی جائے۔ اگر تین مرتبہ ان شرائط پر پورا

اُترے تو سمجھا جائے کہ اب یہ سیکھ گیا ہے۔ اگر خود جانور نے اس سے کھا لیا اور مالک کے

لیے اسے نہ رکھا تو سمجھیں کہ ابھی وہ نہیں سیکھا لہذا اس سے نہ کھایا جائے لیکن یہ حکم

اسی جانور کا ہے جو شکار کے حال میں مر گیا لیکن اگر اسے زندہ پالیا اور ذبح کر لیا اس۔

کے لیے شکاری یا لور کا یہ سیکھا ہوا ہونا یا نہ ہونا کوئی شرط نہیں۔ لہذا اس کا تمھارے لیے پکڑ رکھنا زندہ کو بھی شامل ہے جو یہاں مراد ہی نہیں لیکن بخلاف اس کے اٹھنے کا ترجمہ اسی مقصد کو ظاہر کرتا ہے جو مراد ہے جو مار کر تمھارے لیے رہنے دیں اسے کھاؤ یہی مراد ہے۔ اس مفتی باریکی سے دوسرے حضرات بے خبر رہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا قُمْتُمْ إِلَى الصَّلَاةِ (پ ۶)

اے ایمان والو جب تم اٹھو نماز کو (مولانا محمود الحسن)۔
اے لوگو جو ایمان لائے ہو جب تم نماز کے لیے اٹھو۔ (مودودی)
اے ایمان والو جب تم نماز کو اٹھو (عبد الماجد)
اے ایمان والو جب تم اٹھو نماز کو (شاہ عبدالقادر)۔
اے لوگو جو ایمان لائے ہو جب کھڑے ہو تم واسطے نماز کے (شاہ رفیع الدین)
اے ایمان والو جب نماز کو کھڑا ہونا چاہو۔ (اعلیٰ حضرت)۔
اس آیت میں وضو کرنے کا حکم دیا جا رہا ہے کہ جب تم نماز میں کھڑے ہونے کا ارادہ کرو تو وضو کرو کیونکہ نماز میں کھڑے ہو کر تو وضو نہیں کیا جائے گا۔ یہ مقصد اسی وقت سامنے آئے گا جب ترجمہ کیا جائے گا۔ جب نماز کو کھڑا ہونا چاہو۔ لیکن اگر یہ ترجمہ کیا جائے جب تم اٹھو نماز کو اس سے یہ پتا چلتا ہے کہ نماز میں کھڑے ہو کر وضو کیا جائے گا۔ اسی وجہ کے پیش نظر مفسرین کرام نے بھی محذوف الفاظ کو نکالا ہے اذ قمتم ای اذ تم القيام الی الصلوٰۃ (جلالین) یعنی جب تم نماز میں کھڑے ہونے کا ارادہ کرو۔ ای اذ تم القيام الی الصلوٰۃ کقولہ فاذا قرأت القرآن ای اذا اردت ان تقر القرآن فحين عين ارادة الفعل بالفعل لان الفعل سبب عن الارادة فاقيم السبب مقام السبب للملايسقة بينهما طلبا للايجاز (مدارک) جب تم نماز میں کھڑے ہونے کا ارادہ کرو جس طرح دوسرے مقام پر فاذا قرأت القرآن وہاں بھی مراد ہے

کہ جب تم قرآن پڑھنے کا ارادہ کرو تو تھوڑا پڑھو۔ ارادہ فعل کو فعل سے اس لیے تعبیر کیا گیا ہے کیونکہ فعل مسبب ہے ارادہ سبب ہے۔ اختصار کے پیش نظر دونوں کے تعلق کی وجہ سے مسبب کو سبب کی جگہ رکھا۔

وَأَشْكُرُ مَا لَمْ يُؤْتِ أَحَدًا مِّنَ الْعَالَمِينَ (پ ۷)

اور دیا تم کو جو کچھ کہ نہ دیا کسی کو عالموں سے (شاہ رفیع الدین)۔
اور تم کو اتنا عنایت کیا کہ اہل عالم میں سے کسی کو نہیں دیا (فتح محمد)۔
اور دیا تم کو جو نہیں دیا تھا کسی کو جہان میں۔ (محمود الحسن)
اور تم کو وہ کچھ دیا جو دنیا میں کسی کو نہ دیا تھا (مودودی)
اور تمہیں وہ دیا جو دنیا جہان میں کسی (قوم) کو بھی نہیں دیا گیا۔ (عبد الماجد)
اور تمہیں وہ چیزیں دیں جو دنیا جہان والوں میں سے کسی کو نہیں دیں۔ (اشرف علی)
اور دیا تم کو جو نہیں دیا کسی کو جہان میں۔ (شاہ عبدالقادر)
اور تمہیں وہ دیا جو آج سارے جہان میں کسی کو نہ دیا۔ (اعلیٰ حضرت)
حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنی قوم کو اللہ تعالیٰ کی نعمتیں یاد دلایا ہے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کو یاد کرو اس نے تم میں انبیائے کرام بنائے اور تمہیں وہ دیا جو آج سارے جہان میں کسی کو نہ دیا۔

اگر لفظ آج کی زیادتی نہ کی جائے تو سمجھ آتا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم کی فضیلت تمام جہانوں پر بیان فرمائی۔ اس میں تو قوم موسیٰ علیہ السلام کی فضیلت امت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور پہلی تمام امتوں پر لازم آئے گی۔ حالانکہ ایسا نہیں۔ اسی کو روح المعانی میں اس طرح پیش کیا گیا: العالمین للعهد والمراد عالمی زمانہم اور استغراق والتفضیل من وجہ لا یستلزم التفضیل من جمیع الوجہ فانہ قد یکون للمفضول ما لیس للفاضل و علی التقیین

لا يلزم تفضيلهم على هذه الامة المحمدية على نبيها
افضل الصلوة واكمل التحية وايتاء مال الحيوة احد
وان لم يلزم منه التفضيل لكن المتبادر من
استعماله ذلك ولذا اول ما اول

العالمین پر الف لام عہدی ہے جس کا مقصد ہے ہمیں اپنے زمانے میں (آج)
جو دیا گیا ہے وہ کسی کو نہیں دیا گیا۔ الف لام استغراقی بھی ہو سکتا ہے مطلب یہ ہو گا کہ
مقتضی تمام جہان والوں پر بعض وجوہ سے فضیلت دی گئی ہے کیونکہ کبھی مفضل میں
بعض لحاظ پر وہ کمال پایا جاتا ہے جو فاضل میں نہیں ہوتا۔ بہر حال دونوں تقدیریں
میں امت موسیٰ علیہ السلام کو امت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر فضیلت لازم نہیں آتی۔
روح المعانی کی اس تفسیر کے بعد واضح ہوا کہ پہلی صورت میں ترجمہ وہی بہتر ہے
جو حضرت نے کیا ہے البتہ دوسری صورت میں یہ ترجمہ ہو سکتا ہے اور کچھ دیا تم کو
جو نہیں دیا تھا کسی کو جہان میں لیکن لفظ آج کی قید کی زیادتی کے بغیر اور اسی طرح
لفظ کچھ یا بعض کی زیادتی کے بغیر ترجمہ مناسب نہیں۔

وَلَا تَتَّبِعْ أَهْوَاءَهُمْ عَمَّا جَاءَكَ مِنَ الْحَقِّ (پ ۱۱)

اور حق جو تمہارے پاس آچکا ہے اس کو چھوڑ کر ان کی خواہشوں کی پیروی نہ
کرنا۔ (فتح محمد)

ان کی خوشی پر مت چل چھوڑ کر بیدھار راستہ جو تیرے پاس آیا (محمود الحسن)
اور ان لوگوں کی خواہشوں پر عمل نہ کیجیے اس سچائی سے الگ ہو کر جو آپ کے
پاس آچکی ہے۔ (عبد الماجد)

اور جو سچی کتاب آپ کو ملی ہے اس سے دور ہو کر ان کی خواہشوں پر عملدرآمد
نہ کیجیے۔ (اشرف علی)

اور ان کی خوشی پر مت چل چھوڑ کر حق راہ جو تیرے پاس آئی (شاہ عبدالقادر)
اے سننے والے! ان کی خواہشوں کی پیروی نہ کرنا اپنے پاس آیا ہوا حق چھوڑ کر۔
(اعلیٰ حضرت)

یہ خطاب بھی عام مسلمانوں کو ہے کیونکہ نبی کریم تو معصوم ہیں۔ آپ کا حق راہ کو
چھوڑنا متصور نہیں۔ لہذا مطلقاً بغیر "اے سننے والے" کی زیادتی کے یا بافرض المحال کے
ترجمہ درست نہیں۔ تفسیر کبیر میں اسی ترجمہ کی تائید ہے کہ خطاب نبی کریم اور مراد آپ
کی امت ہے: وقیل الخطاب له والمراد غیرہ اور یہی حال اس آگے
دوسری آیت میں بھی ہے۔

إِذْ قَالَ الْحَوَارِيُّونَ يَٰعِيسَىٰ بْنِ مَرْيَمَ هَلْ نَسْتَطِيعُ مَعَكَ الْآخِیَّةَ
(پ ۱۲)

کہا حواریوں نے اے عیسیٰ مریم کے بیٹے تیرا رب کر سکتا ہے کہ اتارے ہم پر خوان
بھرا ہوا آسمان سے (مولانا محمود الحسن)

جب کہا حواریوں نے اے عیسیٰ مریم کے بیٹے تیرے رب سے ہو سکے کہ اتارے
ہم پر خوان بھرا آسمان سے (شاہ عبدالقادر)

حواریوں نے عرض کیا کہ اے عیسیٰ ابن مریم آپ کے رب ایسا کر سکتے ہیں
کہ ہم پر آسمان سے کچھ نازل فرمائیں (مولانا اشرف علی)

حواریوں نے کہا اے عیسیٰ ابن مریم کیا آپ کا رب ہم پر آسمان سے کھانے کا
ایک خوان اتار سکتا ہے (مولانا مودودی)

(وہ قصہ بھی یاد کرو) جب حواریوں نے کہا کہ اے عیسیٰ ابن مریم کیا تمہارا پروردگار
ایسا کر سکتا ہے کہ ہم پر آسمان سے (طعام کا) خوان نازل کرے۔ (فتح محمد)

جس وقت کہا حواریوں نے اے عیسیٰ بیٹے مریم کے آیا کر سکتا ہے پروردگار
تیرا یہ کہ اتارے اوپر ہمارے خوان آسمان سے۔ (شاہ رفیع الدین)

حواریوں نے کہا اے عیسیٰ بن مریم کیا آپ کا رب ایسا کریگا کہ ہم پر آسمان سے ایک نوحان اُتارے (اعلیٰ حضرت)

اس مقام پر دیگر مترجمین نے یہ ترجمہ کیا کہ کیا اللہ ایسا کر سکتا ہے لیکن اعلیٰ حضرت نے ترجمہ کیا ہے کیا آپ کا رب ایسا کرے گا؟ تراجم میں فرق واضح ہے کہ یہ سوال کرنا کہ کیا اللہ ایسا کر سکتا ہے؟ یہ اسی وقت ممکن ہے جب کہ سوال کرنے والے کے دل میں شک ہو کہ اللہ تعالیٰ کو یہ قدرت حاصل ہے یا نہیں۔ پھر وہ شخص کہے گا کیا اللہ ایسا کر سکتا ہے لیکن اگر اللہ تعالیٰ پر ایمان ہو تو یہ سوال کرنا ممکن نہیں۔ البتہ یہ سوال کیا جا سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کو اگرچہ ہر طرح کی قدرت حاصل ہے جو چاہے وہ کر سکتا ہے لیکن کیا ہماری التجا پر یہ کام کرے گا یا نہیں۔ یہاں سوال قدرت کے متعلق نہیں کہ اسے قدرت حاصل ہے یا نہیں بلکہ سوال مشیت کے بارے میں ہے کہ اس کام میں اس کی مشیت بھی ہے یا نہیں۔ یہ سوال جائز ہے۔

اب یہ خیال کیا جائے کہ یہ سوال کرنے والے حواریین ہیں۔ وہ حواریین کون ہیں؟ ہذا اول من امن بحیسی علیہ السلام (صاوی) وہ عیسیٰ علیہ السلام پر سب سے پہلے ایمان لانے والے ہیں۔ ان کے ایمان پر خود قرآن پاک شاہد ہے: **قَالَ الْحَوَارِيُّونَ غَيْرُ انْصَارَ اللَّهُ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَاشْهَدُ بَا نَا مُسْلِمُونَ** حواریوں نے کہا ہم اللہ کے دین کے مدگار، ہم اللہ پر ایمان لائے اور اے عیسیٰ علیہ السلام ہمارے ایمان لانے پر آپ گواہ رہیں۔

جب حواریین اپنے ایمان کا برملا اقرار کر رہے ہیں اور اپنے ایمان پر عیسیٰ علیہ السلام کو گواہ بنا رہے ہیں تو یہ کیسے ممکن ہے کہ وہ اللہ کی استطاعت میں شک کریں۔ اسی شک اور اس کا ازالہ اور اعلیٰ حضرت کے ترجمہ کی صحت اور دوسرے حضرات کی بظاہر الفاظ سے غلطی کی وجہ، تفاسیر سے دیکھیں۔ جلالین میں ہے: **هَلْ يَسْتَطِيعُ اِيْ يَفْعَلُ وَبَدَلْ** کیا تمہارا رب کرے گا۔ یہ معنی نہیں کہ تمہارا رب کر سکے گا؟ جلالین کے اسی مقام پر تفسیر صاوی میں ہے: **اِيْ يَفْعَلُ لَمْ يَفْعَلْ**

اللازم وهو الاستطاعة واد الملزوم وهو الفعل و دفع بذلك ما يقال ان الحواريين مومنون فكيف يشكون في قدرة الله تعالى
یعنی ہل يستطيع کی تفسیر بفعل سے کیوں کی گئی۔ اس لیے کہ یہاں مجاز مرسل سے کہ اطلاق استطاعت کا ہے جو لازم ہے اور مراد ملزوم سے اور وہ فعل ہے کیونکہ جہاں فعل ہوگا وہاں استطاعت لازم ہوگی۔ یہ مجاز کا استعمال کرنا ذکر لازم اور ملزوم مراد لینا اس وجہ سے ہے کہ یہاں ایک سوال کو مندرج کرنا ہے کیونکہ سوال یہ ہوتا ہے کہ حواریین تو ایمان والے تھے انھوں نے اللہ تعالیٰ کی قدرت میں کیسے شک کرتے ہوئے یہ سوال کیا۔ تو اس کا جواب واضح طور پر سمجھ آچکا ہے کہ یہاں استطاعت اپنے لغوی معنی میں استعمال ہی نہیں بلکہ مجازی طور پر بفعل کے معنی میں استعمال ہے جس کا معنی یہی ہوگا کیا تمہارا رب کرے گا۔ عام مترجمین ہل يستطيع کے لفظ سے غلطی میں مبتلا ہو گئے کیونکہ ہل يستطيع کا لغوی معنی بلاشبہ یہ ہے کہ وہ کر سکے گا وہ کر سکتا ہے لیکن قرآن پاک کے رموز سے یہ بے خبری کی علامت ہے کیونکہ قرآن پاک میں تشابہات بھی ہیں اور مجازات و کنایات بھی۔ اس کے برعکس اعلیٰ حضرت کا ترجمہ اس شک کو مندرج کر رہا ہے اور جو بیان کرنا مقصود تھا اُسے ہی ظاہر کر رہا ہے۔ یہ کمال اسی وقت حاصل ہو سکتا ہے جب کہ مترجم کی نظر تفسیر پر ہو، پھر ترجمہ کرے۔ رشح المعانی میں بھی اسی طرح ہے: **ان معنی ہل يستطيع** ہل یفعل کما نقول للقادر علی القيام ہل یستطیع ان تقوم یعنی ہل یستطیع کا معنی کیا کرے گا جس طرح قیام پر قدرت رکھنے والے کو کہا جائے کیا تو کھڑا ہوگا؟

وَالْمَوْتِ يَنْعَثُهُمُ اللّٰهُ (پ ۴)

اور مردوں کو زندہ کرے گا۔ (محمود الحسن)۔

ہے مَرُوے تو انھیں تو اللہ بس قبروں ہی سے اٹھائے گا (مودودی)

اور مردوں کو اللہ جل کر کھڑا کرے گا۔ (عبدالماجد)
 اور مردوں کو اللہ تعالیٰ زندہ کر کے اٹھائیں گے۔ (مولانا اشرف علی)
 اور مردوں کو اٹھاوے گا اللہ (شاہ عبدالقادر)
 اور مردوں کو تو خدا قیامت ہی کو اٹھائے گا (فتح محمد)
 اور مردے جلادے گا اللہ۔ (شاہ رفیع الدین)
 ان مردہ دلوں کو اللہ اٹھائے گا۔ (اعلیٰ حضرت)

اس مقام پر ذکر کیا جا رہا ہے کہ اے محبوب آپ کی دعوت کو وہ قبول کرتے ہیں جو سوچ و سمجھ کے مانگ ہیں۔ آپ کی بات کو غور و فکر سے سنتے ہیں (اور کفار آپ کی بات کو تسلیم نہیں کریں گے) ان مردہ دلوں کو اللہ اٹھائے گا۔ اسی کی طرف انھوں نے ٹوٹنا ہے۔ یہاں الموتی سے مراد کفار ہیں نہ کہ مطلقاً مردے کیونکہ مردہ کا اطلاق نفوت شدہ پر ہوتا ہے وہ عام ہے مومن و کافر سب کو شامل ہے۔ اسی وجہ سے اگر ترجمہ کیا جائے "مردوں کو اللہ زندہ کرے گا" قرآن پاک کا حقیقی مفہوم سمجھ نہیں آتا یہی سمجھا جائے گا کہ یہاں صرف قیامت اور تمام نفوت شدہ کو زندہ کرنے کا ذکر ہے حالانکہ مقصود ہی نہیں بلکہ مقصود کفار کو اٹھانا مراد ہے جب یہ ترجمہ کیا جائے کہ "ان مردہ دلوں کو اللہ اٹھائے گا" اب مقصد واضح ہو گا کہ مردہ دل تو کفار ہی ہیں مہی مراد ہونگے جب کہ قرآن پاک نے اس مقام پر کفار کے اٹھانے کا ہی ذکر کیا ہے تو وہی ترجمہ مقبول ہو گا جو مقصد کے مطابق ہو: والموتی ای الکفار شبہہم فی عدم السماع (جلالین) یعنی موتی سے مراد کفار ہیں۔ ان کو مردہ سے تشبیہ دی گئی ہے کہ یہ دعوت حق کو قبول نہیں کرتے: والموتی مبتلائی الکفار (مدارک) موتی ترکیبی لحاظ سے مبتدا واقع ہو رہا ہے اور اس سے مراد کفار ہیں والموتی ای الکفار (روح المعانی) موتی سے مراد کفار ہیں و فی اطلاق الموتی علی الکفار استعارۃ تبعیۃ مبنیۃ علی تشبیہ کفر و جہلہم بالسودت (روح المعانی) لفظ موتی کا کفار پر اطلاق استعارہ تبعیہ ہے کیونکہ ان کے کفر و جہالت کو موت سے

تشبیہ دی گئی ہے۔

وَلَا أَعْلَمُ الْغَيْبَ (پ: ۹)

اور نہ میں جانوں غیب کی بات (محمود الحسن)
 نہ میں غیب کا علم رکھتا ہوں۔ (مودودی)
 اور نہ میں غیب جانتا ہوں۔ (عبدالماجد)
 اور نہ میں جانوں غیب کی بات (شاہ عبدالقادر)
 اور نہ (یہ کہا میں غیب جانتا ہوں) (فتح محمد)
 اور نہ میں جانتا ہوں غیب کو (شاہ رفیع الدین)
 اور نہ یہ کہوں کہ میں آپ غیب جان لیتا ہوں۔ (اعلیٰ حضرت)

اس مقام پر الخفوت کے ترجمہ سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ نفی قول ہے یعنی کہنے کی نفی ہے کہ میں نہیں کہتا اور ذاتی طور پر علم غیب کی نفی ہے نہ کہ عطائی کی۔ لیکن اس کے برعکس دوسرے تراجم سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ مطلقاً غیب کی نفی ہو رہی ہے، حالانکہ یہ درست نہیں۔ یہاں قول کی نفی ہے۔ اس پر مدارک میں یہ تفسیر ہے: وَلَا أَعْلَمُ الْغَيْبَ النصب عطف علی محل عندی خزائن امثله لان من جملة المقول كان قال لا اقول لك هذا القول ولا هذا القول ولا اقول لك هذا ملأ ای لا ادعی ما يستبعد في الحقول ان يكون بشر من ملأ خزائن امثله و علم الغيوب ودعوى الملكية وانما ادعی ما كان لكثير من البشر وهو النبوة لَا أَعْلَمُ الْغَيْبَ جملہ محل نصب میں ہے کیونکہ اس کا عطف عندی خزائن اللہ کے محل پر ہے اور وہ بھی محل نصب ہے کیونکہ وہ جملہ قول کا مقولہ ہے۔ لہذا مقصد یہ ہوا کہ تمام معطوف اور معطوف علیہ مقولہ میں کہیں نہ یہ کہتا ہوں اور نہ یہ۔ وَلَا أَعْلَمُ الْغَيْبَ ملأ کی تفسیر میں بھی

یہ بیان کرتے ہیں کہ میں یہ دعویٰ نہیں کرتا جو انسانی عقل سے بعید ہو کہ ایک بشر کے پاس اللہ کے خزانے ہوں اور علم غیب رکھتا ہوں اور فرشتہ ہونے کا دعویٰ دار ہو بلکہ میں وہ دعویٰ کرتا ہوں جو پہلے بھی کثیر بشیر حضرات نے دعویٰ ثبوت کیا ہے۔ اس سے پتا چلا کہ یہاں قول اور دعویٰ کی نفی ہے نہ کہ علم غیب کی۔

دوسری وجہ فرق یہ ہے کہ اعلیٰ حضرت کے ترجمہ سے ذاتی غیب کی نفی ہے نہ کہ عطائی کی۔ اس پر تفسیر حمل کو لو کہتے اعلیٰ الغیب پ کی تفسیر میں دیکھیں۔ خود واضح ہو گا کہ مطلقاً غیب کی نفی نہیں ہو سکتی لقائل ان يقول قد اخبر صلی اللہ علیہ وسلم عن المغیبات وقد جاءت احادیث فی الصحیح حدیثاً وهو اعظم من معجزاتہ صلی اللہ علیہ وسلم فکیف الجمع بینہ و بین قولہ ولو کنت اعلیٰ الغیب لا استکثرت من الخیر واجیب ان یقول ان یقول علی سبیل التواضع والادب المعقول لا اعلیٰ الغیب الا ان یطعن فی اللہ علیہ ولقد ردہ الحی اگر کوئی اعتراض کرے کہ نبی کریم نے تو یہت غیبی خبریں دی ہیں اور صحیح احادیث میں اس کا ذکر ہے حالانکہ علم غیب نبی کریم کا عظیم معجزہ ہے تو ان احادیث اور قرآن پاک کی اس آیت کریمہ ولو کنت اعلیٰ الغیب لا استکثرت من الخیر میں مطابقت کیسے ہوگی۔ اس کا جواب یہ دیا جائے گا کہ نبی کریم نے معجزہ نوکساری کے طور پر یہ کہا ہے اور ازرے ادب کے کہ میں خود غیب نہیں جانتا جب تک مجھے اللہ اس پر مطلع نہ فرمائے اور قدرت نہ دے۔ روح المعانی میں بھی نفی قول ہی ہے: ولا اعلم الغیب عطف علی محل عندی خواص اللہ فیہ مقول۔ ولا اعلم الغیب کا عطف عندی خزان اللہ کے محل پر ہے اور یہ قول کا مقول ہے۔

اب تفاسیر کے واضح بیانات سے یہ مقصد بخوبی حاصل ہوتا ہے کہ مطلقاً علم غیب کی نفی نہیں بلکہ از خود غیب کے جاننے کی نفی ہے اور ترجمہ بھی اسی وقت صحیح ہو گا جس سے یہ پتا چلے کہ یہاں ذاتی طور پر غیب کے جاننے کی نفی ہے۔ اعلیٰ حضرت کا ترجمہ اسی

مقصد عظیم پر دل ہے جس سے دیگر تراجم خالی ہیں۔

فَتَكُونُ مِنَ الظَّالِمِينَ (پ ۱۱)

پس ہو جائے گا تو بے انصافوں میں۔ (مولانا محمود الحسن)۔

آپ کا شمار بے انصافوں میں ہو جائے گا۔ (عبدالمابود)

تو آپ نامناسب کام کرنے والوں میں ہو جائیں گے۔ (اشرف علی)۔

پھر ہر مے بے انصافوں میں (شاہ عبدالقادر)

تو ظالموں میں ہو جاؤ گے۔ (فتح محمد)

پس ہو جائے تو ظالموں میں سے (شاہ رفیع الدین)۔

تو یہ کام انصاف سے بعید ہے (اعلیٰ حضرت)۔

اس آیت کریمہ میں یہ بیان کیا جا رہا ہے کہ جب کفار نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ مطالبہ کیا کہ جو غریب صحابہ میں جن کا لباس صاف نہیں ان کو اپنی مجلس سے اٹھا دیں پھر تم آپ کے پاس بیٹھ کر آپ سے بات کریں گے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اے محبوب آپ ان لوگوں کو جو صبح و شام رب کو پکارتے ہیں ان کو اپنی مجلس سے نہ اٹھائیں وہ اللہ کی رضا چاہتے ہیں۔ تم پر ان کا کوئی حساب نہیں اور ان پر تمہارے حساب سے کچھ نہیں۔ پھر اگر آپ ان کو دور کریں تو یہ کام انصاف سے بعید ہے۔ اب اس مقام پر نبی کریم کی طرف نسبت بے انصافی کی کرنا اسی وقت صحیح ہو گا جب آپ سے اس کا وقوع ممکن ہو جب کہ صحابہ کرام کو مجلس سے اٹھانے کا کفار کا مطالبہ تسلیم ہی نہ ہوا تو بے انصافی کا ترتیب بھی نہ ہو کیونکہ انبیاء کرام کی عصمت کے ہی منافی ہے۔ جب یہ ترجمہ کیا جائے "پس ہو جائے گا تو بے انصافوں میں"۔ یہ ادب و احترام اور مقام سید الانبیاء کے منافی ہے۔ لیکن "یہ کام انصاف سے بعید ہے" یہ ادب و احترام پر مبنی ہے۔ لیکن اس پور کو تو اں کو ڈانٹے محاورہ کے مطابق متصرین کا تبصرہ اعلیٰ حضرت کے خلاف مشاہدہ ہو۔ لکھتے ہیں "اس جگہ کام انصاف سے بعید" کا ترجمہ

عربی لغت سے بالکل نابلد ہونے کی روشن دلیل ہے۔ اس ترجمہ کی حقیقت تو واضح ہو چکی ہے کہ یہاں نبی کریم کی شان کے مطابق ہے البتہ اگر یہ کہا جائے کہ یہ لغوی ترجمہ نہیں یا محاورہ ترجمہ ہے تو کیا لغوی ترجمہ کرنا لازم ہے؟ تو یا محاورہ تراجم عربی لغت سے نابلد ہونے کی دلیل ہوں گے۔ اس قاعدہ کے مطابق ڈپٹی نذیر احمد کا ترجمہ تو بالکل عربی سے ناواقف پر مبنی ہو گا بلکہ جناب کے ممدوح شیخ الہند مولانا محمود الحسن صاحب بھی اس زرد میں آئیں گے۔ آئیے اپنا قاعدہ ذرا شیخ الہند صاحب پر جاری کریں کہ وہ بھی یا محاورہ ترجمہ کا سہارا لیتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ایک مثال بطور نمونہ پیش کر رہا ہوں ورنہ کئی مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں:-

قَدْ كَانَ لَكُمْ آيَةٌ

اس کا ترجمہ مولانا محمود الحسن صاحب نے کیا ہے ”ابھی گزر چکا ہے تمہارے سامنے ایک نمونہ“۔ کون سا یہ ترجمہ لغوی ہے؟ جب یہ ترجمہ یا محاورہ جائز ہے تو نبی کریم کے ادب کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے اعلیٰ حضرت نے یا محاورہ ترجمہ کیا ہے تو اس پر اعتراض یقیناً دلیل ہے کہ شان مصطفیٰ کا عیاں ہونا پسند نہیں میرے ایک دوست ایک ہی کسوٹی پر سب کو پرکھیں۔ ایک ہی ضابطہ پر کہیں اعتراض کہیں مدح یہ عقلمندوں کی شان نہیں ہے اور اعلیٰ حضرت کے ترجمہ کی تائید تفسیر کبیر کر رہی ہے: ان الظلم عبارة عن وضع الشيء في غير موضعه والمعنى ان اولئك الضعفاء الفقراء كانوا يستحقون التعظيم من الرسول عليه السلام فاذا طرحوا عن ذلك المجلس كان ذلك ظلماً۔ ظلم کا معنی کسی چیز کو اس کے محل کے غیر میں رکھنا۔ مقصد یہ ہے کہ ضعیف و فقراء نبی کریم کی طرف سے مستحق تعظیم ہیں اگر ان کو مجلس سے اٹھایا گیا تو یہ اٹھانا انصاف سے دور ہو گا مجلس سے اٹھانا کام ہی تو ہے۔ اب اس ترجمہ میں کون سا استحالة باقی رہ گیا ہے کہ یہ کام انصاف سے بعید ہے۔

وَإِذَا رَأَيْتَ الَّذِينَ يَخُوضُونَ فِي آيَاتِنَا فَأَعْرِضْ عَنْهُمْ

حَتَّى يَخُوضُوا فِي حَدِيثٍ غَيْرِهِ ۚ (پ ۴۸)

اے نبی جب تم دیکھو کہ لوگ ہماری آیات پر نکتہ چنیاں کر رہے ہیں تو ان کے پاس سے ہٹ جاؤ یہاں تک کہ وہ اس گفتگو کو چھوڑ کر دوسری باتوں میں لگ جاتیں اور اگر کبھی شیطان تمہیں بھلائے میں ڈال دے تو تمہیں جس وقت غلطی کا احساس ہو جائے اس کے بعد پھر ظالموں کے پاس نہ بیٹھو۔ (مودودی)

اور جب تو دیکھے ان لوگوں کو جھگڑتے ہیں ہماری آیتوں میں تو ان سے کنارہ کر یہاں تک کہ مشغول ہو جاویں کسی اور بات میں اور اگر بھلائے تجھ کو شیطان تو مت بیٹھ یاد آ جانے کے بعد ظالموں کے ساتھ (محمود الحسن)

اور جب تو ان لوگوں کو دیکھے جو ہماری نشانیوں کو مشغلہ بناتے ہیں تو ان سے کنارہ کش ہو جا یہاں تک کہ وہ کسی اور بات میں لگ جائیں، اور اگر شیطان تجھے بھلا دے تو یاد آ جانے کے بعد (ایسے) ظالم کے پاس مت بیٹھ۔ (عبدالمحاصر یا یاد دی)

اور اے سننے والے! جب تو انہیں دیکھے جو ہماری آیتوں میں پڑتے ہیں تو ان سے منہ پھیر لے جب تک اور بات میں پڑیں اور جو کہیں تجھے شیطان بھلا دے تو یاد آنے پر ظالموں کے پاس مت بیٹھ۔ (اعلیٰ حضرت)

اس آیت کریمہ میں اعلیٰ حضرت کے ترجمہ میں نسبت عام سُننے والے کی طرف ہے نبی کریم کی طرف نہیں لیکن دوسرے تراجم میں نسبت نبی کریم کی طرف ہے۔ آیت کریمہ کے معنوم کو دیکھنے کے بعد خود ہی صاحب ایمان آدمی سمجھتا ہے کہ یہ حکم نبی کریم کو نہیں بلکہ یہ عام آدمی کو خطاب ہے کیونکہ نبی کریم پر شیطان کا تسلط ممکن نہیں نہ وہ ذہب بعض المحققین ان الخطاب هنا وفيما قبل لسيد المرسلين

عليه الصلوة والسلام والتمواد غيره وقيل لغيره ابتداء اي اذا امر آيت
ايها السامع وان انسانا ايها السامع - (روح المعاني) محققين اس
طرف گئے ہیں کہ امامین شیعہ الشیطان اور اذا رایت الذین میں خطاب نبی
کریم کو ہے لیکن مراد آپ کے غیر ہیں۔ اور کچھ حضرات نے کہا ہے کہ یہ خطاب ابتدائی
طور پر ہی غیروں کو ہے نبی کریم کو نہیں معنی ہی یہ ہے کہ اے سننے والے جب تو انہیں
دیکھے اے سننے والے جب تجھے شیطان بھلائے : واذا رایت قبل انہ خطاب
للسنی صلی اللہ علیہ وسلم والمراد غیرہ وقیل الخطاب لغيره ای اذا
سمعت ایها السامع الذین یخوضون فی ایتنا - (کبیر) یہ خطاب نبی
کریم کو ہے اور مراد آپ کے غیر ہیں۔ بعضوں نے کہا ہے کہ خطاب ہی غیروں کو ہے۔
اے سننے والے جب تو دیکھے ان کو ہماری آیات میں پڑے ہوئے راہنما کرتے
ہوئے۔

قُلْ اَنْتَ دُعَاؤُ مِنْ دُونِ اللّٰهِ مَا لَا يَنْفَعُنَا وَلَا يَضُرُّنَا (پ ۴۰)

کہو کیا ہم خدا کے سوا ایسی چیزوں کو پکاریں جو نہ ہمارا بھلا کر سکیں اور نہ بُرا۔
(فتح محمد)

تو کہہ کیا ہم پکاریں اللہ کے سوا جو نہ بھلا کرے ہمارا نہ بُرا (شاہ عبد القادر)
تو کہہ کیا ہم پکاریں اللہ کے سوا ان کو جو نہ نفع پہنچا سکیں ہم کو اور نہ نقصان۔
(مولانا محمود الحسن)۔

اے نبی ان سے پوچھو کیا ہم اللہ کو چھوڑ کر ان کو پکاریں جو نہ ہمیں نفع دے
سکتے ہیں نہ نقصان۔ (مودودی)۔

آپ کہہ دیجئے کیا ہم مسلمان اللہ کے سوا اے کو پکاریں جو نہ ہم کو نفع پہنچا
سکے اور نہ ہم کو نقصان۔ (عبد الماجد)۔

تو فرماؤ کیا ہم اللہ کے سوا اس کو پوچھیں جو ہمارا نہ بھلا کرے نہ بُرا (علی الحضر)

عام طور پر اس قسم کی آیات انبیائے کرام اور اولیائے کرام کے حق میں پیش کی جاتی ہیں کہ
ان سے استمداد ناجائز ہے یہ تو نفع و نقصان کے مالک ہی نہیں حالانکہ بتوں کے حق میں
نازل شدہ آیات کو اولیائے کرام کے حق میں پیش کرنا دشمنی نہیں۔ اللہ کو معنی
پکارنا لینا کیسے صحیح ہے یہاں تو معنی عبادت کا ہے نہ کہ پکارنے کا۔ قل لا الہ
بکرم حق یقول لا الہ عبد الرحمن وکان یدعو اباءہ الی عبادۃ الاوثان
استدعوا انعبد من دون اللہ الضار النافع ما لا ینفعا
ما لا یقدر علی نفعنا ان دعونا ولا یضرنا ان نرتکب (مارک)
حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے بیٹے عبد الرحمن جب ایمان نہیں لاتے تھے اپنے
والدِ مکرم کو بھی بت پرستی کی دعوت دیتے تھے تو اس وقت یہ حکم ہوا کہ تم کہو
کہ کیا ہم اس اللہ جو نفع و نقصان کا مالک ہے کے غیر کی عبادت کریں جن کی عبادت
کرنا نفع نہیں اور ان کی عبادت کو چھوڑنا نقصان نہیں۔ تو ہم ان کی عبادت کیوں
کریں۔ استدعوا انعبد من دون اللہ ما لا ینفعا بعبادۃ ولا یضرنا
بات کیما وہو الاضمار (جلالین) کیا ہم اللہ کے غیر کی عبادت کریں جن کی
عبادت نفع نہیں دیتی اور جن کی عبادت کو چھوڑنا نقصان نہیں پہنچاتا۔ وہ اللہ
کے غیر کیا ہیں؟ وہ بت ہیں۔ اعلم ان المقصود من هذه الاية الرد علی
عبدة الاصنام وھی مؤكدة لقوله تعالیٰ قبل ذلک (قل انی نہیت
ان اعبد الذین تدعون من دون اللہ فقال استدعوا من دون
اللہ ای انعبد من دون اللہ النافع الضار ما لا یقدر علی نفعنا
ولا علی ضررنا (کبیر)
اس آیت سے بتوں کی عبادت کرنے والوں کا رد مقصود ہے اور یہ آیت
پہلی آیت قل انی نہیت اللہ کی تاکید ہے کیونکہ وہاں بھی تدعون معنی تعبّد
ہے اور اعمد صراحت معنی عبادت کے موجود ہے پس اسی وجہ سے کہا کہ ہم
اللہ جو نفع و نقصان کا مالک ہے اس کے غیر کی عبادت کریں جو نفع و ضرر پر قادر نہیں۔

ای نعبد متجاوزین عبادة الله الجامع لجميع صفات الوهية التي من
جملتها القداسة على النفع والضرر ما لا يقدر على نفعنا ان
عبدناه ولا على ضررنا اذا تركناه (روح المعاني) کیا ہم اس اللہ کی عبادت
کے نجا و زکریں جو تمام صفات الوہیت کا مالک ہے اور اس کی قدرت میں نفع
و نقصان کا مالک ہونا بھی ہے۔ اس کی عبادت کریں جن کی عبادت میں نفع نہیں
اور ان کی عبادت کو چھوڑنے میں نقصان نہیں یعنی یہ نہیں ہو سکتا۔

ان تمام تفاسیر کی عبارات سے واضح ہوا کہ اندھ کو کا معنی عبادت ہے نہ کہ
مطلقاً پکارنا یا دُعا کرنا جیسا کہ اپنے مقصد کو ثابت کرنے کے لیے ناکام کوشش
کی گئی ہے۔

فَلَمَّا جَنَّ عَلَيْهِ اللَّيْلُ رَأَى كَوْكَبًا قَالَ هَذَا رَبِّي

فَلَمَّا رَأَى الْقَمَرَ بَازِعًا قَالَ هَذَا رَبِّي ه

فَلَمَّا رَأَى الشَّمْسَ بَازِعَةً قَالَ هَذَا رَبِّي هَذَا أَكْبَرُهُ

(پ ۵۷)

تو یوں ہوا کہ جب رات ابراہیم پر چھا گئی، انھوں نے ایک تار کو دیکھا بولے
یہی میرا پروردگار ہے۔ پھر جب چاند کو دیکھا چمکتے ہوئے تو بولے یہی میرا پروردگار
ہے۔ پھر جب سورج کو چمکتے ہوئے دیکھا تو بولے یہی میرا پروردگار ہے۔ (تفسیر المیزان)
پھر جب اندھیرا کر لیا اس پر رات نے، دیکھا اس نے ایک ستارہ بولا یہ ہے
میرا رب۔ پھر جب دیکھا چاند چمکتا ہوا بولا یہ ہے میرا رب۔ پھر جب دیکھا سورج
چمکتا ہوا، بولا یہ ہے میرا رب سب سے بڑا۔ (مولانا محمود الحسن)

پھر جب اندھیری آئی اس پر رات دیکھا ایک تار بولا یہ ہے رب میرا۔
پھر جب دیکھا چاند چمکتا ہوا بولا یہ ہے رب میرا۔ پھر جب دیکھا سورج چمکتا

بولا یہ ہے رب میرا یہ رب سب سے بڑا۔ (شاہ عبدالقادر)۔

پھر جب رات کی تاریکی ان پر چھا گئی تو انھوں نے ایک ستارہ دیکھا۔ آپ
نے فرمایا کہ یہ میرا رب ہے۔ پھر جب چاند کو چمکتا ہوا دیکھا تو فرمایا کہ یہ میرا رب
ہے۔ پھر جب آفتاب کو دیکھا تو فرمایا کہ یہ میرا رب ہے۔ (اشرف علی)۔
چنانچہ جب رات اس پر طاری ہوئی تو اس نے ایک تار دیکھا کہا یہ میرا
رب ہے۔ پھر چاند چمکتا نظر آیا تو کہا یہ ہے میرا رب، پھر جب سورج کو روشن
دیکھا تو کہا یہ ہے میرا رب۔ (مودودی)۔

یعنی جب رات نے ان کو پردہ تاریکی سے اٹھانپ لیا تو (آسمان میں)
ایک ستارہ نظر پڑا۔ کہنے لگے، یہ میرا پروردگار ہے۔ پھر جب سورج کو کہ جگمگا رہا ہے
تو کہنے لگے یہ میرا پروردگار ہے۔ یہ سب سے بڑا ہے۔ (فتح محمد جالندھری)۔

پھر جب ان پر رات کا اندھیرا آیا ایک تار دیکھا بولے اسے میرا رب ٹھہرتے
ہو۔ پھر جب چاند چمکتا دیکھا بولے اسے میرا رب بتاتے ہو۔ پھر جب سورج جگمگا
دیکھا بولے اسے میرا رب کہتے ہو یہ تو ان سب سے بڑا ہے۔ (اعلیٰ حضرت)

یہاں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی تبلیغ اور قوم پر اللہ تعالیٰ کی وحدانیت پر دلائل
قائم کرنے کا ذکر ہے کیونکہ ان آیات سے پہلے بت پرستوں کو تبلیغ کرنے کا ذکر ہے
کہ جب ابراہیم علیہ السلام نے اپنے آپ آزر کو فرمایا، کیا تم بتوں کو خدا مانتے ہو؟ اسی
بت پرستی کی وجہ سے میں تمہیں اور تمہاری قوم کو صریح گمراہی میں دیکھ رہا ہوں۔ ان
بتوں کے خدا نہ بن سکتے پر قوم کو اس طرح سمجھایا کہ تم نے ایسے خدا بنا رکھے ہیں
جو نہ سنتے ہیں نہ دیکھتے ہیں اور نہ ہی نفع و نقصان کے مالک ہیں۔

اس مقام پر ستارہ پرستوں، چاند پرستوں، سورج پرستوں کے ذکر نے کا ذکر ہے
اور ان پر جو دلائل قائم ہوئے وہ مذکور ہیں۔ جب رات چھا گئی تو ابراہیم علیہ السلام
نے ستارہ کو دیکھ کر ستارہ پرستوں کو کہا کہ کیا یہ میرا رب ٹھہرتے ہو۔ جب ستارہ چھپ
گیا تو آپ نے فرمایا کہ میں چھپنے والوں کو پسند نہیں کرتا مطلب یہ تھا کہ میں ایسے کو

خدا ماننا پسند نہیں کرتا اس لیے کہ یہ تو خود حادث ہے اس کا کوئی محدث ہونا ضروری ہے۔ اس طرح جب چاند کو چمکتے ہوئے دیکھا تو چاند پرستوں کو فرمایا کہ کیا ان کو میرا خدا بتاتے ہو۔ جب وہ بھی چھپ گیا تو آپ نے فرمایا کہ اگر اللہ کا فضل شامل حال نہ ہوتا اور اس نے مجھے ہدایت نہ عطا کی ہوتی تو میں بھی انہی گمراہوں میں ہوتا۔

اس مقام پر لیکن ہم یہ بھی دیکھنا چاہتے ہیں کہ کون سے من القوم الصالحین کے ترجمہ میں بھی مترجمین کی کشتی بچکوتے کھاتی نظر آتی ہے۔ کیونکہ یہ کلام تحریر میں ہے کہ چاند کی پوجا کرنے والے تم گمراہ ہو مجھے تو اللہ نے ہدایت سے نوازا ہے اور بالفرض محل کے بغیر یہ کہنا بھی درست نہیں کہ اگر اللہ نے مجھے ہدایت پر تائید نہ رکھا تو میں گمراہ ہو جاؤنگا۔ وہ نبی کیسے نبی ہو سکتا ہے جس پر رب کی ہدایت ثابت نہ رہے۔ اسی وجہ سے اس مقام کی نزاکت کو دیکھتے ہوئے اعلیٰ حضرت کا ترجمہ شان خلیل اللہ کے مطابق ہے کہ اگر مجھے میرا رب ہدایت نہ کرتا تو میں بھی ابھی گمراہوں میں ہوتا۔ لیکن برخلاف اس کے اگر ایسا ترجمہ کیا جائے "بولوا اگر نہ راہ دے مجھ کو رب میرا تو بے شک میں رہوں بہکتے لوگوں میں" تو یقیناً وہم ہوگا کہ نبی حالت نبوت میں بھی بہک سکتا ہے۔ اور اس سے رب کی ہدایت دور ہو سکتی ہے حالانکہ یہ درست نہیں۔

اسی طرح جب آپ نے سورج کو روشن دیکھا تو سورج پرستوں کو کہا اسے میرا رب کہتے ہو، یہ تو ان سب سے بڑا ہے۔ جب سورج بھی چھپ گیا تو آپ نے فرمایا اے قوم! میں تمہارے مشرکانہ فعل سے بری ہوں۔

اب اس تمہید کے بعد تو ترجمہ فرمائیں ترجمہ کرنے کا مقصد تو یہ ہوتا ہے کہ نا واقف کو سمجھ آجائے مقصد تو نہیں ہونا کہ عام آدمی قرآن پاک کے ترجمہ کو پڑھ کر قرآن دانی کا دعویٰ کرے سمجھے کہ ابراہیم علیہ السلام نے سارہ کو بھی کہا یہ ہے رب میرا، چاند کو بھی کہا یہ ہے رب میرا، سورج کو بھی کہا یہ ہے رب میرا سب سے بڑا۔ حالانکہ اس طرح کا اقرار تو شرک ہے۔ جمیع انبیائے کرام شرک سے پاک ہیں۔ اسی لیے جلالین، مدارک، روح المعانی، کبیر نے بھی زعم کے الفاظ کو مقدّر مانا ہے کہ تم اپنے خیال میں ان کو

میرا رب کہتے ہو تفسیر کبیر میں یقولون کو بھی مقدّر مانا گیا ہے۔ معنی یہ ہوگا۔ وہ یہ کہتے ہیں کہ یہ ہے میرا رب۔ اس سے واضح ہوا کہ ترجمہ اعلیٰ حضرت

کا تفسیر کے مطابق ہے۔ باقی تراجم میں تو نسبت ہی براہ راست ابراہیم علیہ السلام کی طرف کر دی حالانکہ یہ سراسر باطل ہے کیونکہ ابراہیم علیہ السلام تو انہی قوم سے یہ کلام کرنے سے پہلے ہی اللہ تعالیٰ کو وحدہ لا شریک جانتے تھے۔ آپ کا اللہ تعالیٰ کو پہلے ہی جاننا۔ اس پر علامہ رازی نے کئی دلائل قائم کئے ہیں۔ ان میں سے چند ایک اختصار کے پیش نظر پیش کر رہے ہوں :- ان ابراہیم علیہ السلام کان قد عرف ربہ قبل هذه الواقعة بالدلیل والدلیل علی صحتہ ما ذکرناہ اخبر عنہ

قال قبل هذه الواقعة لابی آذر (انتخذ اصناما للہة الخ) اسراء وقولہ فی صنادید مبین (ابراہیم علیہ السلام اپنی قوم سے یہ کلام جو فرما رہے ہیں اس واقعہ سے پہلے اپنے رب کو جانتے تھے کیونکہ آپ نے اپنے آپ اور قوم کو پہلی ہی بت پرستی سے روکا اور فرمایا کہ تم بت پرستی کر رہے ہو میں تمہیں اوتھما سی قوم کو کھلی گمراہی میں دیکھ رہا ہوں۔ یہ اسی وقت ممکن ہے جب خود رب کو پہچانتے ہوں۔ ان هذه الواقعة انما وقعت بعد ان اسراء اللہ ملکوت

السموات والارض حتی رآی من فوق العرش والکرمی وما تحتہما الخی تحت الثری ومن کان منصوب فی الدین کذلک وعلمہ بالاسماء کذلک کیف یلیق بہ ان یعقل الہیۃ الکوکب یہ واقعہ بعد میں در پیش آیا اور جو پہلی آیت کریمہ میں ہے۔ وکذلک سرى ابراہیم ملکوت السموات والارض وہ پہلے کا ہے۔ آپ کو جب اللہ تعالیٰ نے زمین و آسمان کی بادشاہی کا ویدار کر دیا اور علم دیا یہاں تک کہ آپ نے عرش و کرسی سے اوپر اور نیچے تحت الثری تک دیکھا جس کا دین میں نہ نصب ہوا اور اللہ کا اس کو اس طرح علم حاصل ہو، اس کی شان کے لائق یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ وہ تبارک کے خدا ہونے کا اعتقاد کر لے۔

انہ تعالیٰ قال فی صفتہ ابراہیم علیہ السلام (اذ جاء سجد لقلب سلیم) و قال

مراتب القلب السليم ان يكون سليما عن الكفر وايضا ممدحة وقال ولقد
اتينا ابراهيم من قبل من اول ضمان الفكرة وقوله وكنائب
عالمين اى بطهارته وكمالہ ونظيره قوله تعالى الله اعلم حيث
يجعل من سالتہ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی شان میں یہ فرمایا ہے :
اذ جاء ربہ بقلب سليم جب ابراہیم علیہ السلام نے اپنے سلامتی دل کے ساتھ
رب کے پاس پیش ہوئے یعنی دل کو دل میں جگہ نہ دی بلکہ غلطی دل کو رب کی طرف
منتوج کیا قلب سليم کا کم سے کم یہ رتبہ ہے کہ وہ کفر سے سلامتی میں ہو اور اسی طرح آپ
کو اللہ تعالیٰ نے ابتدائی سوچ میں ہی رشد و ہدایت فرمائی۔ اللہ تعالیٰ آپ کے طہات
وکمال کو جانتا ہے اور اللہ اسے ہی رسول بناتا ہے جو اس منصب کا اہل ہوتا ہے
ان آیات سے پتا چلا کہ آپ رب کو پہلے ہی جانتے تھے۔ یہ کلام ان لوگوں سے
ان کو ہدایت پر لانے کے لیے تھی۔ اعلیٰ حضرت کے ترجمہ کی فوقیت اب روز روشن کی طرح
بیاں ہوتی کہ آپ نے تبارہ یا چاند یا سورج کے رب ہونے کا اقرار نہیں کیا جیسا دوسرے
تراجم سے ظاہر ہے بلکہ آپ نے انھیں کہا تم اپنے زعم باطل میں انکو میرا رب کہتے ہو، یہ
رب کیسے؟ یہ تو خود کسی کے تابع ہیں۔

وَكَلَّا فَضَّلْنَا عَلَى الْعَالَمِينَ (پ: ۶)

ان سب کو جہان کے لوگوں پر فضیلت بخشی تھی۔ (فتح محمد)۔
اور سب کو ہم نے بزرگی دی سارے جہان والوں پر۔ (مولانا محمود الحسن)۔
اور ہر ایک کو تمام جہان والوں پر ہم نے فضیلت دی۔ (مولانا اشرف علی)۔
ان میں سے ہر ایک کو ہم نے تمام دنیا والوں پر فضیلت دی۔ (مودودی)۔
اور ان میں سے ہر ایک کو ہم نے جہان والوں پر فضیلت دی تھی۔ (عبداللہ)
اور سب کو ہم نے بزرگی دی سارے جہان والوں پر (شاہ عبدالقادر)۔
اور ہم نے ہر ایک کو اس کے وقت میں سب پر فضیلت دی (اعلیٰ حضرت)

یہاں چند انبیائے کرام کا ذکر کیا گیا ہے۔ ابراہیم، اسحق، یعقوب، نوح، داؤد،
سلیمان، ایوب، یوسف، موسیٰ، ہارون، زکریا، یحییٰ، عیسیٰ، الیاس، اسمعیل، الیسع،
یونس، لوط علیہم السلام۔ ان کے متعلق یہی ذکر و فضلنا علی العالمین کا ذکر
ہے۔ اب اگر یہ ترجمہ کیا جائے، ان میں سے ہر ایک کو یا سب کو تمام جہان والوں پر
فضیلت دی۔ اس طرح تو نبی کریم پر بھی فضیلت لازم آئے گی اور خود ان انبیائے کرام
میں سے ہر ایک کو دوسرے پر فضیلت لازم آئے گی۔ حالانکہ یہ مراد نہیں بلکہ مراد یہ
ہے کہ یہ حضرات اپنے اپنے زمانہ میں فضیلت کے مالک تھے۔

اعلیٰ حضرت کا ترجمہ روح المعانی سے مطابقت رکھتا ہے۔ روح المعانی میں ہے :
وَكَلَّا اى كل واحد من هؤلاء المذكورين لا بعضهم دون بعضهم فضلنا
بالنبوة على العالمين اى عالمي عصرهم ان میں سے ہر ایک کو
اپنے زمانے میں فضیلت دی گئی ہے۔

یہ حال مراد یہ ہے کہ ہر ایک کو اپنے اپنے زمانہ میں فضیلت دی گئی۔

فَلَا تَكُونَنَّ مِنَ الْمُمْتَرِينَ (پ: ۶)

تو تم ہرگز شک کرنے والوں میں نہ ہونا۔ (فتح محمد)۔
سو تو مت ہوشک کر نیوالوں میں ہے۔ (محمود الحسن)۔
تحقیق سو تو مت ہوشک لانے والا۔ (شاہ عبدالقادر)۔
سو آپ شبہ کرنے والوں میں نہ ہوں۔ (اشرف علی)۔
لہذا تم شک کرنے والوں میں شامل نہ ہوں۔ (مودودی)۔
سو آپ شک کرنے والوں میں نہ ہو جائیں۔ (عبدالماجد)۔
پس مت ہوشک لانے والوں سے۔ (شاہ رفیع الدین)۔
تو اے سننے والے! تو ہرگز شک والوں میں نہ ہو۔ (اعلیٰ حضرت)
یہاں بیان کیا جا رہا ہے کہ وہ لوگ جن کو ہم نے کتاب دی یعنی عبداللہ بن سلام

اور ان کے اصحاب جانتے ہیں کہ بیشک یہ آپ کے رب کی طرف سے حق کے ساتھ نازل کیا گیا ہے تو اے سُننے والے! تو ہرگز شک والوں میں نہ ہو۔

اعلیٰ حضرت کے ترجمہ میں "اے سُننے والے" الفاظ کا اضافہ ہے جس سے پتا چلتا ہے کہ یہ خطاب نبی کریم کو نہیں بلکہ عام مخاطب کو ہے لیکن باقی مترجمین کے تراجم سے پتا چلتا ہے کہ یہ خطاب نبی کریم کو ہے حالانکہ یہ درست نہیں۔ فلا تكون من المتدبرين الشاكين فيه اسمها السلام امدارك اے سُننے والے اس میں ہرگز شک کرنے والوں میں نہ ہو فلا تكون خطاباً لكل واحدٍ والمعنى انه لما ظهرت الدلائل فلا ينبغي ان يمتري في احد قيل هذا الخطاب وان كان في الظاهر للرسول الا ان المراد منه امت (کبیر) یہ خطاب ہر ایک کو ہے معنی یہ ہے کہ جب دلائل ظاہر ہو چکے ہیں کسی ایک کو شک نہیں کرنا چاہیے۔

اور ایک قول یہ کہا گیا ہے۔ اگرچہ ظاہر خطاب نبی کریم کو ہے لیکن مراد آپ کی امت : ويحصل ان يكون الخطاب في الحقيقة للامّة على طريق التعميم وان كان له عليه الصلوة والسلام صيغة (روح المعاني) اگرچہ بظاہر خطاب نبی کریم کو ہے لیکن حقیقتہً بطریق تعمیم خطاب امت کو ہے۔ ان تفاسیر کی رائے سے اعلیٰ حضرت کا ترجمہ ہی مطابقت رکھتا ہے۔ شان مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کا پاسداری ہے۔ باقی ارباب تراجم بصیرت سے خالی۔

وَإِنْ تَطَعُمْ أَكْثَرُ مَنْ فِي الْأَرْضِ يُضِلُّوكَ - الآية (پہ)

اور اگر تو کہنا مانے گا اکثر ان لوگوں کا جو دنیا میں ہیں تو تجھے کو بہکا دیں گے۔ (محمود الحسن)۔

اور اگر تو کہا مانے اکثر لوگوں کا جو دنیا میں ہیں تجھے کو بھلا دیں اللہ کی راہ سے (شاہ عبدالقادر)۔

اکثر لوگ جو زمین پر آباد ہیں (گمراہ ہیں) اگر تم ان کا کہا مان لو گے تو وہ تمہیں

خدا کا راستہ بھلا دیں گے۔ (فتح محمد)۔

• اور دنیا میں زیادہ لوگ ایسے ہیں کہ اگر آپ ان کا کہنا ماننے لگیں تو وہ آپ کو اللہ کی راہ سے بے راہ کر دیں گے۔ (مولانا اشرف علی)۔

• اور اے نبی! اگر تم ان لوگوں کے اکثریت کے کہنے پر چلو زمین میں بستے ہیں تو وہ تمہیں اللہ کے راستے سے بھٹکا دیں گے۔ (مودودی)۔

• اور جو (لوگ) زمین پر آباد ہیں ان میں سے اکثر کا کہنا اگر آپ ماننے لگیں تو وہ آپ کو اللہ کی راہ سے بھٹکا کر رہیں۔ (عبدالمجاہد)۔

• اور اے سُننے والے! زمین میں اکثر وہ ہیں کہ تو ان کے کہنے پر چلے تو تجھے اللہ کی راہ سے بہکا دیں۔ (اعلیٰ حضرت)۔

یہاں اکثر سے مراد کفار ہیں : وان تطعم اكثر من في الارض اى الكفار لانهم الاكثرون مراد کفار ہیں کیونکہ وہ اکثر تھے۔ یہاں خطاب اگر نبی کریم کو ہے جیسے عام تراجم اس پر صراحتہً دال ہیں تو مطلب یہ ہوگا کہ اے نبی کریم! اگر تم کافروں کی اطاعت کرو گے تو راہ راست سے بھٹک جاؤ گے۔ (العیاذ باللہ)۔

یہاں خطاب نبی کریم کو نہیں بلکہ عام مخاطب کو ہے کیونکہ نبی کریم کا کافروں کی تابعداری کرنا اور دین سے بھٹک جانا ممکن نہیں بلکہ خطاب عام مخاطبین کو ہے جیسا کہ اعلیٰ حضرت کے ترجمہ سے ظاہر ہے کیونکہ آپ نے ترجمہ میں "اے سُننے والے" ذکر کیا ہے۔ اور اس خطاب کو عام رکھنے میں اعلیٰ حضرت منفرد نہیں بلکہ علامہ رازی تفسیر کبیر میں اسی کو ذکر کرتے ہیں : اعلم انه تعالى مما اجاب عن شبهات الكفار

شربین بالدلیل صحة نبوة محمد صلى الله عليه وسلم بين ان بعد منوال الشبهة وظهور الحجة لا ينبغي ان يلتفت العاقل الى كلمات

الجهال ولا ينبغي ان يتشوش بسبب كلماتهم الفاسدة فقال وان تطعم اكثر من الارض

يضلوك عن سبيل الله جب اللہ تعالیٰ نے کفار کے شبہات کو زائل کیا اور نبی کریم کی نبوت کی حقانیت

کو بیان فرمایا تو ان کے شہادت کے زوال اور دلائل کے ظہور کے بعد بیان کیا کہ کسی عقل کے مناسب نہیں کہ وہ جاہلوں کی باتوں کی طرف توجہ کرے اور نہ ہی کسی کو ان کے کلمات فاسدہ سے پریشان ہونا مناسب ہے۔ تو فرمایا: **وَإِنْ تَطْمَأَنَّكُمْ** **فِي الْأَمْثَلِ يُضْلِلُكُمْ سَبِيلَ اللَّهِ** یعنی اسے سننے والے عقل کے ہوتے ہوئے اگر تو نے کفار کی بات کو مان لیا تو راہ راست سے بھٹک جائے گا۔ اس تفسیر کو جو علامہ رازی نے کبیر میں پیش فرمائی یا علامہ حضرت نے ترجمہ کیا ہے اس کو ہر صاحب ایمان تسلیم کرے گا لیکن مطلقاً ایسا ترجمہ جس میں خطاب عام بھی نہ ہو اور بالفرض پر بھی مبنی نہ ہوئے عقل کیے قبول کرے۔ اور مولانا مودودی صاحب نے تو اسے ہی ترجمہ کر کے نسبت نبی کریم کی طرف کر کے ظلم عظیم کیا ہے۔

فَلَا تَتَّبِعْ أَهْوَاءَ الَّذِينَ كَذَبُوا بِآيَاتِنَا (پ ۹)

اور نہ چل ان کی خوشی پر جنہوں نے جھٹلایا ہمارے حکموں کو (مولانا محمود الحسن) اور نہ چل ان کی خوشی پر جنہوں نے جھٹلایا ہمارے حکم (شاہ عبد القادر) اور ایسے لوگوں کے باطل خیالات کا اتباع مت کرنا جو ہماری آیتوں کی تکذ کرتے ہیں۔ (مولانا اشرف علی)

اور ہرگز ان لوگوں کی خواہشات کے پیچھے نہ چلنا جنہوں نے ہماری آیات کو جھٹلایا ہے۔ (مودودی)

اور نہ ان لوگوں کی خواہشوں کی پیروی کیجیے جو ہماری آیتوں کو جھٹلاتے ہیں۔ (عبد الما) اور نہ ان لوگوں کی خواہش پر پیروی کرنا جو ہماری آیتوں کو جھٹلاتے ہیں (فتح محمد) تو تو اسے سننے والے ان کی خواہشوں کے پیچھے نہ چلنا۔ (علامہ حضرت)

یہاں بھی حسب ماسبق علامہ حضرت کے ترجمہ میں ”تو اسے سننے والے“ ان الفاظ کا ذکر ہے لیکن باقی تراجم اس سے خالی ہیں۔ باقی تراجم میں نسبت نبی کریم کی طرف ہے۔ نبی کریم کا کافروں کی تابعداری کرنا کیسے متصور ہے جبکہ انبیاء کے کرام محصور ہیں حقیقت یہی ہے

کہ اس سے مراد نبی کریم نہیں بلکہ آپ کی امت ہے۔ والخطاب قیل لکل من یصلح لہ وقیل لیسید المخطبین والامر اامتہ (روح المعانی) یا تو خطاب ہر اس شخص کو ہے جو خطاب کا اہل ہے یا خطاب تو سید الانبیاء کو ہے لیکن مراد آپ کی امت ہی ہے بہر حال دونوں صورتوں میں ترجمہ اسے سننے والے الفاظ کا لانا ضروری ہوتا کہ یہ اشتباہ ہی نہ رہے کہ یہ خطاب نبی کریم کو ہے اور آپ کی شان کے لائق نہیں جب کہ آپ کسی قسم کے گناہ کے مرتکب نہیں ہو سکتے تو کیسے ممکن ہے آپ کو کفار کی خواہشات کی تابعداری کرنا۔

قَدْ أَفْتَرْنَا عَلَى اللَّهِ كَذِبًا إِنْ عُدْنَا فِي مِلَّتِكَ كُرْ بَعْدَ إِذْ نَجَّيْنَاكَ مِنَ الْإِثْمِ (پ ۹)

بے شک ہم نے بہتان باندھا اللہ پر اگر لوٹ آئیں تمہارے دین میں بعد اس کے کہ نجات دے چکا ہم کو اللہ۔ (محمود الحسن)

ہم تو اللہ پر جھوٹا تہمت لگانے والے ہوئے اگر ہم تمہارے مذہب میں آجائیں (عبد الماجد)

اگر ہم اس کے بعد کہ خدا ہمیں اس سے نجات بخش چکا ہے تمہارے مذہب میں لوٹ جائیں تو بے شک ہم نے خدا پر جھوٹا افترا باندھا۔ (فتح محمد) ہم نے جھوٹ باندھا اللہ پر اگر پھر آویں تمہارے دین میں بسبب اللہ ہم کو خلا کر چکا اس سے۔ (شاہ عبد القادر)

ضرور ہم اللہ پر جھوٹ باندھیں گے اگر تمہارے دین میں آجائیں بعد اس کے کہ اللہ نے ہمیں اس سے بچایا ہے۔ (اعلیٰ حضرت)

حضرت شعیب علیہ السلام کی قوم کے سرداروں نے جب ان سے کہا ہم تمہیں اور تمہارے ساتھ ایمان لانے والوں کو اپنی بستی سے نکال دیں گے یا اپنی تبلیغ جھوٹ کر ہماری دین کی طرف آجاؤ۔ ان کے قول کا جواب حضرت شعیب علیہ السلام نے اس طرح

دیکھ جب اللہ نے ہمیں تمہارے دین باطل سے بچایا ہے۔ اس کے بعد پھر بھی اگر تم تمہارے دین کی طرف لوٹے تو اللہ پر جھوٹ باندھیں گے۔

اگر یہاں یہ ترجمہ کیا جائے کہ ہم نے بہتان باندھا یا جھوٹ باندھا اس کا معنی کہ تعلق زمانہ ماضی سے ہے۔ حالانکہ یہ حکم ان عدائی ملت کے پر تعلق ہے جس کا تعلق زمانہ استقبال سے ہے ان القوم لما قالوا ذلک اجاب شعيب عليه السلام عن كلامهم بوجهين الاول قوله (او لو كنا كارهيين) الهمزة للاستفهام والموازاة والحال تقديمه اتعبدون في ملتكم في حال كواهننا ومع كوننا كارهيين الثاني قوله قد افترينا على الله كذبا ان عدنا في ملتكم بعداذننا الله منها والجواب الاول بحرفي معبري الرمز في انه لا يعود الى مستند وهذا الجواب الثاني قصري بما انه لا يفعل ذلك فقال انان فعلنا ذلك فافترينا على الله (كبیر) جب قوم نے شعيب عليه السلام کو اپنے دین کی طرف آنے کے لیے کہا آپ نے ان کو دو طرح سے جواب دیا۔ ایک جواب اولو کنا کارہین سے جس میں ہمزہ استفہام اور واو عالیہ ہے جس کا معنی یہ ہوا کہ کیا ہم تمہارے دین کی طرف تو نہیں ایسے حال میں جب کہ ہم اسے ناپسند کرتے ہیں میطلب یہ ہوا کہ ہم ایسا نہیں کر سکتے کیونکہ ہم تو تمہارے دین کو ناپسند کرتے ہیں۔ دوسرا جواب دیا قد افترينا سے گویا پہلا جواب کتابتہ تھا کہ ہم تمہارے دین کی طرف نہیں آ سکتے۔ دوسرا جواب صراحت ہے کہ ہم تمہارے دین کی طرف نہیں آ سکتے کیونکہ اگر تمہارے دین کو پسند کریں اور اختیار کریں تو یہ اللہ پر جھوٹ ہو گا۔ ہم اللہ پر جھوٹ نہیں باندھتے۔ لہذا تمہارے دین کو بھی ہمیں اختیار کرتے۔

تفسیر کبیر کی اس تفسیر کے بعد سمجھنا آسان ہوا کہ یہاں معنی شرط و جزا کا ہے۔ زمانہ استقبال کے لحاظ سے ہی ترجمہ صحیح ہے۔ ایسا ترجمہ جو ماضی سے متعلق اس سے وہم ہوتا ہے کہ شاید ایسا واقع ہوا حالانکہ نبی سے کافروں کے دین کو اختیار کرنا محال ہے۔

سَحَرُوا أَعْيُنَ النَّاسِ (پ ۳)

باندھ دیا لوگوں کی آنکھوں کو۔ (محمود الحسن)۔

باندھ دیں لوگوں کی آنکھیں۔ (شاہ عبدالقادر)۔

لوگوں کی نظر بندی کر دی۔ (اشرف علی)۔

لوگوں کی نگاہوں پر جادو کر دیا۔ (اعلیٰ حضرت)۔

فرعون نے جادوگر حضرت موسیٰ علیہ السلام کے مقابلہ کے لیے بلائے تھے انھوں نے جب اپنی رسیاں اور لاشعیاں زمین پر ڈال دیں، لوگوں کی آنکھوں پر جادو کر دیا جس سے وہ سمجھنے لگے کہ یہ سناپ ہیں حالانکہ جادو میں کسی چیز کی حقیقت نہیں بدلتی، صرف دوسرے لوگوں کی آنکھوں پر جادو کیا جاتا ہے جس سے لوگ سمجھتے ہیں کہ شاید یہ چیز حقیقتاً بدل گئی حالانکہ ایسا نہیں ہوتا۔

عام طور پر علحضرت کے ترجمہ پر اعتراض کیا جاتا ہے کہ فلاں جگہ پر ترجمہ لغوی اعتبار سے درست نہیں معترضین کی یہاں کیوں آنکھیں بند ہو گئی ہیں جبکہ سحر کا معنی آنکھ باندھنا نظر بند کرنا لغوی معنی نہیں بلکہ لغوی جادو ہے وہی مراد بھی ہے سحر و اعیین الناس صرفوہا عن حقیقتہ ادراک (جلالین) ان جادوگروں نے لوگوں کی نظروں کو حقیقت ادراک سے پھیرا کہ وہ کسی چیز کی حقیقت کو نہ سمجھ سکے : واجتمع بالقائلون بان السحر محض التوہید قال القاضي لو كان السحر حقا لكانوا قد سحروا

قلوبهم لا اعيينهم فثبت ان المراد انهم تخيلوا احوالا عجيبة مع ان الراس في حقیقتہ ما كانو علی وفق ما تخيلوه قال الواحدی بل المراد سحروا اعیین الناس ای قلبوہا عن صحتہ ادراکہا بسبب تلف التوہیدات (کبیر) سحر صرف بناوٹ ملع سازی ہے اسی وجہ سے قاضی نے کہا ہے اگر سحر حقیقت پر مبنی ہوتا تو جادوگران لوگوں کے دلوں پر اثر کرتے نہ کہ آنکھوں پر۔ بظاہر احوال عجیبہ کا تاثر دیا نہ کہ حقیقتاً۔ واحدی نے کہا ہے وہ اپنی ملع سازی کی وجہ سے کسی چیز کی حقیقت

کے ادراک سے پھر دیتے تھے۔ واضح ہوا کہ لوگ دیکھ رہے تھے نہ انکی آنکھیں بند نہ تھیں نہ نظریں البتہ ان کی آنکھوں پر جادو کیا گیا وہ حقیقت کو سمجھنے سے قاصر رہے اور یہی معنی جو حقیقت میں مقصود ہے اور تفاسیر کے مطابق ہے وہ اعلیٰ حضرت کا ہے۔

وَلَا تَتَّبِعْ سَبِيلَ الْمُفْسِدِينَ (پ ۱۰۴)

اور مت چلنا مستوں کی راہ۔ (محمود الحسن)۔

اور فساد یوں کی راہ کو دخل نہ دینا۔ (اعلیٰ حضرت)۔

حضرت ونسی علیہ السلام جب طور پر تواریت لینے کے لیے گئے اور اپنے بھائی حضرت بلال بن علیہ السلام کو اپنی قوم میں پھوڑ کر گئے اور ان کو جو نصیحت کی اسی کا یہ بھی ایک حصہ ہے : وَلَا تَتَّبِعْ سَبِيلَ الْمُفْسِدِينَ وَمِنْ دَعَاكَ مِنْهُ إِلَى الْإِفْسَادِ فَلَا تَتَّبِعْ وَلَا تَنْطَعِ (ادراک) جو تمہیں فساد پھیلانے کی طرف بلائے اس کی تابعداری و اطاعت نہ کرنا یعنی فساد یوں کی راہ کو دخل نہ دینا۔ یہ معنی تو تفصیر کے مطابق اور لغت کے مطابق ہے لیکن مفسدین کا معنی مستوں کو نسی لغت کے مطابق ہے۔

إِنَّ كَيْدِي مَتِينٌ (پ ۱۰۵)

بے شک میرا دؤ پکا ہے۔ (مولانا محمود الحسن)۔ شاہ عبدالقادر)۔

میری چال کا کوئی تور نہیں۔ (مودودی)۔

تحقیق مکر میرا مضبوط ہے۔ (شاریع الدین)۔

بے شک میری خفیہ تدبیر بہت پکی ہے۔ (اعلیٰ حضرت)۔

ذکر یہ کیا جا رہا ہے کہ جو لوگ ہماری آیات کی تکذیب کرتے ہیں ہم لوگوں کو آہستہ آہستہ اس مقام میں داخل کریں گے جو ان کے لیے مقام ہلاکت ہوگا اس لحاظ سے کہ وہ جانتے نہیں ہوں گے ان کو یہ مہلت دینا یہ میری بہت خفیہ تدبیر ہے ان کا شدیدہ داخلہ ہوگا:

أَخَذِي شَدِيدَ سَهْمٍ كَيْدًا لَّأَنَّهُ شَجِيهٌ بِالْكَيدِ مِنْ حَيْثُ أَنَّهُ فِي الظَّاهِرِ

احسان فی الحقیقتہ خذلان (ادراک) معنی یہ ہے کہ میری پکڑ سخت ہوگی چونکہ ظاہر مہلت دینے میں احسان اور حقیقت میں رسوائی، اسی وجہ سے اس کو کید سے مشابہت و مشاکلت ہے لہذا اس گرفت کو کید سے تعبیر کیا گیا ہے۔ معلوم ہوا کہ یہاں حقیقتاً کید معنی داؤ نہیں بلکہ معنی پکڑ اور خفیہ تدبیر کے ہے اور یہی معنی شان ربوبیت کے مناسب ہے۔ انوس کہ توحید کے علمبردار و حدود لاشریک لہ ذات کی شان سے بھی بے خبر ہے جب کہ وہ ذات جملہ عیوب سے پاک ہے اس کی طرف داؤ کی نسبت کا کیا معنی۔ اسی طرح واکید کیدات میں بھی مترجمین نے ٹھوکریں کھائی ہیں۔

وَيَمْكُرُونَ وَيَمْكُرُ اللَّهُ وَاللَّهُ خَيْرُ الْمَكْرِينَ (پ ۱۰۶)

اور وہ بھی داف کرتے تھے اور اللہ بھی داؤ کرتا تھا اور اللہ کا داؤ سب سے بہتر ہے۔ (مولانا محمود الحسن)۔

اور وہ بھی فریب کرتے تھے اور اللہ بھی فریب کرتا تھا اور اللہ کا فریب سب سے بہتر ہے۔ (شاہ عبدالقادر)۔

وہ اپنی چالیں چل رہے تھے اور اللہ اپنی چال چل رہا تھا۔ (مودودی)۔

ادھر تو وہ چال چل رہے تھے اور ادھر خدا چال چل رہا تھا اور خدا سب سے

بہتر چال چلنے والا ہے۔ (فتح محمد)۔

اور مکر کرتے تھے وہ اور مکر کرتا تھا اللہ اور اللہ نیک مکر کرنے والا ہے۔ (شاہ

رفیع الدین)۔

اور وہ اپنا سا مکر کرتے تھے اور اللہ اپنی خفیہ تدبیر فرماتا تھا اور اللہ کی خفیہ تدبیر

سب سے بہتر ہے۔ (اعلیٰ حضرت)۔

اگرچہ اس قسم کی بحث پارہ تین میں گزر گئی تاہم زیادتی وضاحت کے لیے اعادہ کیا

جا رہا ہے۔ اللہ کی طرف داؤ کی نسبت کرنا یا فریب کی اور یہ ترجمہ کرنا کہ اللہ بھی داؤ کرتا تھا

یابہ کہنا کہ اللہ بھی فریب کرتا تھا یہ معانی یقیناً تفسیر کے خلاف ہیں جہاں میں اسی طرح ہے : **وَيُمْكِنُ مِثْلُهُ بِيَهُم بِتَدْبِيرِ أَمْرٍ بَانٍ أَوْ حَى الْيَلْتِ مَا دَبَّرَهُ وَامْرُكٌ بِالْخَوْفِ** ج اسی طرح صاوی کی عبارت اس طرح ہے : **جواب عما يقال ان حقيقة المكنون معاملة على امثلة تعالى لانه الاحتيال على الشيء من اجل حصول العجب عنده واجيب ايضا ان المراد بمكنون الله معاملة الله معاملة المكنون حيث خيب سبحانه وضيع املهم او الواحد جازا هم على مكرهم فسمى المكنون لانه في مقابلة الله تعالى کے مکر سے مراد تدبیر ہے۔ یہ اصل میں ایک سوال کا جواب ہے۔ وہ یہ کہ مکر نسبت حقیقتاً رب کی طرف محال ہے کیونکہ کسی چیز پر جیلہ و مکر اس سے عاجزی کی وجہ سے ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ کا عاجز ہونا محال ہے۔ تو اس کا جواب یہ دیا گیا ہے کہ یہاں مکر سے مراد ان سے مکر والوں کی طرح معاملہ کرنا کہ ان کی کوشش کو رسوا کیا ان کی امیدوں کو ضائع کیا۔ یا مکر سے مراد ہے انکو جزا دینا۔ ہزلے مکر کو مکر سے تعبیر کیا گیا ہے۔**

قُلْ لَا أَمْلِكُ لِنَفْسِي نَفْعًا وَلَا ضَرًّا ۝۱۳۵

آپ کہ دیجیے کہ میں اپنی ہی ذات کے لیے کسی نفع کا اختیار نہیں رکھتا اور نہ کسی ضرر کا۔ (عبدالماجد)۔

اے نبی ان سے کہو کہ میں اپنی ذات کے لیے کسی نفع اور نقصان کا اختیار نہیں رکھتا۔ (مودودی)۔

تو کہ دے کہ میں مالک نہیں اپنی جان کے بھلے اور نہ بُرے کا (مولانا محمود الحسن) کہ دو کہ میں اپنے فائدے اور نقصان کا کچھ بھی اختیار نہیں رکھتا۔ (فتح محمد)۔ آپ کہ دیجیے کہ میں خود اپنی ذات خاص کے لیے کسی نفع کا اختیار نہیں رکھتا اور نہ کسی ضرر کا (اشرف علی)۔

تم فرمادے میں اپنی جان کے بھلے اور بُرے کا خود مختار نہیں۔ (علی حضرت)

اس مقام پر علی حضرت کے ترجمہ پر اعتراض کیا جاتا ہے کہ یہاں آپ خود مختار اور سبور لوس میں اس قسم کی آیت میں "ذاتی" کی زیادتی ہے یہ غلطی ہے، حالانکہ قرآن پاک میں **إِلَّا مَا شَاءَ اللَّهُ** الفاظ مبارکہ خود ہی اس معنی پر دل ہیں کہ ذاتی طور پر آپ مالک نہیں لیکن عطائے الہی سے آپ کو ملکیت حاصل ہے۔ علی حضرت کے معنی کے قریب مولانا اشرف علی صاحب کا معنی بھی نظر آتا ہے کیونکہ آپ نے "میں خود" الفاظ زیادہ دہکے ہیں۔ اب یہ کہا جائے کہ میں خود مختار نہیں یا میں ذاتی طور پر اختیار نہیں رکھتا یا میں خود اختیار نہیں رکھتا، تمام کا مفہوم ایک ہی ہے۔ علی حضرت کے ترجمہ پر اعتراض کرنا اور مولانا اشرف علی صاحب کے ترجمہ پر اعتراض نہ کرنا انصاف سے بعید ہے مراد بھی یہی معنی ہے تفسیر روح المعانی میں ہے : **إِلَّا مَا شَاءَ اللَّهُ** ای الوقت مشیئة سبحانه بان یمكننی من ذلك فاننی حیث یتذمک بعنشیئة یعنی میں اپنی جان کے نفع و نقصان کا مالک نہیں سوائے اللہ تعالیٰ کی مشیت کے جب وہ مجھے اس کی قدرت عطا کرے تو اس وقت میں اس کی مشیت سے مالک ہوتا ہوں۔ اب یہاں سے واضح ہوا کہ نفی ذاتی ملکیت کی ہے نہ کہ عطائی کی بلکہ عطائی کا ثبوت خود قرآن پاک نے پیش کیا ہے۔ اس پر اعتراض کیا اور پریشان ہونے کی کیا وجہ ! اسی طرح تفسیر کبیر میں ہے : **المراد لا املك لنفسي من الضر والنفع الا قدر ما شاء الله ان یفقدنی علیہ یمكننی منه والمقصود من هذا الكلام بیان انه لا یفقد علی شی الا اذا قدر الله علیه مراد یہ ہے کہ میں خود بغیر مشیت ایزدی او اس کی قدرت کے عطا کے نفع و ضرر کا مالک نہیں مقصود اس کلام سے یہ ہے کہ بغیر اللہ تعالیٰ کے قدرت عطا کرنے کے میں کسی چیز پر قادر نہیں۔ اس سے بھی یہ مقصد واضح ہوا کہ نبی کریم خود مختار نہیں ذاتی طور پر نفع و نقصان کے مالک نہیں لیکن جب اللہ تعالیٰ آپ کو قادر کرے تو آپ کو قدرت و ملکیت حاصل ہوتی ہے**

بَرَاءَةٌ مِّنَ اللَّهِ وَرَسُولِهِ إِلَى الَّذِينَ هَدَىٰ اللَّهُ مِنَ الْمُشْرِكِينَ ۝۱۳۶

جواب ہے اللہ کی طرف سے اور اس کے رسول سے ان مشرکوں کو جن سے تم کو ہدایت (شاہ عبدالقادر)

اللہ کی طرف سے اور اس کے رسول کی طرف سے ان مشرکین سے بنیاری ہے جن سے تم نے عہد کر رکھا تھا۔ (اشرف علی)۔

اصاف جواب ہے اللہ کی طرف سے اور اس کے رسول کی طرف سے ان مشرکوں کو جن سے تمھارا عہدہ وانتھا۔ (مجموع الحسن)۔

• (اے اہل اسلام اب) خدا اور اس کے رسول کی طرف سے مشرکوں سے جن سے تم نے عہد کر رکھا تھا نیز اسی (اور جنگ کی تیاری) ہے (فتح محمد)۔

اعلانِ برأت ہے اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے ان مشرکین کو جن سے تم نے معاہدہ کیا ہے۔ (مورودنی)

دست برداری ہے اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے مشرکین کے عہد سے جن سے تم نے عہد کر رکھا تھا (عبدالماجد)۔

بیزاری کا حکم مٹانا ہے اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے ان مشرکوں کو جن سے تمھارا معاہدہ ہوا تھا۔ اور وہ قائم نہ رہے۔ (اعلیٰ حضرت)

الطوخت کا ترجمہ تفاسیر کے مطابق ہے کیونکہ بیزاری کا حکم ان مشرکوں سے دیا گیا جنہوں نے وعدے کو توڑا اور اپنے وعدہ پر قائم نہ رہے کیونکہ بعض وعدہ پر قائم بھی رہے تھے۔

اس پر خود آنے والی آیت میں الا الذین عاہدتم من المشرکین تہلک
 ینقصو کہ شیئا اس قدر

ہوئے تفسیر کبیر میں ہے: قال النجاشی انما جاء الى قوله (يوأنة) والتقدير
يوأنة من انشد ورسوله الى المشركين المعاهددين الامن الذين لم

یستقصو الحمد و ترجاج نے کہا ہے کہ اس استثناء کا اطلاق پر اۃ سے ہے۔
جس کا کلام یہ ہے کہ بیزاری کا حکم ان شرکین سے ہے جنہوں نے وعدہ کیا اور پھر توڑا،

سوائے ان کے جنہوں نے وعدہ نہیں توڑا۔

اب اس بیان کے بعد واضح ہو کہ بیرونی کا حکم عام نہیں بلکہ ان سب سے مخصوص ہے
وعدہ کو توڑا۔ انکو چار ماہ کی مہلت دی گئی اور فرمایا کہ اس کے بعد اگر تم وعدہ پر قائم نہ رہو

تو ہمارے اور تمہارے درمیان تلوار فیصل ہوگی۔ تفسیر مدارک کی عبارت اور زیادہ وضاحت کرتی ہے، وہ یہ ہے: **سروى انهم عاهدوا المشركين من اهل مكة**

و غیر ہر من العرب فقلوا الاناسا منہم وہم بنو حمیر و بنو کنانہ
بیان کیا گیا ہے کہ مسلمانوں کا مشرکین مکہ وغیرہ سے معاہدہ ہوا تھا لیکن مشرکین نے وعدہ

سکو تو پر دیا سوائے چند کے۔ وہ وعدہ کو نہ توڑتے ولے بنو خمرہ اور بنو کنانہ محققے۔ اب واضح ہوا کہ اعلیٰ حضرت کا ترجمہ صحیح مقصد کو واضح کر رہا ہے کیونکہ مقصود ہی یہ بیان کرنا ہے کہ

ان مشرکین سے بیزاری کا حکم ہے جنہوں نے وعدہ کو توڑا۔
خیال ہے کہ یہاں نقض عہد کی وجہ سے بیزاری ہے جو مقید ہے مطلقاً مشرکین

سے بوجہ شرک بیزاری کا ذکر دوسری جگہ ہے تفسیر کبیر میں ہے: لقائل ان يقول
لا فرق بين قوله براءة من الله ورسوله الى الذين عاهدتم

من المشركين وبين قوله ان الله بئى من المشركين ورسوله
فما الفائدة في هذا التكرير یہاں سوال یہ ہوتا ہے کہ ان دونوں آیتوں میں بظاہر

فرق نظر نہیں آتا کیونکہ دونوں جگہ میں اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے
بزراری کا حکم ہے۔ تو مہر نگرار کا کیا فائدہ ؟

اس سوال کے جواب میں کئی وجوہ سے ایک وجہ یہ بیان کی گئی ہے : والوجہ
الثالث فی الضیق انہ تعالیٰ فی الکلام الاول اظهر البراہین عن

المشركين الذين عاهدوا ونقضوا العهد وفي هذه الآية اظهر
البينة عن المشركين من غير ان وصفهم بوصف معين تنبيها على ان

الموجب لهذه البراءة كغيره وشركه دون آیتوں میں فرق
یہ ہے کہ پہلی آیت میں ان مشرکین سے اظہارِ یزاری ہے جنہوں نے وعدہ کیا اور

جس وقت نکالا تھا اس کو کافروں نے (مولانا محمود الحسن)۔

جس وقت اس کو نکالا کافروں نے (شاہ عبدالقادر)۔

جب آپ کو کافروں نے جلا وطن کر دیا تھا۔ (مولانا اشرف علی)۔

جب کافروں نے اسے نکال دیا تھا۔ (مودودی)۔

جب ان کو کافروں نے گھروں سے نکال دیا۔ (فتح محمد)۔

جبکہ ان کو کافروں نے وطن سے نکال دیا تھا۔ (عبدالماجد)۔

جب کافروں کی شرارت سے انہیں باہر تشریف لے جانا ہوا۔ (اعلیٰ حضرت)۔

اس مقام پر نبی کریم کے واقعہ ہجرت کا ذکر ہے۔ ایک ہی بات کو ذکر کرنے کے انداز میں نمایاں فرق ہے۔ اعلیٰ حضرت کے ترجمہ سے ادب احترام کی کرنیں روشن ہیں۔ کیسا خوب ترجمہ ہے کہ ”جب کافروں کی شرارت سے انہیں باہر جانا ہوا“ لیکن اس کے برعکس یہ ترجمہ اس کو کافروں نے نکالا، کس طرح ادب احترام سے کوسوں دور ہے؟ اور اردو محاورہ سے بے خبری۔ کیونکہ اردو میں ادب اور غیر ادب کا لحاظ الفاظ ہی سے سمجھ میں آتا ہے۔ جب تک دل میں محبت مصطفیٰ نہ پائی جائے اس وقت تک یہ لحاظ کرنا کہ ایسے الفاظ استعمال کیے جائیں جن میں تعظیم مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم پائی جائے ممکن نہیں۔

فَتَبَّطَّهْمُ (پ: ۶)

سوروک دیا ان کو۔ (مولانا محمود الحسن)۔

اس لیے ان کو توفیق نہیں دی۔ (اشرف علی)۔

تو ان کو ہلنے چلنے ہی نہ دیا۔ (فتح محمد)۔

تو ان میں کاپلی بھردی (اعلیٰ حضرت)۔

اس مقام پر اعلیٰ حضرت کا ترجمہ تفاسیر کے مطابق ہے۔ یہاں پر غزوہ تبوک کا ذکر ہے کہ (منافقین) جن کا اللہ اور قیامت پر ایمان نہیں اور ان کے دل دین میں شک کرتے ہیں اور وہ اپنے شک میں متردد ہیں وہی غزوہ تبوک سے پیچھے رہنے کی اجازت طلب کرتے ہیں

اگر وہ نکلنے کا ارادہ رکھتے تو اس کی تیاری بھی کرتے یعنی آلات جنگ اور زور و راہ تیار کرتے۔ لیکن اللہ تعالیٰ کو ان کا نکلنا نا پسند ہوا تو ان میں سستی کو بھردیا۔

اعلیٰ حضرت کا ترجمہ ”تو ان میں کاپلی بھردی“ تفاسیر کے مطابق ہے: فَتَبَّطَّهْمُ كَسَلَهُمْ (جلالین) ان کو سست کیا۔ فَتَبَّطَّهْمُ فَكَسَلَهُمْ وَضَعَفَ غَيْتَهُمْ (مدارک) پس ان میں کاپلی کو بھردیا اور انکی رغبت کو ضعیف کیا۔ اگرچہ کاپلی کو روکنا مستلزم ہے لیکن حقیقت مقصود یہی ہے کہ ان میں کاپلی کو بھردیا اور وہ بوجہ کاپلی کے غزوہ تبوک میں حاضری سے رُکے۔

فَيَسْخَرُونَ مِنْهُمْ سَخِرَ اللَّهُ مِنْهُمْ (پ: ۶)

سو ان سے یہ تمسخر کرتے ہیں، اللہ ان سے تمسخر کرتا ہے۔ (عبدالماجد)۔

اور ان لوگوں کا مذاق اڑاتے ہیں جن کے پاس (راہ خدا میں) دینے کے لیے اس کے سوا کچھ نہیں ہے جو وہ اپنے اوپر مشقت برداشت کر کے دیتے ہیں۔ اللہ ان مذاق اڑانے والوں کا مذاق اڑاتا ہے۔ (مودودی)۔

پھر ان پر تھٹھے کرتے ہیں اللہ نے ان سے تھٹھا کیا ہے (محمود الحسن)۔

تو ان سے ہنستے ہیں تو ان سے ہنسی کی سزا دے گا۔ (اعلیٰ حضرت)۔

اس جگہ پر منافقین کا ذکر ہو رہا ہے جب کہ مسلمانوں نے آیت صدقہ کے نزول کے بعد اپنی اپنی طاقت کے مطابق مال پیش کیا تو جن مسلمانوں نے زیادہ مال پیش کیا ان کا منافقین نے استہزاء کیا کہ یہ ریاکار ہیں، اور جن غریبوں نے مقرر مال پیش کیا ان کا تمسخر اڑا کر یہ مقرر سامان لے آئے منافقوں نے تو حقیقتاً مسلمانوں سے ہنسی کی یعنی ان کا تھٹھا کیا۔ لیکن

اے مولانا اشرف علی صاحب اور مولانا فتح محمد صاحب کے ترجمہ میں نفی کا معنی کس حرف نفی کا ہے کیا کوئی حرف نفی پوشیدہ ہے جب یہ نہیں تو نفی کا ترجمہ تمہارے اپنے احوال کے مطابق باطل ہے کیونکہ کسی عربی لفظ کا معنی نہیں۔ ان تراجم کی غلطی پر قلم کو جنبش نہ آئی صرف اعلیٰ حضرت کے ترجمہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو محبوب کہنے میں اتنی پریشانی کیوں آئی ہے؟

اللہ تعالیٰ ان کو بھٹھکا کی جزا دے گا۔ اللہ تعالیٰ کا بھٹھکا کرنا اس کی شان کے خلاف ہے۔ اعلیٰ
 بہمت کے ترجمہ پر ہی تفسیر دال ہیں جاراہم علی سحریتہم (مدارک) ان کو اللہ
 تعالیٰ ان کے سحر کی جزا دیگا۔ جلالین میں بھی اسی طرح عبارت ہے البتہ اس عبارت پر
 حاشیہ یہ ہے: قول جاراہم فسر سحریتہ تعالیٰ بذلت لتزلیہم عنہما
 اللہ تعالیٰ کی سحریت کی تفسیر جزا دے کی گئی ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ بھٹھکا کرتے سے پاک ہے
 اعلیٰ حضرت کے ترجمہ میں یہی فوقیت ہے کہ اللہ تعالیٰ کی شان الوہیت کا لحاظ کیا گیا ہے۔
 افسوس کہ توحید کے علمبردار رب تعالیٰ کی شان کو مد نظر رکھ کر ترجمہ نہ کر سکے اور نہ سمجھ سکے
 کہ اس طرح کا ترجمہ عام اردو خوان کو کتنی ہی دشواریوں میں ڈالے گا۔ ترجمہ کرنے کا مقصد تو
 یہ ہے کہ آسانی پیدا کی جائے نہ کہ مشکل میں پھنسانا۔

تَسْوَا اللّٰهَ فَتَسْبِيْهِمْ (پ ۱۰)

یہ اللہ کو بھول گئے تو اللہ نے انہیں بھلا دیا۔ (مودودی)۔
 انہوں نے خدا کو بھلا دیا تو خدا نے ان کو بھلا دیا (فتح محمد)۔
 بھول گئے خدا کو پس بھول گیا ان کو اللہ۔ (شاہ رفیع الدین)۔
 بھول گئے اللہ کو سو وہ بھول گیا ان کو۔ (نمود الحسن)۔
 وہ اللہ کو چھوڑ بیٹھے تو اللہ نے انہیں چھوڑ دیا۔ (اعلیٰ حضرت)

اس مقام پر اعلیٰ حضرت نے ترجمہ کیا ہے: "وہ اللہ کو چھوڑ بیٹھے تو اللہ نے انہیں چھوڑ
 دیا" جب کہ دیگر مترجمین نے یہ تراجم کیے کہ وہ اللہ کو بھول گئے تو اللہ ان کو بھول گیا
 حالانکہ یہ ترجمہ غلط ہے۔ یہ معتبر ہی نہیں کیونکہ یہاں مجاز مرسل ہے ذکر ملزوم کا ہے مراد
 لازم ہے۔ دونوں جگہ پر معنی بھولنے والا غلط ہے کیونکہ انسان کو بھولنے پر مواخذہ نہیں
 اور اللہ تعالیٰ کا بھول جانا بھی محال ہے وہ خدا ہی کیا جو بھول جائے تفسیر کبیر میں اس
 طرح پیش کیا گیا ہے: تسوا اللہ ففسیہم واعلم ان هذا الكلام لا ي
 اجراء علی ظاہرہ لانا لوجہنا علی الفسیان علی الحقیقۃ فاستحقوا

علیہ ذمالان النسیان لیس فی وسع البشر وایضاً فی حق امثلہ تعالیٰ
 محال فلا بد من التاویل وهو من وجہین الاول معناه انہم ترکوا
 امرہ حتی صار بمنزلۃ المنسی فجاراہم بان صیرہم بمنزلۃ المنسی
 من ثوابہ ورحمتہ وجاء هذا علی اوجہ الكلام کقولہ وجزا سبیئۃ
 سبیئۃ مثلہا التانی النسیان عند الذکر فلما ترکوا ذکر اللہ بالعبادۃ
 والثناء علی امثلہ تولی اللہ ذکرہم بالرحمتہ والافسان وانما حسن جعل
 النسیان لنبیۃ عن ترک الذکر لان من نسی شیئاً لم یذکرہ فجعل اسم الملزوم
 کنایۃ عن الملزوم جانیئہ بے شک اس کلام کو طابہر پر جاری کرنا ممکن نہیں اس
 لیے کہ اگر ہم حقیقتاً نسیان کا معنی لیں تو وہ لوگ مذمت کے مستحق نہیں ہو سکتے کیونکہ نسیان انسان
 کی طاقت میں نہیں۔ اس طرح اللہ تعالیٰ کی شان میں بھی نسیان کا اطلاق محال ہے کیونکہ
 وہ تو بھولنے سے پاک ہے۔ اس لیے یہاں تاویل ضروری ہے وہ تاویل دو طرح ہے۔
 پہلی تاویل یہ ہے کہ انہوں نے اللہ تعالیٰ کے امر کو چھوڑا یہاں تک کہ یہ نیرل بھولنے
 کے ہے۔ رب تعالیٰ کا ان کو جزا دینا یہ رحمت سے بھلا نے کے مترادف ہے۔ یہ کلام اسی
 طرح ہے جیسے دوسرے مقام پر رب تعالیٰ نے جزا سبیئۃ کو سبیئۃ سے تعبیر فرمایا۔ دوسری
 تاویل یہ ہے کہ نسیان ضد ہے ذکر کی جب انہوں نے اللہ تعالیٰ کی عبادت اور اس کی
 ثناء کو چھوڑا تو رب تعالیٰ نے ان کو اپنی رحمت و احسان سے یاد کرنا چھوڑا۔ یہاں نسیان
 کا معنی ترک ذکر ہی اچھا ہے۔ ملزوم کو لازم سے کنایہ بنایا گیا ہے۔

علامہ رازی کے اس بیان کے بعد کوئی شخص بھی جو صاحب علم و دانش ہے اور
 ضد و عناد سے دور ہے اور انصاف کی نظر سے دیکھتا ہو وہ یقیناً اعلیٰ حضرت کے ترجمہ
 کو ہی فوقیت دیگا اور دیگر تراجم میں مترجمین کی بھول اور تفسیر کے اقوال سے عدم توجہ
 کو سمجھ جائے گا۔ افسوس کہ توحید کے دعوے دار خدا کی شان کو بھی سمجھنے سے قاصر
 رہے۔

السَّائِحُونَ ۛ ۛ

بے تعلق رہنے والے۔ (مولانا محمود الحسن، شاہ عبدالقادر)۔

اس کی خاطر زمین میں گردش کرنے والے (مودودی)۔

راہ میں پھرنے والے (شاہ رفیع الدین) روزے والے (الحضرت)

اس مقام پر بھی الحضر کے ترجمہ کو فوقیت حاصل ہے کیونکہ یہی معنی راجح ہے۔

جلالین میں ہے: السَّائِحُونَ الصَّائِمُونَ جلالین کے حاشیہ پر بحوالہ خطیب اس طرح ہے السَّائِحُونَ واختلف في المراد منهم فقال ابن مسعود وابن عباس هم الصائمون قال ابن عباس رضي الله عنهما كل ما ذكر في القرآن من السَّيَاحَةِ فهو الصوم وقال صلى الله عليه وسلم سَيَاحُ امْتِ الصُّومَ وقال عثمان بن مظعون الجهاد في سبيل الله سَيَاحَةً وَقَالَ

عطاء السَّائِحُونَ هم طلاب العلم يعني السَّائِحُونَ سے مراد روزہ دار ہیں۔ اگرچہ اس کی مراد میں اختلاف کیا گیا ہے لیکن حضرت ابن مسعود اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول بھی یہی ہے کہ السَّائِحُونَ سے مراد روزہ دار ہیں بلکہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ قرآن پاک میں جس جگہ بھی سیاحت کو استعمال کیا گیا ہے وہ بمعنی روزہ کے ہی ہے کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے کہ میری امت کا سیاح روزہ ہے۔ البتہ حضرت عثمان بن مظعون رضی اللہ عنہ نے سیاحت سے مراد جہاد فی سبیل اللہ لیا ہے اور حضرت عطاء نے السَّائِحُونَ سے مراد علم کے طلباء لیے ہیں تاہم زیادہ راجح قول حضرت ابن مسعود اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا ہی ہے۔

تفسیر کبیر میں السَّائِحُونَ کا معنی روزہ دار کرنا اچھا کہا گیا ہے اور اسی معنی کے حسن پر

دلائل قائم کئے گئے ہیں تفسیر کبیر میں اس طرح آتا ہے: السَّائِحُونَ فِيهِ اَفْوَالُ

الْقَوْلِ الْاَوَّلِ قَالَ عَامَّةُ الْمُفَسِّرِينَ هُمُ الصَّائِمُونَ وَقَالَ ابْنُ عَبَّاسٍ كُلُّ مَا ذَكَرَ فِي الْقُرْآنِ مِنَ السَّيَاحَةِ فَهُوَ الصِّيَامُ وَقَالَ النَّبِيُّ عَلَيْهِ الصَّلَاةُ

وَالسَّلَامُ سَيَاحَةً امْتِ الصِّيَامَ وَعَنِ الْحَسَنِ اِنْ هَذَا صَوْمُ الْفَرَضِ وَقِيلَ هُمُ الَّذِينَ يَدِيمُونَ الصِّيَامَ وَفِي الْمَعْنَى الَّذِي لَوْ جَدَّ حَسَنُ تَفْسِيرُ السَّائِحِ بِالصَّائِمِ وَجِهَانِ الْاَوَّلِ قَالَ الْاَمْسِيُّ هَرِي قِيلَ لِلصَّائِمِ سَائِحٌ لِاَنَّ الَّذِي يَسِيمُ فِي الْاَرْضِ مِنْ مَتَعِبِدِ الْاَزَادِ مَعَهُ كَانَ مَسْكَاً عَنِ الْاَكْلِ وَالصَّائِمِ يَمْسِكُ عَنِ الْاَكْلِ فَلِهَذَا الْمِثَالُ يَهْتَمُّ بِالصَّائِمِ سَائِحًا۔
المثاني ان اصل السَّيَاحَةِ الاستمرار على الذهاب في الارض كالماء الذي يسيم والصائم يستمر على فعل الطاعة وترك المشتري وهو الاكل والشرب والجماع ^{والوقاع} وعندى فيه وجه آخر وهو ان الانسان اذا امتنع من الاكل والشرب والوقاع وسد على نفسه ابواب الشهوات انفتحت عليه ابواب الحكمة وتجلت له انوار عالم الجلال ولذلك قال عليه الصلوة والسلام من اخلص الله اربعين صباحاً ظهرت ينابيع الحكمة من قلبه على لسانه فيصير من السَّائِحِينَ فِي عَالَمِ جَلَالِ اللَّهِ الْمُتَقَلِّبِينَ مِنْ مَقَامِ الْاِنْ مَقَامٍ وَمِنْ دَرَجَةِ الْاِلٰهِ فِي دَرَجَةِ الْاِلٰهِ سَيَاحَةً فِي عَالَمِ الْاَرْوَاحَانِيَّاتِ السَّائِحُونَ فِي كَيْفِ اقْوَالٍ هِيَ عام تفسيري کے نزدیک روزے والے ہیں۔ حضرت ابن عباس نے فرمایا، قرآن پاک میں جس جگہ بھی سیاحت ذکر ہے اس سے مراد روزہ ہی ہے۔ حضرت حسن فرماتے ہیں اس سے مراد فرضی روزہ ہے اور بعضوں نے کہا اس سے مراد ہمیشہ روزہ میں ہونا ہے۔ سائح کی تفسیر روزہ سے کرنے میں دو طریقے سے حسن پایا جاتا ہے ایک یہ کہ ازبہری فرماتے ہیں روزہ دار کو سائح کہا گیا ہے اس لیے کہ جو شخص زمین میں عاجزانہ طور پر متوکل ہو کر چلے، اس کے پاس زاد براہ نہ ہو، کھانے پینے سے رکاوٹ ہے اس کو سائح کہتے ہیں۔ روزہ دار بھی چونکہ کھانے پینے سے اپنے آپ کو روک کر رکھتا ہے اسی مشابہت کے پیش نظر اس کو سائح کہتے ہیں۔

دوسری وجہ حسن یہ ہے کہ اصل سیاحت کا مطلب یہ ہے کہ زمین پر ہمیشہ چلنا جس

طرح پانی ہمیشہ چلتا ہے چونکہ روزہ دار بھی فعل طاعت پر ہمیشگی کرتا ہے کیونکہ وہ خواہ
یعنی کھانے پینے، جماع سے دور رہتا ہے اس لیے روزہ دار کو سناج کہا گیا ہے۔
علامہ رازی فرماتے ہیں، میرے نزدیک ایک وجہ اور بھی ہے وہ یہ ہے کہ انسان جب
کھانے پینے اور جماع سے رک جاتا ہے تو گویا وہ اپنے نفس پر خواہشات کے دروازے بند کر
دیتا ہے۔ جب وہ خواہشات کے دروازے بند کر دیتا ہے اللہ تعالیٰ اس پر حکمت کے دروازے
کھول دیتا ہے اور اس پر عالم جلال کی تجلیات منور ہوتی ہیں۔ اسی وجہ سے نبی کریمؐ نے
فرمایا، جو شخص اللہ تعالیٰ کی رضا مندی کی خاطر اپنے آپ کو چالیس صبح وقف کرتا ہے اس
کے دل سے اس کی زبان پر حکمت کے چشمے ظاہر ہوتے ہیں پس وہ شخص ساتحین سے ہو
جاتا ہے۔ ساتحین وہ ہیں جو اللہ تعالیٰ کے عالم جلال میں ایک مقام سے دوسرے مقام پر منتقل
ہوتے ہیں اور ایک درجہ سے دوسرے درجہ پر منتقل ہوتے ہیں پس اس شخص کو عالم اراح میں
ساحت کا مقام حاصل ہوتا ہے اسی وجہ سے روزہ دار کو سناج کہا گیا ہے کہ وہ بھی اسی
طرح ایک مقام سے دوسرے مقام پر منتقل ہوتا ہے جس طرح سناج ایک مقام سے دوسرے
مقام پر منتقل ہوتا ہے۔

اب اندازہ کیا جائے کہ ساتحون کا معنی روئے والے کتنا اچھا تفسیر کے مطابق ہے
اور اس کے حسین ہونے پر کس طرح دلائل قائم کئے گئے ہیں۔

ثُمَّ اسْتَوَىٰ عَلَى الْعَرْشِ (پ ۶)

پھر تخت سلطنت پر جلوہ گر ہوا۔ (مودودی)۔

پھر قائم ہوا اوپر عرش کے۔ (شاہ رفیع الدین)۔

پھر قائم ہوا عرش پر۔ (مولانا محمود الحسن)۔ (شاہ عبدالقادر)۔

پھر عرش پر قائم ہوا (مولانا اشرف علی)۔

پھر تخت (شاہی) پر قائم ہوا۔ (فتح محمد)۔

پھر عرش پر استواء فرمایا۔ (اعلیٰ حضرت)۔

یہ آیت کریمہ اصل میں متشابہات کی اس قسم سے ہے جن کا بظاہر معنی معلوم ہوتا ہے
لیکن مقصد حقیقی معلوم نہیں ہوتا اس لیے جو معنی بظاہر معلوم ہوتا ہے اس کو پیش کرنا عام
آدمی کو الجھن میں ڈالنے کے مترادف ہے اس لیے کہ جب علمی نکات سے بے خبر انسان
فقط اردو ترجمہ کا سہارا لیتے ہوئے علمیت کا دعوے دار پڑھے گا وہ یقیناً یہی سمجھے گا
کہ اللہ تعالیٰ نے عرش پر قیام فرمایا حالانکہ یہ درست نہیں۔ آئیے انحضرت کے ترجمہ کو
تفاسیر کے آئینہ میں دیکھیں۔ جلالین میں ہے: استواء یلیق بہ استواء فرمایا جو اس
کی شان کے لائق ہے۔ اس پر حاشیہ اس طرح ہے: استواء یلیق بہ ہذہ طریقۃ
السلف المفروضین وطریقۃ الخلف التوالین ان المراد بالاستواء الاستیلاء
والنصرف وفي الکرخی فی استواء یلیق بہ یشیر بہ الی ان الاستواء
علی العرش صفة له سبحانه بلا کیف ومعناه انه سبحانه استولی علی
العرش علی الوجه الذی عناء منزها عن التمكن واللاستقرار
والیضا ظاہر الایۃ یدل علی انه تعالیٰ اما استوی علی العرش
بعد خلق السموات والارض لان کلمۃ تحرک تراخی وذلک یدل
علی انه تعالیٰ کان قبل العرش غنیاً عن العرش فلما خلق العرش
امتنع ان ینقلب حقیقۃ وذاتہ عن الاستغناء الی الحاجة فوجب ان
یبقى بعد خلق العرش غنیاً عن العرش ومن کان کذلک امتنع
ان یکون مستقراً علی العرش فثبت بما ذکر انہ لا یمکن حمل
ہذہ الایۃ علی ظاہر ہا بل انما ہذا البیان جلالة ملک
وجلالة سلطانہ بعد بیان عظمتہ شانہ ووسعتہ
قدسہ بما مر من خلق ہاتیلک الاجرام العظام ۱۲ ج
استواء جو اللہ تعالیٰ کی شان کے لائق ہے یہ قول سلف صاحبین کا ہے جو اس قسم
کی آیات کا علم اللہ ہی کی طرف تفویض کرتے ہیں اور متاخرین جو آیات کی تاویل کرتے ہیں
ان کے نزدیک استواء سے مراد غلبہ اور تصرف ہے۔ اور کرخی میں ہے کہ استواء جو اس کے

لائق ہے اس سے مراد یہ کہ اللہ تعالیٰ کا استوار عرش پر بلا کیف ہے بمقصد اس کا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا عرش پر استوار اس طرح ہے کہ وہ اس پر ٹمکن ہونے اور قرار پکڑنے سے پاک ہے۔ اور ظاہر آیت اس پر بھی دال ہے کہ اللہ تعالیٰ کا استوار عرش بر زمین و آسمان کی تخلیق کے بعد ہوا اس لیے کہ کلمہ تم تراخی کے لیے آتا ہے اور یہ اس پر دلالت کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ تخلیق عرش سے قبل عرش سے بے پرواہ تھا جب عرش کی تخلیق ہوئی تو اس کے بعد بھی ضروری ہے کہ اللہ تعالیٰ اس سے بے پرواہی ہے اس لیے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات کا حاجت سے بے پرواہ ہونے کی حقیقت کا انقلاب منع ہے پس ضروری ہے کہ تخلیق عرش کے بعد بھی اللہ تعالیٰ عرش سے بے پرواہ ہی ہے۔

اس سے واضح ہوا کہ آیت کریمہ کو ظاہر پر کھنا ممکن نہیں بلکہ یہ اللہ تعالیٰ کے ملک و سلطنت کا بیان ہے جب کہ پہلے اس کی عظمت شان اور وسعت قدرت کا بیان ہے۔ اب اس سے خود بخود واضح ہو جاتا ہے کہ قیام حتیٰ کرنا درست نہیں بلکہ استوار ہوا اس کی شان کے لائق ہے یہی مناسب ہے۔

تفسیر کبیر میں ہے: ان هذا ايوبهم كونه تعالى مستقرا على العرش
یہاں وہم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے عرش پر قیام فرمایا، اس کے جواب میں اگرچہ بسیط
کلام کی گئی لیکن لب لباب یہ ہے: هذا الایة لا یمکن حملها علی الظاهر
یہ آیت ظاہر پر محمول نہیں ہو سکتی کہ یہ معنی لیا جائے کہ عرش پر قیام کپڑا یا قیام کیا۔

قُلِ اللّٰهُ اَسْرَعُ مَكْرًا (پ ۶)

کہ دے اللہ سب سے جلد بنا سکتا ہے جیلے (مولانا محمود الحسن)۔

تو کہ اللہ سب سے جلد بنا سکتا ہے جیلے۔ (شاہ عبدلغفار)۔

کہ دو خدا بہت جلد جیلے کرنے والا ہے۔ (فتح محمد)۔

اللہ بہت کرنے والا ہے مکر۔ (شاہ رفیع الدین)۔

ان سے کہو اللہ اپنی چال میں تم سے زیادہ تیز ہے۔ (مودودی)۔

فرما دو اللہ کی خفیہ تدبیر سب سے جلد ہو جاتی ہے۔ (اعلیٰ حضرت)

اللہ تعالیٰ کی شان کے لائق مکر و جیلے نہیں۔ اسی وجہ سے مفسرین نے اس کو مجاز پر محمول کیا ہے۔ جلالین نے مکر کی تفسیر مجازات سے کی ہے یعنی جزائے مکر کو مکر سے تعبیر کیا ہے۔ روح البیان میں ہے اسرع مکر ای اعجل عقوبۃ یعنی اللہ تعالیٰ کی طرف سے جزا جلدی دی جاتی ہے۔ اسی طرح تفسیر کبیر میں ہے قل اللہ اسرع مکرًا فالضحیٰ ان هؤلاء الذخاری لما قابلوا نعمة الله بالمكر۔ فان الله سبحانه وتعالى قابل مكرهم بمكر اشده من ذلك وهو من وجهين الاول ما اعد لهم يوم القيمة من العذاب الشديد وفي الدنيا من المضیحة والخزي والاسكال۔ والثانی ان رسل الله یكتبون مكرهم ویحفظونہ وتحرص علیهم مافی لبواطنهم الخبیثۃ یوم القيمة ویكون ذلك سببا للمضیحة التامة والخزی والاسكال نحوذ
بأسئله تعالى منه یعنی کفار نے جب اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا مکر سے مقابلہ کیا پس اللہ تعالیٰ نے ان کے مکر کا شدید طور پر مقابلہ کیا۔ اللہ کی طرف مکر کی نسبت دو وجہ سے ہے۔ پہلی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے قیامت میں شدید عذاب تیار کیا ہے اور دنیا میں رسوائی اور ذلت، عذاب ان کے لیے تیار کیا ہے۔ اور دوسری وجہ یہ ہے کہ اللہ کے ملائکہ ان کے مکر کو صحف میں لکھ کر محفوظ کر لیتے ہیں اور قیامت کے دن ان کی نجاست باطنی کو ان پر پیش کر دیا جائے گا اور یہ ان کے لیے کامل ذلت و رسوائی ہوگی۔ اللہ کی پناہ اس سے!

اب اس تقریر کے بعد واضح ہوا کہ اللہ تعالیٰ مکر نہیں فرماتا بلکہ اس کی خفیہ تدبیر ہے کہ ان کو عذاب دیگا، قیامت کے دن ان کو رسوا کرے گا۔ اب دیکھا جائے گا کہ یہ ترجمہ بہتر ہے کہ اللہ جلدی جیلے کرتا ہے یا یہ معنی درست ہے کہ اللہ کی خفیہ تدبیر سب سے جلدی ہو جاتی ہے؟ یقیناً وہی معنی درست ہے جو اللہ تعالیٰ کی شان کے لائق ہے۔ اللہ تعالیٰ جب مکر و فریب سے پاک ہو تو اس کو مکر کا کہنا، جیلے باز، چال چلنے والا کہنا

کسی طرح بھی درست نہیں۔

وَاجْعَلُوا بُيُوتَكُمْ قِبْلَةً (۱۰۰)

اور اپنے مکانوں کو قبلہ ٹھہراؤ۔ (مورودی)۔

اور بناؤ اپنے گھر قبلہ رو۔ (مولانا محمود الحسن)۔

اور بناؤ اپنے گھر قبلہ کی طرف۔ (شاہ عبدالقادر)۔

اور کرو گھروں اپنوں کو رو بہ قبلہ۔ (شاہ رفیع الدین)۔

اور اپنے گھروں کو نماز کی جگہ کرو۔ (اعلیٰ حضرت)۔

یہ حضرت موسیٰ اور ہارون علیہما السلام کو حکم ہے، قوم کو کہو کہ مصر میں تم مکانات بناؤ اور گھروں کو نماز کی جگہ بناؤ۔ اعلیٰ حضرت کا ترجمہ ہے، گھروں کو نماز کی جگہ بناؤ اور دوسرے تراجم میں گھروں کو قبلہ کی طرف بناؤ۔ لیکن اسی مقام پر بھی تفاسیر اعلیٰ حضرت کے ترجمہ کی فوقیت پر دل میں جلالین میں ہے: واجعلوا بیوتکم قبلۃ

مصلی تصلون فیہ لتامنوا من الخوف وکان فرعون منعہم من الصلوۃ اپنے گھروں کو نماز کی جگہ بناؤ اور ان میں نماز ادا کرو تاکہ تم خوف سے امن میں رہو کیونکہ فرعون ان کو نماز سے روکتا تھا۔ تفسیر کبیر میں اگرچہ تین قول بیان کئے گئے ہیں لیکن اس کے بعد ان کی اپنی بحث اسی قول کو راجع کر رہی ہے: من الناس من قال المیراث البیوت المساجد بعض نے کہا ہے کہ بیوت سے مراد مساجد ہیں۔ پھر آگے اسی قول کی وضاحت کرتے ہوئے یہ فرمایا واللہ ان قولہ واجعلوا بیوتکم قبلۃ ای اجعلوا بیوتکم مساجد تستقبلنہا لاجل الصلوۃ تم اپنے گھروں کو مسجدیں (نماز کی جگہ) بناؤ۔ نماز کے لیے ان کی طرف متوجہ ہو۔

اس کے بعد اس واقعہ کی وجہ بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں ذکر المفسرون فی کیفیت هذه الواقعة وجوها ثلاثة الاول ان موسیٰ علیہ السلام ومن معہ کانوا فی اول امرہم ماسورین بآب

وصلوا فی بیوتہم خفیۃ من الکفرۃ **فیرسل علیہم فیؤذوہم ویقتلونہم عن دینہم** کما کان المؤمنون علی **ہذہ الحالۃ فی اول الاسلام فی مکۃ والثانی قیل** **لما ارسل** **موسیٰ الیہا** **مرفوعون** **بتخریبہا** **ساجد** **اسرائیل** **ومنعہم من الصلوۃ** **فامرہم** **ان یسجدوا** **لتعالجات** **میتخذوا** **مساجد فی بیوتہم ویصلوا فیہا** **فما من فرعون** **الثالث** **ان تعالیٰ لما ارسل موسیٰ الیہم** **فما من** **تلك العداوة الشدیدة** **امرا** **موسیٰ** **وقومہما** **بالتخاذل** **المساجد** **عن** **اللہ** **والتکفل** **تعالیٰ** **ان یسجدوا** **عن شر الاعداء**۔ **مفسرین** نے اس **آیت** کی **کیا** **بیئت** میں **تین** **وجوہ** **بیان** کی ہیں:-

پہلی ان میں سے یہ ہے کہ موسیٰ علیہ السلام **الاول** سے متعلق **آیت** کو **اول** وقت میں یہ حکم تھا کہ وہ اپنے گھروں میں کافروں سے مخفی ہو کر **آیت** کو **اول** غلاب اگر ایذا نہ پہنچائیں اور دین کی وجہ سے فتنہ میں مبتلا نہ کریں۔ یہ حکم موسیٰ علیہ السلام کو ایسے ہی تھا جس طرح مسلمانوں کو **اول** اسلام میں مکہ مکرمہ میں حکم تھا۔ دوسرا قول یہ ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو **رب اللہ تعالیٰ** نے قوم کی طرف مبعوث فرمایا تو فرعون نے مساجد کو برباد کرنے کا حکم دیا اور ان کو نماز سے منع کیا تو اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو مساجد گھروں میں بنانے کا حکم دیا کہ وہ **قرآن** کے **آیت** کی وجہ سے ان میں نماز ادا کریں۔

تیسرا قول یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو **الاول** طرف مبعوث فرمایا تو فرعون نے عداوت شدیدہ کا اظہار کیا۔ **اللہ تعالیٰ** نے موسیٰ علیہ السلام کو **اول** اسلام اور ان کی قوم کو حکم دیا کہ وہ مساجد بنائیں تاکہ **قرآن** میں **آیت** کے **آیت** کی

حفاظت فرمائے گا اور دشمن کے شر سے بچائے گا۔

اب نینوں وجہ سمجھنے کے بعد یہ بات سمجھنی مشکل نہیں رہی کہ گھروں کو نماز کی جگہ بنانے کا حکم دیا۔ صرف گھروں کو قبلہ رو بنانے سے یہ مقصد حاصل نہیں ہوتا کہ ان میں نماز بھی ادا کی جائے۔ اعلیٰ حضرت کے ترجمہ میں بھی کمال ہے کہ آپ نے کسی مقام پر بھی تفاسیر کے راجح قول کو نہیں چھوڑا بلکہ راجح قول کے مطابق ہی ترجمہ کیا۔

وَمَا مِنْ دَابَّةٍ فِي الْأَرْضِ إِلَّا عَلَى اللَّهِ رِزْقُهَا (۶)

- اور زمین پر کوئی چلنے پھرنے والا نہیں مگر اس کا رزق خدا کے ذمہ ہے (فتح محمد)
- زمین پر چلنے والا کوئی جانور ایسا نہیں ہے جس کا رزق اللہ کے ذمے نہ ہو (مودودی)
- اور کوئی نہیں چلنے والا زمین پر مگر اللہ پر ہے اس کی روزی (مولانا محمود الحسن)
- اور کوئی نہیں پاؤں چلنے والا زمین پر مگر اللہ پر ہے اس کی روزی (شاہ عبد القادر)
- اور کوئی جاندار زمین پر ایسا نہیں کہ اللہ کے ذمہ اس کا رزق نہ ہو (عبد الماجد)
- اور کوئی جاندار جسے زمین پر چلنے والا نہیں کہ اس کی روزی اللہ کے ذمہ نہ ہو۔ (اشرف علی)
- اور زمین پر چلنے والا کوئی ایسا نہیں جس کا رزق اللہ کے ذمہ کرم پر نہ ہو۔ (اعلیٰ حضرت)

یہاں اعلیٰ حضرت کے ترجمہ میں ذمہ کرم کے الفاظ ہیں۔ باقی تراجم میں اللہ پر یا اللہ کے ذمہ۔ اعلیٰ حضرت کے ترجمہ میں لفظ کرم کی زیادتی ہے۔ وہ کیوں؟ اس کی وجہ کیا ہے؟ اس لیے کہ یہاں ایک سوال ہوتا ہے تو اس کا جواب دیا گیا ہے تفاسیر نے سوال و جواب سے جس مسئلہ کو حل کیا ہے اسی کو اعلیٰ حضرت نے لفظ کرم زیادہ کر کے حل فرما دیا۔ تفسیر کبیر میں ہے: تعلق بعضهم بانه يجب على الله تعالى بعض الاشياء بهذه الآية وقال ان كلمته على الوجوب وهذا يدل على ان افعال البرئيات الى الدابة واجب على الله وجوابه انه واجب بحسب الوعد

والفضل والاحسان یعنی بعض حضرات نے اسی آیت سے استدلال پیش کیا ہے کہ بعض چیزیں اللہ پر واجب ہیں کیونکہ انھوں نے یہ کہا ہے کہ لفظ علی وجوب کے لیے آتا ہے اور یہ دلالت کرتا ہے کہ ہر جان دار کو رزق پہنچانا اللہ پر واجب ہے۔

اس کا جواب یہ دیا گیا ہے کہ اللہ نے اپنے وعدہ کے مطابق فضل احسان سے اپنے ذمہ لیا ہے نہ کہ اس پر کوئی چیز اضطراراً واجب ہے۔ اسی وجہ سے مدارک نے بھی تفسیر لا وجوب سے تفسیر کی ہے کہ اللہ نے اپنے فضل کی وجہ سے اپنے ذمہ ہر جان دار کی روزی کو لیا ہے نہ کہ بوجہ واجب ہونے کے۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ پر کوئی چیز واجب نہیں۔ تفسیر روح المعانی میں بھی تقریباً اسی طرح بیان کیا گیا جس طرح کبیر میں ہے اگرچہ الفاظ مختلف ہیں۔

اب تفاسیر نے جس مسئلہ کو سوال و جواب کی صورت میں پیش کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ پر کوئی چیز واجب نہیں بلکہ اس نے اپنے فضل کی وجہ سے اپنے ذمہ لیا ہے۔ اسی مسئلہ کو اعلیٰ حضرت نے لفظ کرم زیادہ کر کے حل فرما دیا کہ یہاں علی وجوب کے لیے نہیں بلکہ اللہ نے اپنے کرم کی وجہ سے اپنے ذمہ لیا ہے۔ اسی طرح ۱۵۱ میں دکان حقا علینا نصیر المؤمنین کے ترجمہ میں بھی مترجمین نے غلطی کی۔

فَإِنَّا نَسْخَرُهُمْ كُفْرًا (۷)

- تو ہم ہنستے ہیں تم سے۔ (مولانا محمود الحسن)۔ (شاہ عبد القادر)۔
- تو ہم تم پر ہنستے ہیں۔ (اشرف علی)
- تو ہم بھی تم پر ہنس رہے ہیں۔ (مودودی)
- ہم بھی تم پر ہنس رہے ہیں (عبد الماجد)۔
- ایک وقت ہم تم پر ہنسیں گے۔ (اعلیٰ حضرت)
- یہاں اعلیٰ حضرت کے ترجمہ میں ہے "ہم تم پر ہنسیں گے" اور باقی تراجم میں ہے ہم ہنستے ہیں یا ہنس رہے ہیں۔ اعلیٰ حضرت کے ترجمہ میں استقبال کا ذکر ہے۔ باقیوں میں

حال بہ حضرت نوح علیہ السلام کے کشتی بنانے کا ذکر ہوا ہے کہ نوح علیہ السلام کشتی بنا رہے تھے اور آپ کی قوم آپ کا تمسخر اڑا رہی تھی۔ آپ نے فرمایا کہ اگر تم ہم پر ہنستے ہو تو ایک وقت ہم تم پر ہنسیں گے۔ خود قرآن پاک کے سیاق و سباق سے بھی یہی سمجھ آتا ہے اور تفاسیر کا رجحان بھی اسی طرف ہے۔ جلالین میں اذ نجونا وغرقتم جب ہم نجات پائیں گے اور تم غرق ہو گے۔ ان کا ہنسا کشتی بنانے کے وقت تھا اور آپ کا ان کے غرق سے متعلق تھا: فاننا نسخر منكم عند ربنا وبنو الهالك كما تسخرون منا عند ربنا وبنو الفلک ہم تم پر ہنسیں گے تمہاری ہلاکت کو دیکھ کر جیسے تم ہم پر ہنسیں رہے ہو کشتی کو دیکھ کر۔

روح المعانی میں ہے: ان تسخروا منا في الدنيا فاننا نسخر منكم في الآخرة وقيل في الدنيا عند الخرق وفي الآخرة عند الحرق یعنی اگر تم ہم پر دنیا میں ہنس رہے ہو تو ہم تم پر آخرت میں ہنسیں گے۔ یا ہم تم پر دنیا میں ہنسیں گے جب تم غرق ہو گے اور آخرت میں ہنسیں گے جب تم آگ میں جلو گے۔ تفسیر کبیر میں اگرچہ تین قول ہیں لیکن زیادہ تر پہلا قول ہی باقی تفاسیر کے مطابق ہے اور قرآن پاک کے سیاق و سباق کے مطابق ہے۔ وغیرہ وجوہ الاول التقدیر ان تسخروا منا في هذه الساعة فاننا نسخر منكم سخرية مثل سخریتکم اذا وقع علیکم الخرق في الدنيا والخری في الآخرة اس میں کئی وجہیں ہیں (تین وجہیں ہیں)۔ پہلی وجہ یہ ہے کہ اگر تم اس وقت ہم سے ہنستے ہو تو ہم تم سے ہنسیں گے تمہاری ہنسی کی طرح جب تم دن میں غرق ہو گے اور آخرت میں رسوا ہو گے۔ زیادہ طور اسی ترجمہ کو مناسب سمجھا گیا ہے اور یہ قول ہی راجح ہے۔

قَالَ يَقَوْمُ هَؤُلَاءِ بَنَانِي هُنَّ أَظْهَرُ لَكُمْ (پ: ۱۳)

ان سے کہو بھائیو یہ میری بیٹیاں موجود ہیں یہ تمہارے لیے پاکیزہ ہیں (مودود)

کہا اے قوم میری یہ بیٹیاں میری وہ بہت پاکیزہ واسطے تمہارے۔ (ش: رفیع الدین)۔

یولاء، اے قوم یہ میری بیٹیاں حاضر ہیں یہ پاک ہیں تم کو ان سے (محمود الحسن)۔ (شاہ عبدالقادر)۔

لوط فرمانے لگے کہ اے میری قوم یہ میری بیٹیاں موجود ہیں وہ تمہارے لئے خاصی ہیں۔ (اشرف علی)۔

بولے اے میری قوم یہ میری بیٹیاں (بھی تو موجود ہیں) یہ تمہارے حق میں پاکیزہ ہیں۔ (عبدالماجد دریا آبادی)۔

کہا اے قوم یہ میری قوم کی بیٹیاں ہیں یہ تمہارے لیے ستھری ہیں (الحضرت) اس مقام پر لوط علیہ السلام کا ذکر کیا جا رہا ہے جب کہ آپ کے پاس فرشتے آئے جو ان کی قوم کو عذاب دینے کے لیے آئے تھے لیکن وہ خوبصورت حسین شکلوں میں آئے تھے اور آپ کی قوم کو لو اطمینان کی عادت تھی جب ان کی قوم کو پنا چلا کہ لوط علیہ السلام کے پاس حسین ترین لڑکے آئے ہوئے ہیں وہ دوڑتے ہوئے اپنے بڑے اراکے لے کر آئے تو لوط علیہ السلام نے اپنی قوم سے کہا کہ اے میری قوم یہ میرے مہمان ہیں تم مجھے میرے مہمانوں میں رسوا نہ کرو بلکہ یہ میری قوم کی بیٹیاں دلتا می عورتیں تمہارے لیے ستھری ہیں یعنی ان سے مجامعت کرنا تمہارے لیے حلال ہے۔

آپ نے یہ نہیں فرمایا کہ یہ میری اپنی اصلی بیٹیاں (معاذ اللہ) تمام کے لیے پاک ہیں۔ اس مقام پر حضرت کا ترجمہ تفاسیر کے مطابق ہے اور اللہ کے نبی کی شان کے لائق ہے جب کہ دیگر تراجم سے یہ پنا چلتا ہے کہ لوط علیہ السلام نے اپنی بیٹیوں کے متعلق کہا۔ اگرچہ ایک یہ قول ملتا ہے کہ آپ نے اپنی بیٹیوں کے متعلق کہا کہ تمہان سے نکاح کر لو لیکن یہ قول مختلف بحثوں کی وجہ سے مرجوح ہو گیا۔ آپ کی بیٹیاں دو تھیں بنات جمع ہے دو بیٹیاں پوری قوم کے لیے کیے کیا صرف اس قوم کے دو سردار مراد تھے یا کہ پوری قوم کیا کافروں سے نکاح جائز تھا؟ تفسیر روح المعانی میں ہے: اخراج ابوالشبح

عن ابن عباس وابن ابی حاتم عن ابن جبر و مجاهد وابن ابی الدنبا وابن
عساکر عن السدی ان المراد ببناتہ علیہ السلام نساء امتہ
والاشارة جبرمولاہم لتزویلہن منزلة الماحضہ عنہ و اضافتہن
الیہ لان کل نبی اب لامتہ و فی قرآۃ امین مسعود رضی اللہ
عنہ النبی اولی بالمؤمنین من انفسہم و هو اب لہم و ازواجہ
امہاتہم و قد ابی رضی اللہ عنہ مثل ذلك لکنہ قدیم و ازواجہ امہاتہم علی ہر
اب لہم ابو الشیخ نے ابن عباس سے بیان کیا ابن ابی حاتم سے ابن جبر سے اور مجاہد نے
اور ابن ابی الدنبا نے اور ابن عساکر نے سدی سے روایت کیا ہے کہ یہاں لوط علیہ السلام
نے جو بنات کا ذکر کیا ہے اس سے مراد آپ نے اپنی قوم کی عورتیں لی ہیں ہولاء سے
اشارہ ان کو بمنزل حاضر کے سمجھ کر کیا اور ان کی اضافت اپنی طرف کی اور بتائی کہ اس
سے مراد یہ ہے کہ ہر نبی اپنی امت کے باپ کی حیثیت رکھتا ہے کیونکہ حضرت ابن مسعود
کی قرأت میں ہے : النبی اولی بالمؤمنین من انفسہم و هو اب لہم
وانما واجہ امہاتہم نبی مومنوں کے ان کی جان سے زیادہ مالک ہیں کیونکہ وہ ان کے
باپ ہیں اور ان کی بی بیائیں ان کی مائیں ہیں حضرت ابی کی قرأت میں بھی اسی طرح ہے
لیکن اس میں وازواجہ امہاتہم پہلے ہے اور ہواب لہم بعد میں ہے ۔
اعلیٰ حضرت نے جو ترجمہ کیا ہے علامہ رازی نے اس کو ہی پسند کیا ہے اور اپنے
مختار پر دلائل قائم کیے ہیں تفسیر کبیر کی عیادت ملاحظہ ہو :

قال یقوم ہولاء بناتی ہن اطہر لکم ففیہ قولان قال
قتادہ المراد بناتہ لصلبہ وقال مجاہد و سعید بن جبیر المراد
نسائہ امتہ لانہن فی انفسہن بنات و لہن اضافۃ الیہ بالمتابعۃ
و قبول الدعویۃ قال اہل النحویۃ کفی فی حسن الاضافۃ ادنی
سبب لانہ کان نبیا لہم فکان کالاب لہم قال تعالیٰ و انما واجہ
امہاتہم و هو اب لہم و هذا القول عندی هو المختار و یدل علیہ

وجہ الاول ان اقدام الانسان علی عرض بناتہ علی الاویباش
والفجاسا امر متعبد لا یلیق باہل المروۃ فکیف باکابر الانبیاء
الثانی . و ہوانہ قال ہولاء بناتی ہن اطہر لکم فبناتہ اللواتی من صلبہ
لا تکفی للجمع العظیم اما نسائہ ففیہن کفایۃ للکل . الثالث . انہ
صحت الروایۃ انہ کان لہ بفتان و ہما زنتا و نہ عوسا و اطلاق لفظ
البنات علی البناتین لا یجوز لہما ثبت ان اقل الجمع ثلاثہ

یعنی حضرت لوط علیہ السلام کی اس کلام ہولاء بناتی ہن اطہر لکم
میں دو قول ہیں۔ قتادہ نے کہا اس سے مراد آپ کی اپنی حقیقی بیٹیاں مراد ہیں لیکن مجاہد
اور سعید بن جبیر نے کہا ہے کہ اس سے مراد آپ کی امت کی عورتیں مراد ہیں اس لیے کہ
وہ آپ کی بیٹیاں ہی تھیں۔ ان کو اپنی طرف قبول دعوت اور متابعت کی وجہ سے منسوب
کیا۔ اس لیے کہ نحو یوں کا ضابطہ یہ ہے کہ حسن اضافت میں ادنیٰ مناسبت کافی ہے اس
لیے کہ آپ ان کے نبی تھے اور نبی اپنی امت کا باپ ہوتا ہے کیونکہ قرآن پاک میں آتا ہے :
وانما واجہ امہاتہم نبی کی بی بیائیں ان کی مائیں ہیں لہذا نبی ان کے باپ ہوئے۔
علامہ رازی فرماتے ہیں، یہی قول میرے نزدیک مختار ہے۔ اس قول کے مختار ہونے
پر کئی وجوہ دال ہیں :-

پہلی وجہ یہ ہے کہ انسان کا اپنی بیٹیوں کو وراثتوں اور فاسقوں فاجروں پر
پیش کرنا یہ بہت بعید ہے۔ اہل مروت کے لائق نہیں۔ اکابر انبیاء یہ کام کیسے کر سکتے
ہیں۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ آپ نے فرمایا ہولاء بناتی
ہن اطہر لکم اپنی حقیقی بیٹیاں اتنی عظیم جماعت کو کافی نہیں ہو سکتی تھیں۔
البتہ امت کی عورتیں ان تمام کو کافی ہو سکتی تھیں۔

تیسری وجہ یہ ہے کہ صحیح روایت ہے کہ آپ کی دو بیٹیاں ہیں، ایک کا نام زنتا
دوسری کا نام زعورہ ہے۔ لفظ بنات کا اطلاق (بالحقیقت) دو بیٹیوں پر صحیح نہیں کیونکہ
جمع کے کم از کم تین فرد ہوتے ہیں۔

اب علامہ رازی کی اس تفسیر کے بعد اور اپنے مختار قول پر دلائل قائم کرنے کے بعد
 اعلیٰ حضرت کے ترجمہ کی فوقیت بہت روشن ہو گئی اور پتا چلا کہ اعلیٰ حضرت نے ترجمہ کرتے وقت
 تفسیر کے اقوال اور ان میں راجح اور مرجوح اقوال کو ذہن میں رکھا اور راجح قول کو پیش
 کیا۔ اسی وجہ سے آپ کی بصیرت اور دقت نظر قابلِ صد ستائش ہے۔
 اسی طرح مترجمین نے ہدیٰ لاہوتی ان کنتم فاعلمین پ ۱۲ ع
 میں بھی غلطی کی۔

إِنَّ آبَانَا لَفِي ضَلَالٍ مُّبِينٍ (پ ۱۲ ع)

- بے شک ہمارے باپ تو بالکل بہک گئے ہیں۔ (عبدالماجد)۔
- کچھ شک نہیں کہ ابا صریح غلطی پر ہیں۔ (فتح محمد)۔
- تحقیق باپ ہمارا البتہ بیچ غلطی ظاہر کے ہے۔ (شاہ رفیع الدین)۔
- البتہ ہمارا باپ صریح خطا پر ہے۔ (مولانا محمود الحسن)۔
- البتہ ہمارا باپ خطا میں ہے صریح (شاہ عبدالقادر)۔
- واقعی ہمارے باپ کھلی غلطی میں ہیں (اشرف علی)۔
- سچی بات یہ ہے کہ ہمارے ابا جان بالکل ہی بہک گئے ہیں۔ (مودودی)۔
- بے شک ہمارے باپ صراحتاً ان کی محبت میں ڈوبے ہوئے ہیں (اعلیٰ حضرت)۔
- حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائیوں نے جب یہ کہا کہ ہمارے باپ یوسف علیہ
 السلام اور ان کے بھائی سے زیادہ محبت کرتے ہیں حالانکہ ہم طاقت والے ہیں حضرت
 یعقوب علیہ السلام کے زیادہ محبت کرنے کو انھوں نے ان ابنا لفی ضلال مبین
 سے تعبیر کیا۔

اعلیٰ حضرت نے ادبِ احترام پر مبنی ترجمہ کیا کہ ہمارے باپ انکی محبت میں ڈوبے
 ہوئے ہیں ہماری طرف توجہ کم کرتے ہیں۔ لیکن دوسرے مترجمین نے ترجمہ میں خطا
 اور غلطی کی نسبت کی ہے کہ ہمارے باپ خطا پر ہیں غلطی پر ہیں، بہک گئے ہیں۔ بظاہر یہ

یہ نسبت درست نہیں۔ اسی وجہ سے تفسیر کبیر میں اس کو اعتراض و جواب کی شکل میں درج کیا
 گیا ہے۔ (السوال الثالث)۔ انهم نسبوا اباہم الى الضلال المبين وذلك
 مبالغه في الذم والطعن ومن بالغ في الطعن في الرسول كفر لا سيما اذا
 كانت الطاعن ولدا فان حق الابوة يوجب مزيد التعظيم
 والجواب المراد منه الضلال عن رعاية المصالح في الدنيا
 لا البعد عن طريق الرشاد والصواب۔

سوال یہ ہوتا ہے کہ یعقوب علیہ السلام کے لڑکوں نے اپنے باپ کو ضلال مبین کی
 طرف کیسے منسوب کیا۔ یہ تو مذمت اور طعنہ ہیں مبالغہ ہے اور جو شخص اللہ کے رسول میں
 طعنہ میں مبالغہ کرے وہ کافر ہے (حالانکہ وہ مومن تھے) پھر باپ ہونے کا حق اور
 زیادہ تعظیم کا سبب ہوتا ہے اولاد کس طرح طعنہ زن ہو سکتی ہے۔
 اس کا جواب یہ ہے کہ راہِ راست اور حق سے دوسری کو ضل سے تعبیر نہیں کیا۔
 اب مطلب واضح ہوا کہ ان کا مقصد یہی تھا کہ ہمارے باپ ان کی محبت میں ڈوبے ہوئے
 ہیں اور ہماری طرف توجہ کم کرتے ہیں۔ ایک ہی مقصد کو دو مختلف طریقوں سے پیش
 کیا گیا کیونکہ ایک ترجمہ ادبِ احترام پر دال ہے اور دوسرے تراجم میں اس مقصدِ عظیم کا
 خیال نہیں کیا گیا اور ایسے تراجم کئے گئے ہیں جو صراحتاً بے ادبی پر دال ہیں۔

وَلَقَدْ هَمَّتْ بِهٖ وَهَمَّ بِهَا لَوْلَا اَنْ رَّاٰی بُرْهَانَ رَبِّهٖ (پ ۱۲ ع)

اور البتہ عورت نے فکر کیا اس کا ادا اس نے فکر کیا عورت کا۔ اگر نہ ہوتا یہ کہ
 دیکھتے قدرت رب اپنے کی۔ (مولانا محمود الحسن)۔

اور اس عورت نے ان کا قصد کیا اور انھوں نے اس کا قصد کیا اگر وہ اپنے
 پروہگار کی نشانی نہ دیکھتے (فتح محمد)۔

اور تحقیق قصد کیا اس عورت نے ساتھ یوسف کے اور قصد کیا یوسف نے
 ساتھ اس کے اگر نہ دیکھ لیتا دلیل اپنے رب کی۔ (شاہ رفیع الدین)

اور البتہ عورت نے فکر کی اس کی اور اس نے فکر کی عورت کی اگر نہ ہوتا یہ کہ دیکھی قدرت اپنے رب کی۔ (شاہ عبدالقادر)۔

• اور اس عورت کے دل میں تو ان کا خیال جم ہی رہا تھا اور ان کو بھی اس عورت کا کچھ خیال ہو چلا تھا۔ (مولانا اشرف علی)۔

• اور اس (عورت) کے دل میں ان کا خیال جم ہی رہا تھا اور انھیں بھی اس (عورت) کا خیال ہو چلا تھا اور اگر اپنے پروردگار کی دلیل کو نہ دیکھ لیا ہوتا (عبداللہ)۔ بے شک عورت نے اس کا ارادہ کیا اور وہ بھی عورت کا ارادہ کرتا اگر اپنے رب کی دلیل نہ دیکھ لیتا۔ (اعلیٰ حضرت)۔

اس مقام پر حضرت یوسف علیہ السلام کا ذکر ہوتا ہے جب کہ ان کو عزیز مصر کی عورت نے کمرے میں بند کر کے دروازے بند کر دیے اور اپنی خواہشات کو پورا کرنے کا ارادہ کیا لیکن یوسف علیہ السلام نے معاذ اللہ کہہ کر اس سے براہ کا اظہار کیا اور دل میں کسی قسم کا بُری خواہشات کا ارادہ نہ کیا۔ یہی مقصد اعلیٰ حضرت کے ترجمہ سے واضح ہے کہ آپ اگر اپنے رب کی دلیل نہ دیکھ لیتے تو اس عورت کا ارادہ کرتے لیکن آپ نے اپنے رب کی دلیل دیکھ لی لہذا کوئی ارادہ نہ کیا۔ لیکن بخلاف اس کے باقی تراجم میں یہ بات موجود نہیں جو اللہ کے نبی کی شان پر دال ہو بلکہ باقی تراجم سے یہ سمجھ میں آتا ہے کہ جس طرح عورت کی فکر تھی اسی طرح آپ نے بھی فکر کی۔ عورت کی فکر تو ظاہر ہے کہ وہ اپنی خواہشات نفسانیہ کو ناجائز طریقہ سے پورا کرنا چاہتی تھی۔ اگر معاذ اللہ آپ نے بھی اس عورت کی فکر تو اس کا مطلب یہ ہو گا کہ آپ نے بھی ناجائز طور پر خواہشات کو پورا کرنے کی فکر کی۔ یہ شان نبی کے لائق نہیں۔ اسی طرح یہ بھی نبی کی شان سے دُور ہے کہ نبی نے کچھ کچھ بُرائی کا خیال کیا ہو یا ارادہ کیا ہو جب کہ عورت نے مکمل طور پر اپنا خیال جمائے رکھا ہو۔ کچھ کچھ بُرائی کا خیال بھی عصمتِ انبیائے کرام کے منافی ہے۔

اب اعلیٰ حضرت کے ترجمہ کی تائید میں اقوالِ مفسرینِ کرام دیکھیں تفسیرِ حبل میں ہے: وفي السمين لولا سؤيته برهان سبه فهم بهما لکن امتنع

هم بهما لوجود سؤيته برهان سبه فلم يحتصل منه هه النية كقولك لولا سؤيته لآكرمتك فالعن ان الاكرام امتنع لوجود سؤيته وبهذا يتخلص ان الاشكال الذي يورده هنا وهو كيف يليق بنبي ان يهتم بامرأة اور سمين میں آتا ہے: اگر آپ اپنے رب کی دلیل نہ دیکھتے تو اس عورت کا خیال کرتے لیکن آپ نے اپنے رب کی دلیل دیکھ لی تھی تو اس کے پائے جانے کی وجہ سے آپ سے اس عورت کا ارادہ دور ہی رہا۔ آپ نے خیال تک نہ کیا جیسا کوئی کہے لولا سؤيته لآكرمتك اسی مثال میں معنی یہ ہو گا کہ اگر اہم نہیں یا گیا بوجہ زید کے پائے جانے کے یعنی زید کے موجود ہونے کی وجہ سے متکلم نے مخاطب کی تعظیم و تکریم نہیں کی۔ پس کہتے ہیں کہ اسی اشکال سے وہ اشکال مندرج ہو گیا جو وارد ہوتا تھا کہ نبی کی شان کے کس طرح لائق ہے کہ وہ ایک عورت سے برائی کا ارادہ کرے۔

اب اس تقریر سے واضح ہے کہ نبی نے ارادہ کیا ہی نہیں کیونکہ پہلے رب کی دلیل دیکھی تفسیرِ کبیر میں ہے: ان يوسف عليه السلام كان بريئاً عن العمل الباطل والهم المحرم وهذا قول المحققين عن المفسرين والمتكلمين وجه نقول وعنه نذب. واعلم ان الدلائل الثلاثة على وجوب عصمة الانبياء عليهم السلام كشيرة۔ بے شک حضرت یوسف علیہ السلام برے اعمال اور پاک ارادوں سے پاک ہیں۔ یہی قول محققین مفسرینِ کرام اور متکلمین کا ہے۔ اور علامہ رازی کہتے ہیں کہ ہم بھی اس کے قائل ہیں اور اس کی حمایت کرتے ہیں اور اس پر جو اعتراضات وارد ہوتے ہیں ان کو مندرج کرتے ہیں اس لیے کہ انبیائے کرام کی پاک دامنی پر کثیر دلائل موجود ہیں تفسیرِ کبیر میں یہ بھی آتا ہے: ومثل هذا المعصية لو نسبت الى افسق خلق الله تعالى وابعدهم عن كل خير لاستنكف منه فكيف يجوز اسنادها الى الرسول عليه الصلوة والسلام المويّد بالمحجرات القاهرة الباهرة۔

ایسی معصیت کو (یعنی زنا کا ارادہ کرنا) اگر اللہ تعالیٰ کی مخلوق میں سے کسی بہت

بڑے فاسق کی طرف منسوب کیا جائے اور اسی طرح ایسے شخص کی طرف اس قسم کی برائی کو منسوب کیا جائے تو وہ بھی شرم محسوس کرے تو ایک جلیل القدر رسول جن کو عظیم الشان معجزات عطا کیے گئے ہوں ان کی طرف اس قسم کے گناہ کو کیسے منسوب کیا جاسکتا ہے۔ اس سے آگے اور تفصیل بیان فرماتے ہوئے یہ تحریر کرتے ہیں واعلم ان الذين لهم تعلق بهذه الواقعة يوسف عليه السلام وتلك المرأة وروجها والنسوة والشهود ورجال العالمين مشهود ببرائته عن الذنب والبلية اقرب ببرائته ايضا عن المحصنة - واذا كان الامر كذلك فينبغي لم يبق للمسلم توقف في هذا الباب بے شک جن کا اس واقعہ سے تعلق ہے یوسف علیہ السلام اور وہ عورت اور اس کا خاوند اور عورتیں اور گواہ اور اللہ رب العالمین (ان تمام) نے آپ کے متعلق شہادت دی ہے کہ آپ گناہوں سے بری ہیں یہاں تک کہ شیطان نے بھی آپ کی برائت کی شہادت دی ہے۔ جب اس طرح آپ کی برائت پر اتنی گواہیاں موجود ہیں تو مسلمان کو اس میں توقف کرنے کا کوئی حق حاصل نہیں: اما بيان ان يوسف عليه السلام ادعى البرائة عن الذنب فهو قوله عليه السلام هي سراودتني عن نفسي وقوله عليه السلام رب السجون احب الي من ما يدعونني اليه حضرت يوسف علیہ السلام نے خود اپنے آپ کو گناہوں سے بری ہونے کا دعویٰ کیا اور کہا کہ (اس عورت) نے خواہش کی کہ میں اپنی حفاظت نہ کروں۔ اسی طرح آپ نے فرمایا کہ اے میرے رب مجھے قید خانہ زیادہ پسند ہے اس کام سے (برائی سے) جس کی طرف مجھے یہ بلاتی ہے۔ یوسف علیہ السلام کے یہ ارشادات آپ کی پاکدامنی پر دلالت ہیں واما بيان ان المرأة اعترفت بذلك فلا ريب قالت للنسوة ولقد سراودتني عن نفسي فاستعصموا ايضا قالت الآن حصص الحق اناسا ودته عن نفسي وانه لم يمت المصادق بين اس عورت نے خود حضرت یوسف علیہ السلام کے بری ہونے کا اعتراف کیا جبکہ اس نے عورتوں کے سامنے اعتراف کیا کہ میں نے اسے اپنی طرف مائل کرنا

چاہا لیکن اس نے اپنے آپ کو سچا لیا۔ اسی طرح اس نے یہ بھی کہا اب بات کھل گئی کہ میں نے ان کو اپنی طرف مائل کرنا چاہا لیکن بیشک وہ سچے ہیں۔ عورت کی اس گواہی کے بعد واضح ہوا کہ اس نے بھی حضرت یوسف علیہ السلام کو بری الذمہ قرار دیا: واما بيان ان تخرج المرأة اقرب بذلك فهو قوله انه من كيدكس عظيم يوسف اعرض عن هذا واستغفر لي لذنبك اس عورت کے زبج نے یہ کہا یہ تم عورتوں کا مکر ہے بے شک عورتوں کا مکر بہت بڑا ہوتا ہے۔ اے یوسف تم اس کا خیال نہ کرو اور اے عورت تو اپنے گناہوں کی معافی مانگ۔ یہ یوسف علیہ السلام کی پاکدامنی پر اس عورت کے خاوند کی گواہی ہے۔ واما الشهود فقوله شهدا شاهد من اهلها ان كان قميصه قد من قبل فصدقت وهو من الكاذبين الخ یعنی حضرت یوسف علیہ السلام کے بطل عمل اور حرام کام کے ارادہ سے بری ہونے پر گواہ کی گواہی ثابت ہے کیونکہ شیر خوار بچہ کی یہ شہادت ہے کہ اگر حضرت یوسف علیہ السلام کی قمیض آگے سے پھٹی ہے تو عورت سچی ہے اور وہ غلطی پر ہیں اور اگر آپ کی قمیض پیچھے سے پھٹی ہے تو آپ سچے ہیں اور عورت جھوٹی ہے۔ آپ کی قمیض تو پیچھے سے ہی پھٹی ہوئی تھی لہذا آپ کی برائت پر گواہی ثابت ہو گئی۔ گواہ بھی وہ جو اسی عورت کے خاوندان سے ہے اور ابھی شیر خوار بھی ہے اسی وجہ سے اس عورت کے خاوند نے عورت کو مکار کہا جس کا پہلے ذکر ہو چکا۔ واما شهادة امثله تعالى بذلك فقوله كذلك لنصرف عنه السوء والفحشاء انه من عبادنا المخلصين - فقد شهد الله تعالى في هذه الآية على طهارته اربع موآت اولها قوله لنصرف عنه السوء والفحشاء واللام للتاكيد والمبالغة والثاني قوله والفحشاء اي ذلك لنصرف عنه السوء والفحشاء - والثالث قوله انه من عبادنا مع انه تعالى وعباد الرحمن الذين يمشون على الارض هونا واذا خاطبهم الجاهلون قالوا سلاما والاربع قوله المخلصين وفيه قرينة ثالثة ناسرة باسم الفاعل واخرى

باسم المفعول فوسم بالفاعل يدل على كونه انبيا بالطاعات
والغفريات مع صفة الاخلاص ووسم المفعول يدل على ان
الله تعالى استخلصه لنفسه واصطفاه لحضرتہ رسولی کلہ الوجہین
فانه من ادل الالفاظ علی کونہ منہا عما اضاعوا
الیہ

یوسف علیہ السلام کے بری ہونے کی شہادت دی۔ ہم اس طرح ان سے برائی اور بے حیائی
کو دور رکھیں۔ بیشک وہ ہمارے مخلص بندوں سے ہے۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت یوسف
علیہ السلام کے پاک ہونے کی جو شہادت اس آیت میں دی ہے وہ چار مرتبہ ہے۔ پہلی
ان میں سے یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا لنصرف عنه السوء یہاں لازم تاکید
اور مبالغہ کے لیے آتا ہے۔ آپ سے برائی کا دور رہنا یقین ہو گیا۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے والفحشاء ذکر کیا یعنی کذلک لنصرف
عنه السوء والفحشاء جب اللہ تعالیٰ نے بے حیائی کو دور رکھنا اپنے ذمہ کر لیا ہے
تو اب برائی کا ارتکاب یا اس کا خیال کرنا ناممکن ہو گیا۔

تیسری وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا انه من عبادنا کہ وہ
میرے خاص بندوں سے ہے۔ اور اللہ تعالیٰ نے اپنے خاص بندوں کی تعریف اس طرح فرمائی
”اللہ کے وہ بندے جو زمین پر آرام سے چلتے ہیں جب ان سے جاہل کوئی بات کرتے ہیں
تو وہ کہتے ہیں پس سلام۔“ اس سے پتا چلا کہ جس کو اللہ تعالیٰ نے اپنا بندہ کہا وہ مزکب
قباح نہیں ہو سکتا۔

چوتھی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ”المخلصین“ اس میں دو قرأتیں ہیں یا
اسم فاعل ہے اور یا اسم مفعول۔ اگر اسم فاعل ہو تو معنی یہ ہوگا کہ آپ طاعات و قربات پر
مخلص سے عمل کرنے والے ہیں اور اگر اسم مفعول ہو تو مطلب یہ ہوگا کہ آپ کو اللہ تعالیٰ نے
اپنی ذات کے لیے خالص بنایا اور اپنے حضور پسندیدہ کیا۔ دونوں وجہ آپ کی برأت
پر کامل طور پر دل ہیں وامامیان ان ابلیس اخر بطہارتہ خلا نہ قال۔

فبعزتک لا غوینہم اجمعین الا عبادک منهم المخلصین فاقربانہ
لا یمکننا غواء المخلصین ویوسف من المخلصین لقولہ تعالیٰ انه
من عبادنا المخلصین فکان هذا اقرا من ابلیس بانہ ما اغواء
وما اضلہ عن طریقتہ الہدی

ابلیس نے بھی حضرت یوسف علیہ السلام کی پاکبازی کا اقرار کیا اس لیے کہ اللہ تعالیٰ
سے جب اس نے ٹہلت مانگی اس کو قیامت تک مہلت دے دی گئی۔ اس نے کہا اے
اللہ مجھے تیری عزت کی قسم! میں سوائے تیرے مخلص بندوں کے تمام کو گمراہ کرتا رہوں گا تو
اس کا یہ اقرار اس بات کو واضح کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے مخلص بندوں کو راہِ راست سے
بھٹکانا شیطان کے لیے ممکن نہیں۔ اور یوسف علیہ السلام کا مخلصین سے ہونا بھی یقین
ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو مخلصین میں سے ہونے کی شہادت دی اور فرمایا

بے شک وہ (یوسف علیہ السلام) میرے مخلص بندوں سے ہیں۔
تو گو یا کہ ابلیس کا اقرار ثابت ہو گیا کہ اس نے یوسف علیہ السلام کو نہ بھٹکایا اور نہ ہی بدراہ
کیا۔ و عندہذا نقول هؤلاء الجہال الذین نسبوا الی یوسف علیہ
السلام هذه الفضيحة ان كانوا من اتباع دين الله تعالى فليقبلوا
شهادة الله تعالى على طهارتهم وان كانوا من اتباع ابليس
وجنده فليقبلوا شهادة ابليس على طهارتهم

اس مفصل تقریر کے بعد علامہ رازی فرماتے ہیں جو جہلار یوسف علیہ السلام کی
برائی (یا ارادہ برائی) کی طرف نسبت کرتے ہیں اگر وہ اللہ کے دین کے شیع ہیں وہ اللہ کی
شہادت کو قبول کر لیں جو اللہ نے آپ کی پاک دامنی پر دی ہے۔ اور اگر وہ شیطان اور اس
کے لشکر کے شیع ہیں تو وہ شیطان نے آپ کی پاک دامنی پر جو شہادت دی ہے اسے قبول
کر لیں۔

اس تقریر کی ابتداء پر نظر ڈالیں تو آپ کو پتا چل جائے گا کہ علامہ رازی نے آپ کو
برائی اور برائی کے خیال اور ارادے سے پاک تسلیم کیا ہے اور اسی پر مفصل دلائل

ہیں۔ اور پھر آگے زیادہ واضح طور پر فرماتے ہیں لا تسلموا ان یوسف علیہ السلام ہم بہا والدلیل علیہ انہ تعالیٰ وہم بہا لولا ان سما آئی برہان بہ وجواب لولا ہمہنا مقدم و ہو کہما ینقال قد کنت من المہاکلین لولا ان فلا نہا خلصت ہم یہ تسلیم نہیں کرتے کیونکہ یوسف علیہ السلام نے بُرائی کا ارادہ کیا ہو، کچھ کچھ خیال کیا ہو۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد میں وہم بہا لولا ان سما آئی برہان رب۔ لولا کا جواب مقدم ہے جیسے کہ کہا جاتا ہے :
قد کنت من المہاکلین لولا ان فلا نہا خلصت اگر فلاں شخص تجھے نہ چھڑانا تو ہلاک ہو جاتا۔ مطلب یہ کہ تو ہلاک نہیں ہو کہ فلاں نے تجھے چھڑا لیا۔ اسی طرح یہاں بھی یہ ہے کہ دلیل رب کا طرف سے پائی گئی۔ لہذا آپ نے ارادہ فرمایا ہی نہیں۔ علامہ رازی نے بہت فصل بحث کی ہے کئی اعتراضات کے جواب بھی دیئے لیکن اسی پر اکتفا کیا جاتا ہے۔ یہ بحث بھی اگرچہ طویل ہو گئی لیکن واضح یہ کرتا تھا کہ علحضرت نے کس طرح تفاسیر کے رائج قول کے مطابق ترجمہ کیا ہے اور کیسے ہی شان نبوت کا نطق کیا۔ یہ اللہ کی عطا ہے جسے چاہے نواز دے۔

وَأَنَا خَيْرُ الْمُنْزِلِينَ (پ ۱۴)

- اور خوب طرح اتارتا ہوں۔ (شاہ عبد القادر)۔
- اور خوب طرح اتارتا ہوں مہمانوں کو۔ (مولانا محمود الحسن)۔
- اور میں سب سے بہتر مہمان نواز ہوں۔ (اعلیٰ حضرت)۔

یہاں ذکر ہے یوسف علیہ السلام کا جب آپ کے بھائی غلہ لے کر واپس آنے لگے تو آپ نے فرمایا کہ آئندہ تم اپنے سوتیلے بھائی کو بھی ساتھ لانا جس کو تم ساتھ نہیں لائے۔ تو ان کے ساتھ آپ نے جو تبلیغ کی وہ ترغیب و ترہیب پر مبنی تھی۔ ترغیب والے حصہ میں یہ فرمایا کہ کیا تم دیکھتے نہیں ہو کہ میں تمہیں پورا غلہ عطا کرتا ہوں اور سب سے بہتر مہمان نواز ہوں یعنی تمہاری بہتر طریقہ سے مہمان نوازی کرتا ہوں۔ علحضرت

سما ترجمہ یہی ہے عقل کا تقاضا بھی یہی ہے کہ خوب طرح اتارنے کو بہتر مہمان نوازی مستلزم نہیں البتہ خوب طرح مہمان نوازی کو خوب طرح اتارنا مستلزم ہے۔ تفسیر کبیر نے اسی معنی کو پسند کیا ہے، فرماتے ہیں وانا خیر المنزلین ای خیر المضیفین لان حین انزلہم احسن ضیافتہم یعنی میں سب سے بہتر مہمان نواز ہوں اس لیے کہ جب بھی ان کو اتار تو ان کی اچھی مہمان نوازی کی۔

وَأَنَا الْفَاعِلُونَ (پ ۱۵)

- اور ہم کو یہ کام کرنا ہے۔ (مولانا محمود الحسن)۔

- اور ہمیں یہ ضرور کرنا ہے۔ (اعلیٰ حضرت)۔

حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائیوں نے ان کے پاس اپنے بھائی کو لانے کا وعدہ کیا تو کہا کہ ہم نے یہ کام ضرور کرنا ہے معنی ضرور لانا ہے مولانا محمود الحسن صاحب نے ترجمہ میں تاکید کو استعمال نہیں کیا حالانکہ کلام مؤکد ہے۔ لفظ ان، لام تاکید جملہ اسمیہ تمام تاکید پر دل ہیں لیکن علحضرت نے ترجمہ میں اس کا خیال رکھا۔

تفسیر مدارک میں ہے : وَأَنَا الْفَاعِلُونَ ذلک لا محالۃ لا تنصطط فیہ ولا نتوانی۔ ہم نے یہ کام ضرور کرنا ہے : نہ ہم اس میں کوئی کوتاہی کریں گے اور نہ مستثنیٰ روح المعانی میں بھی اسی طرح ہے۔

كَذَلِكَ كَذَّبَ نَالِیُوسُفَ (پ ۱۶)

- یوں داؤ بتا دیا ہم نے یوسف کو۔ (شاہ عبد القادر)، (مولانا محمود الحسن)۔
- ہم نے یوسف کو یہی تدبیر بتائی۔ (اعلیٰ حضرت)۔

یہاں علحضرت کا ترجمہ تفاسیر کے مطابق ہے اور شان الوہیت کا لحاظ کیا گیا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ داؤ یا مکر نہ کرتا ہے نہ سکھاتا ہے۔ تفسیر روح المعانی میں ہے : کذنا لیسف ای صنعنا رد بنی لاجل تحصیل غرضہ من

المقدمات التي ساتبها من دس السقاية وما يتلوه فالكيد مجاز لغوي في ذلك والا فحقيقة وهي ان توهم غيرك خلاف ما تخفيه تريد على ما قالوا حال عليه لى
يعنى ہم نے یوسف علیہ السلام کو تذبیر سکھائی کہ وہ کس طرح اپنے بھائی کو اپنے پاس رکھ سکتے ہیں۔ پیالہ ان کے سامان میں رکھنا پھر کچھ دوسرے مل کے سامان کی تلاش میں لینا۔ یہ ساری تذبیریں اللہ تعالیٰ نے آپ کو سکھائیں۔ کید کا مجازی معنی مراد ہے حقیقی معنی تو لینا ممکن نہیں کیونکہ حقیقی معنی یہ ہے کہ باطن میں کچھ اور ظاہر کچھ اور۔ اور یہ اللہ تعالیٰ کے حق میں محال ہے کہ خود اس پر عمل کرے یا سکھائے

إِنَّكَ لَفِي ضَلَالٍ قَدِيمٍ (پ ۱۶۶)

- تو تو اپنی اسی قدیم غلطی میں ہے۔ (مولینا محمود الحسن)۔
- تو ہے اپنی اسی غلطی میں قدیم کی۔ (شاہ عبد القادر)۔
- (لوگوں نے) کہا بخدا آپ تو اپنے اسی قدیم وہم میں مبتلا ہیں (عبدالماجد)۔
- اس قدیم غلطی میں مبتلا ہیں۔ (فتح محمد)۔
- تو البتہ بیج وہم اپنے قدیم کے ہے (شاہ رفیع الدین)۔
- آپ تو اپنے اسی پرانے غلط خیال میں مبتلا ہیں (اشرف علی)۔
- آپ اپنی اسی پرانی خود رفتگی میں ہیں۔ (الحضرت)

جب حضرت یوسف علیہ السلام نے اپنے آپ کو بھائیوں پر ظاہر فرمادیا اور قمیص دی کہ اباجان حضرت یعقوب علیہ السلام کی آنکھوں پر رکھنا ان کو بینائی حاصل ہو جائے گی۔ اس خوشخبری کے ملنے سے پہلے حضرت یعقوب علیہ السلام نے فرمایا مجھے یوسف علیہ السلام کی بوجاہی ہے۔ اس وقت آپ کے پوتوں اور موجود اہل و عیال نے یہ کلام کی غلط فہمی کے ترجمہ سے یہ پتا چلتا ہے کہ ان کا مقصد یہ تھا کہ تم حضرت یوسف علیہ السلام کی محبت میں وارفتہ ہو۔ اللہ کے نبی کی طرف غلطی اور خطا کی نسبت درست نہیں جب کہ وہ آپ کی اولاد بھی تھی اور مومن بھی تھے۔ پہلے بھی اس کی تفصیل گزر

چکی ہے جس کا تعلق آپ کے بیٹوں سے تھا۔ توجہ فرمائیں تو اعلیٰ حضرت کے ترجمہ کو تفاسیر کے مطابق پائیں گے۔

مدارک میں ہے: لَفِي ضَلَالٍ قَدِيمٍ عَنْ الصَّوَابِ قَدِيمًا فِي إِخْلَاطِ مُحِبَّتِكَ لِيُوسُفَ اَوْ فِي خَطَايَاكَ الْقَدِيمَةِ مِنْ حُبِّ يُوْسُفَ وَكَانَ عِنْدَهُمْ اِنَّهُ قَدِمَاتٌ یعنی آپ حضرت یوسف علیہ السلام کی قدیم کثرت محبت میں وارفتہ ہیں۔ لہذا یہ بات آپ کی درست نہیں کہ آپ حضرت یوسف علیہ السلام کی محبت کی وجہ سے ایسا کہہ رہے ہیں حالانکہ وہ تو مہر چکے ہیں۔ تفسیر کبیر میں ہے: لَفِي ضَلَالٍ الْقَدِيمِ اى لَفِي ضَلَالٍ الْقَدِيمِ لَا تَقْسِمَاہ وَلَا تَذْهَلْ عَنْہُ یعنی آپ حضرت یوسف علیہ السلام کی قدیم محبت میں ہیں نہ انکو بھولتے ہیں اور نہ ہی وہ آپ کے ذہن سے نکلتے ہیں۔

اب اعلیٰ حضرت کے ترجمہ کی خوبی واضح ہو گئی کہ آپ کا ترجمہ تفاسیر کے مطابق ہے اور نبی کی طرف غلطی کی نسبت کرنا مومن کی شان کے لائق نہیں۔ اس لیے آپ کی اولاد کے حق میں وہ ترجمہ درست نہیں جس میں ان کے ایمان پر حرف آ سکے۔

حَتَّىٰ إِذَا اسْتَأْذَنَ الرُّسُلُ وَظَنُّوْا اَنْهُمْ قَدْ كَذَّبُوْا جَاءَهُمْ نَصْرُنَا (پ ۱۶۷)

- یہاں تک کہ جب پیغمبر ناصیب ہو گئے اور انھوں نے خیال کیا کہ اپنی نصرت کے بارے میں جو بات انھوں نے کہی تھی اس میں وہ سچے نہ نکلے تو ان کے پاس ہماری مدد پہنچی۔ (فتح محمد)۔
- یہاں تک کہ جب ناصیب ہونے لگے رسول اور خیال کرنے لگے کہ ان سے جھوٹ کہنا تھا پہنچی ان کو مدد ہماری۔ (شاہ عبد القادر)۔
- یہاں تک کہ پیغمبر ناکوس ہو گئے اور ان کو گمان غالب ہو گیا کہ ہماری فہم نے غلطی کی، ان کو ہماری مدد پہنچی۔ (مولینا اشرف علی)۔

• یہاں تک کہ جب ناامید ہونے لگے رسول اور خیال کرنے لگے کہ ان سے جھوٹ کہا گیا تھا پہنچی ان کو ہماری مدد (محمود الحسن)۔

• یہاں تک کہ پیغمبر یابوس ہو گئے اور گمان کرنے لگے کہ ان سے غلطی ہوئی کہ اتنے میں انھیں ہماری مدد پہنچی۔ (عبد المجاہد دریا آبادی)۔

• یہاں تک کہ جب رسولوں کو ظاہری اسباب کی امید نہ رہی اور لوگ سمجھے کہ رسولوں نے ان سے غلط کہا تھا (اعلیٰ حضرت)۔

اس آیت کریمہ کی تفسیر میں مفسرین نے بہت بسیط بحث کی ہے اور جس احتمال کو تفسیر کبیر اور شرح المعانی میں رد کیا گیا ہے اس قول کو دیگر مترجمین نے اقوال مفسرین سے بے خبری کے عالم میں پسند کیا اور اسی کے مطابق ترجمہ کیا۔ اور بظاہر جو اعتراض ہوتا ہے جس کا مفسرین کرام نے جواب دیا ہے۔ اسی اعتراض کو دور کرنے کے لیے اعلیٰ حضرت نے یہ ترجمہ کیا "یہاں تک رسولوں کو ظاہری اسباب کی امید نہ رہی"۔ اس پر بھی بار لوگوں نے اپنی جہالت پر پردہ ڈالنے کے لیے ان الفاظ میں اعتراض کیا ہے۔

حق اذ استقیس الرسول میں "ظاہری اسباب" فاضل بریلوی نے اپنی طرف سے بلا کر قرآن کے اندر بیان کو بدلنے کی کوشش کی۔ اس آیت کریمہ کی تفسیر کو اس طرح پیش کیا گیا ہے کہ "کذبوا" میں دو طرح کی قرأتیں ہیں ایک تخفیف سے معنی کذبوا اور دوسری تشدید سے معنی کذبوا۔ ہر قرأت پر دو قسم کے قول پیش کئے گئے ہیں یہاں چونکہ تخفیف والی قرأت ہی زیر بحث ہے اس لیے طوالت سے بچتے ہوئے صرف اسی کو پیش کیا جا رہا ہے۔ تفسیر کبیر میں ہے: اعلم انہ قرأوا حاصم وحمزہ

والکسانی کذبوا بالتخفیف وکسر الذال والباقون بالتشديد ومعنى التخفيف من وجهين احدهما ان الضن واقع بالقوم اى حتى اذا استقيس الرسول من ايمان القوم فظن القوم ان الرسول كذبوا فيما وعدوا من النص والظفر۔

جان لو بے شک عاصم اور حمزہ اور کسائی رحمہم اللہ علیہم نے تخفیف سے پڑھا ہے

باقیوں نے تشدید سے اور تخفیف والی قرأت میں دو وجہ ہیں۔ ان دونوں میں سے ایک یہ ہے کہ گمان قوم سے واقع ہوا یعنی مطلب یہ ہوا کہ جب رسولوں نے قوم کے ایمان سے امید کو منقطع کیا پس لوگ یہ سمجھے کہ رسولوں نے ان سے غلط کہا تھا یعنی رسولوں سے جو امداد، کامیابی کا وعدہ کیا گیا تھا وہ پورا نہیں کیا گیا۔ اب اس وجہ کے مطابق اعلیٰ حضرت کے ترجمہ پر غور کریں، آپ نے ترجمہ کیا "لوگ یہ سمجھے کہ رسولوں نے ان سے غلط کہا ہے"۔ یہ ترجمہ اس قول کے عین مطابق ہے لیکن دیگر مترجمین نے دوسری وجہ کے مطابق ترجمہ کیا ہے جس کو مفسرین نے رد کیا ہے کیونکہ کسی نے ترجمہ کیا "اور رسولوں نے خیال کرنے لگے کہ ان سے جھوٹ کہا تھا" کسی نے ترجمہ کیا "اور ان رسولوں کو گمان غالب ہو گیا ہماری فہم نے غلطی کی۔"

تفسیر کبیر نے دوسری وجہ بیان کی اور رد کیا ہے اسے دیکھیں: والوجه الثاني ان يكون المعنى ان الرسول خطا انهم قد كذبوا فيما وعدوا وهذا لا يتناول منقول عن ابن ابى مليكة عن ابن عباس رضى الله عنهما قالوا وانما كان الامر كذلك لاجل ضعف البشرية الا انه بعيد لان المؤمن لا يجوز ان يظن بالله الكذب بل يخرج بذلك عن الايمان فكيف يجوز مثله على الرسول

دوسری وجہ یہ ہے کہ رسولوں نے گمان کیا کہ بے شک جو ان سے وعدہ کیا گیا تھا اس میں وہ جھوٹا ہے کئے (ترجمہ کو دیکھیے خیال کرنے لگے کہ ان سے جھوٹ کہا تھا) یہ تاویل ابن ابی ملیکہ سے ہے۔ انہوں نے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کی ہے۔ انھوں نے کہا گویا یہ بوجہ ضعف بشریت کے ہے لیکن علامہ رازی نے اس کو رد کیا اور کہا یہ بہت بعید ہے کیونکہ ایک مومن کی شان کے لائق نہیں کہ اللہ تعالیٰ پر جھوٹ کا گمان کرے بلکہ ایسا خیال کرنے والا شخص ایمان سے ہٹ چکا ہے ایسا قول رسولوں سے کیسے جائز ہو سکتا ہے۔

اب توجہ فرمائیں کہ جس قول کو رد کیا گیا ہے کہ یہ رسولوں سے ممکن نہیں کہ وہ

اللہ تعالیٰ کے وعدہ کو جھوٹ خیال کریں۔ اسی قول کے مطابق تراجم آپ کو نظر آئیں گے لیکن اعلیٰ حضرت کا ترجمہ بلا غبار ہے کیونکہ آپ کا ترجمہ پہلے قول کے مطابق ہے جو مفسرین کا طے شدہ قول ہے۔ خیال رہے کہ تفسیر روح المعانی میں اس آیت کریمہ کی تفسیر بہت ہی مفصل ہے۔ چونکہ لب لباب اس کا بھی یہی ہے اس لیے اس کی عبارات کو نہیں پیش کیا جا رہا۔

اب رہا یہ اعتراض کہ اعلیٰ حضرت نے ظاہری اسباب کے الفاظ کا اضافہ کیوں کیا۔ چونکہ یہاں ایک اعتراض ہوتا ہے جس کا جواب روح المعانی میں دیا گیا ہے ایک جواب صراحتہً اور ایک ضمنیاً جو جواب ایک بحث کے ضمن میں دیا گیا ہے اسی کو اعلیٰ حضرت نے اختیار کیا ہے۔ روح المعانی میں ہے: واستشكل بعضهم نسبة الاستيئاس اليهم عليهم السلام ايضا بناء على ان الظاهر انهم استيئسوا مما وعدوا به واخبروا بكونه فان ذلك ايضا مما يليق بنسبتهم واجيب بانه لا يبراد ذلك وانما يبراد انه استيئسوا من ايمان قومهم۔ اعتراض یہ ہوتا ہے کہ ناامیدی کی نسبت انبیائے کرام کی طرف بظاہر طویل کر دی گئی ہے کیونکہ ظاہر آیت چلتا ہے کہ انبیائے کرام سے جو وعدے کئے گئے اور انہیں خبر دی گئی اس سے وہ ناامید ہو گئے حالانکہ انبیائے کرام کی شان کے لائق یہ نہیں ہے۔ اس کا جواب یہ دیا کہ وہ وعدوں سے ناامید نہیں ہوئے بلکہ قوم کے ایمان لانے سے امیدوں کو منقطع کیا۔ دوسری بحث آپ کی اس طرح ہے: وذلك ان الخبر عن استيئاسهم مطلق وليس في الآية ما يدل على تقصيده بما وعدوا به واخبروا بكونه واذ كانت كذلك فمن المعلوم ان الله تعالى اذا وعد الرسل بنص مطلق كما هو غالب اخباراته لم يعين زمانه ولا مكانه ولا صفة فكثيرا ما يعتقد الناس في الموعود به صفات اخرى لم يردل عليها خطاب الحق تعالى بل اعتقدوا لها اسباب اخرى كما اعتقد طائفة من الصحابة رضي الله تعالى عنهم اخبار النبي صلى الله

عليه وسلم لهم انهم يدخلون المسجد الحرام ويطوفون به ان ذاك يكون عام الحديبية لان النبي صلى الله عليه وسلم خرج محتمرا وسجاء ان يدخل مكة ذلك العام ويطوف وليسعي فلما استقيسوا من ذلك ذلك العام لما صددهم المشركون حتى قاضاهم عليه الصلوة والسلام على الصلح المشهور بقي في قلب بعضهم شيء حتى قال عمر رضي الله عنه مع ان كانت من المحدثين الم تخبرنا يا رسول الله انك دخل البيت ويطوف قال بلى انما خبرت انك تدخله هذا العام ج قال لا۔ قال انك داخل ويطوف به۔

ناامیدی کی خبریں مطلق ہیں آیت میں کوئی ایسے الفاظ نہیں جو انبیائے کرام کے ساتھ کئے گئے وعدوں اور خبروں کی تقصید پر دل ہوں لہذا انبیائے کرام سے جو امداد کے وعدے تھے وہ مطلق تھے۔ عام خبروں میں ایسے ہی ہے ان کو کسی زمانے یا مکان یا صفات سے مقید نہیں کیا گیا۔ البتہ لوگوں نے صفات کا اعتقاد کیا حالانکہ اللہ تعالیٰ کا خطاب ان پر دل نہیں جیسا کہ صحابہ کرام نے یہ اعتقاد کیا کہ اسی حدیث کے سال مسجد حرام میں داخل ہونا طواف کرنا معتبر ہے کیونکہ نبی کریم جب عمرہ کرتے کی غرض سے نکلے طواف سعی کی امید کرتے ہوئے لیکن جب نبی کریم نے کفار کے روکنے پر ان سے صلح کر لی جس کے نتائج پر آپ ہی بانہر تھے بظاہر ثمر الطاف اگرچہ مشکل نظر آتی تھیں لیکن حقیقتہً وہ مسلمانوں کے حق میں مفید تھیں۔ تو مسلمانوں نے ناامید کے حال میں کچھ چیزوں کو دلہل میں لایا یعنی کچھ شکوک پیدا ہوئے یہاں تک کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ باوجود اس کے آپ صاحب لہام والقار تھے لیکن عرض کیا یا رسول اللہ کیا آپ نے ہمیں خبر نہیں دی تھی کہ ہم بیت اللہ شریف میں داخل ہوں گے۔ اور طواف کریں گے؟ آپ نے فرمایا میں نے خبر دی تھی لیکن کیا میں نے یہ بھی کہا تھا

کہ اسی سال تم بیت اللہ میں داخل ہو گے۔ نو فاروقی اعظم نے عرض کیا نہیں یا رسول اللہ! تو آپ نے فرمایا کہ تم ضرور بیت اللہ شریف میں داخل ہو گے اور طواف کرو گے۔
اس بحث کے بعد سمجھنے میں کوئی مشکل درپیش نہیں آئیگی کہ نبی کریم نا امیدی نہیں ہوئے بلکہ آپ بانہر تھے کہ ضرور ہی بیت اللہ شریف میں داخل ہوگا صرف ظاہری اسباب کا وقتی طور پر انقطاع تھا نہ کہ حقیقتہً نا امیدی دوسرے حضرات کو بھتی۔
خود نبی کریم اس سے دور تھے۔

اب اعلیٰ حضرت کی علمی بصیرت اور محبتِ رسل واضح ہو گئی کہ آپ کا ترجمہ مفتقر کرام کی آراء سے مختلف نہیں۔ اگر کوئی شخص تفاسیر کا مطالعہ نہ کرے صرف اپنے دل کو بھانے والے تراجم کو دیکھ کر کچھ اچھا لگتا شروع کرے اور یہ بھی سمجھے کہ جس ترجمہ کو میں من گھڑت کہہ رہا ہوں وہی اقوال مفسرین کرام کے عین مطابق ہے اور جن مترجمین کی میں تعریف کر رہا ہوں انہوں نے موجود اقوال کو اپنے تراجم میں پیش کیا ہے اور شانِ انبیائے کرام کے مطابق نہ ہونے پر بظاہر جو اعتراضات وارد ہوتے ہیں ان کو وہ تفاسیر کے مطابق اپنے تراجم سے مندرج نہ کر سکے بلکہ ان کے تراجم پر وہی اعتراضات ہوتے ہیں۔

مِنْ حَمَلٍ مَّسْنُونٍ (پ ۱۱۴)

- سنے ہوئے گارے سے۔ (مولانا محمود الحسن)۔
- سنے گارے سے (شاہ عبدالقادر)۔
- جو کہ سڑے ہوئے گارے سے بنی تھی۔ (مولانا اشرف علی)۔
- سڑے ہوئے گارے سے۔ (فتح محمد)۔
- جو اصل میں ایک سیاہ بدبودار گارہ تھی۔ (اعلیٰ حضرت)۔

انسان کی تخلیق کا ذکر اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ ہم نے انسان کو بچتی ہوئی (کھٹکنا) مٹی سے پیدا کیا جو اصل میں ایک سیاہ بدبودار گارہ تھی۔ یہاں یہ بیان کرنا تو مقصود نہیں بلکہ

کہ باقی تراجم سے مقصد حاصل کرنا ممکن نہیں یا وہ کسی اعتراض کو مندرج نہیں کرے یا شانِ الوہیت و رسالت کا صحیح طور پر لحاظ نہیں کیا گیا۔ البتہ اتنا ضرور کہنا چاہیے کہ تفاسیر کے مطابق بیان حقیقت اعلیٰ حضرت کے ترجمہ سے ہی واضح ہے۔

جلالین میں ہے: مِنْ حَمَلٍ مَّسْنُونٍ اسو مسنون متغیر سیاہ رنگ کا گارا بدلا ہوا۔ اس متغیر پر حمل کی عبارت اس طرح ہے متغیر ای متغیر المراتب من حلول مکتبہ یعنی زیادہ دیر ٹھہرنے کی وجہ سے اس کی بوبدلی ہوئی ہو۔ اسی طرح روح البیان میں ہے: قوله مسنون صفت حملا ای منتقن وبالفاہم سیۃ ہوتے گشت ہو اسطہ بسیار بودن در آب یعنی ترکیبی لحاظ سے مسنون صفت ہے حملا کی جس کا معنی بدبودار ہونا۔ پھر فارسی میں بھی یہی معنی کیا ہے کہ زیادہ دیر پانی میں ٹھہرنے کی وجہ سے اس میں بوباجانا۔ اسی طرح مدارک میں ہے ای طبع اسو متغیر سیاہ رنگ کا گارا بدبودار۔ جو بعد میں خشک ہو کر صلصال بن گیا جو بچنے بکھٹنے لگا۔

مِنْ نَّارِ السَّمُومِ (پ ۱۱۵)

- آگ لون کی سے۔ (شاہ رفیع الدین)۔ ٹوکی آگ سے (محمود الحسن)۔
- ٹوکی آگ سے (شاہ عبدالقادر)۔
- آگ سے وہ ایک گرم ہوا بھتی (مولانا اشرف علی)۔
- آگ کی لپٹ سے (مودودی)۔ گرم آگ سے۔ (عبدالماجد دریا آبادی)۔
- بے دھوئیں کی آگ سے (اعلیٰ حضرت)۔
- یہاں جنت کی تخلیق کا ذکر ہے کہ جنوں کو ہم نے انسان سے قبل آگ سے پیدا کیا جس میں دھواں نہیں تھا۔ اعلیٰ حضرت کا ترجمہ بے دھوئیں کی آگ، باقی تراجم، ٹوکی آگ، آگ جو گرم تھی۔ اعلیٰ حضرت کا ترجمہ تفاسیر کے مطابق ہے۔ جلالین میں ہے: هی نار لادخان لہا تنفذ فی المسام۔ یعنی نار السموم وہ آگ ہے جس میں دھواں

نہیں مساموں میں نافذ ہو جاتی ہے۔ بیضاوی میں ہے: من نار السموم اى
من نار الحار الشديد۔ سخت گرم آگ ہے۔ روح المعانی میں ہے: قيل
السموم نار لا دخان لها۔ یعنی سموم سے مراد وہ آگ ہے جس میں دھواں نہ ہو۔
وقيل السموم افراط الحور والاضافة من اضافة الموصوف الى الصفة
والمراد من النار المضطرة الحراسة۔ یعنی سموم کا معنی سخت گرم۔ یہاں موصوف
کی اضافت صفت کی طرف ہے، مراد اس سے سخت گرم آگ ہے۔

وَنَفَخْتُ فِيهِ مِنْ رُوحِي (پہلے)

اس میں اپنی بے بہا چیز یعنی روح پھونک دی۔ (فتح محمد)۔
اور پھونک دوں بیچ اس کے روح اپنی سے۔ (شاہ رفیع الدین)۔
اور پھونک دوں اس میں اپنی جان سے۔ (شاہ عبد القادر)۔ محمود الحسن۔
اس میں اپنی جان ڈال دوں۔ (اشرف علی)۔
اور اس میں اپنی روح سے کچھ پھونک دوں (مودودی)۔
اور اس میں اپنی طرف کی خاص معزز روح پھونک دوں (علی حضرت)۔
اعلیٰ حضرت کے ترجمہ میں یہ ہے کہ اپنی طرف سے خاص معزز روح پھونک
دوں۔ باقی تراجم میں ہے اپنی جان ڈال دوں یا اپنی جان سے پھونک دوں یہاں
ذکر ہوا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ملائکہ کو فرمایا، میں انسان بنانے والا ہوں بھتی ہوئی
مٹی سے، جب میں اس کی تخلیق کر لوں مکمل، اس میں ایک معزز روح ڈال دوں تاکہ
وہ زندگی حاصل کرے جمل میں ہے: من روحی من زائدة او تبعیضیۃ
ای نفخت فیہ روحا ہی بعض الاسما والحق خلقها اى
ادخلتها واجوبیتها یعنی من روحی میں من زائدہ ہے یا تبعیضیۃ یعنی میں اس
میں روح ڈال دوں جو میرے تخلیق شدہ ارواح کا بعض ہوگا۔ جلالین میں ہے:
اَضَافَ الرُّوحَ اِلَیْہِ تَشْرِیْہًا لِاَدَمَ اور حاشیہ جلالین میں ہے اَضَافَ الرُّوحَ اِلَیْہِ

تَشْرِیْہًا کَمَا یُقَالُ بِبیت امثلہ۔

جس طرح بیت اللہ حقیقتاً اللہ کا گھر نہیں بلکہ اضافت تشریفی ہے اسی طرح
من رُوحی میں اللہ کا روح جان نہیں بلکہ مراد وہ روح ہے جو اللہ کی مخلوق ہے لیکن
اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب ہونے کی وجہ سے معزز ترین ہو گئی۔ تفسیر کبیر میں ہے:
وَإِنَّمَا أَضَافَ امثلہ سَجَانہُ سَمَوحِ اَدَمَ اِلَیْ نَفْسہِ تَشْرِیْہًا وَتَشْرِیْہًا
اللہ تعالیٰ نے روح آدم کو اپنی طرف شرافت عطا کرنے اور تکریم کے لیے منسوب کیا۔
مقصد واضح ہو کہ اصل مدعی بھی یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی طرف
سے ایک معزز روح پھونکی۔ یہ مقصود نہیں کہ اپنی جان ان میں ڈال دی۔ علی حضرت کا
ترجمہ ابتداء ہی مقصود کو بیان کر دیتا ہے جب کہ دیگر تراجم میں جب تک تاویل نہ کی
جائے اور تفسیر کی تقریر کو اپنی زبان میں نہ پیش کیا جائے اس وقت تک مدعی اصل
نہیں ہوتا جب کہ ترجمہ کرنے کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ عام آدمی کو کچھ نہ کچھ قرآن پاک
کی سمجھ آجائے ورنہ علمائے کرام جو تفسیر کی اجاث کو سمجھنے کی اہلیت رکھتے ہیں وہ
ترجمہ کے محتاج نہیں۔ لہذا وہی ترجمہ ذی شان ہو گا جو عام انسان کو خدشات سے
دور رکھے۔ ایسے تراجم کا کیا مقصد جن کے پڑھنے کے بعد ہم ہو کہ اللہ تعالیٰ نے
اپنی جان (روح) کیسے ڈال دی۔ کیا وہ حادث تو نہیں؟ کیا روح باری تعالیٰ اس
سے جدا ہو سکتی ہے؟ کیا روح کا اس پر اطلاق ہو سکتا ہے؟ اس طرح کے خدشات
سے بچنے کے لیے علی حضرت کا ترجمہ ہی معاون ثابت ہو سکتا ہے۔

تَتَّخِذُونَ مِنْهُ سَكَرًا (پہلے)

- کہ ان سے شراب بناتے ہو (فتح محمد)۔
- لیتے ہو تم اس سے مسرت کرنے والی چیزیں (شاہ رفیع الدین)۔
- بناتے ہو اس سے نشہ۔ (شاہ عبد القادر)۔ مولینا محمود الحسن)۔
- تم لوگ نشہ کی چیز بناتے ہو (اشرف علی)۔

جسے تم نشہ آور بھی بناتے ہو۔ (مودودی)۔

اس سے نشہ چھڑی بناتے ہو (عبدالماجد دریا آبادی)۔

اس سے نبیذ بناتے ہو (علیٰ حضرت)۔

اللہ تعالیٰ اپنی نشانوں اور قدرتوں کو بیان فرما رہا ہے اور فرمایا کہ کھجور اور انگوروں کے پھلوں سے تم نبیذ بناتے ہو اور اچھا رزق۔ علیٰ حضرت نے سکر کا معنی نبیذ کیا ہے لیکن دیگر حضرات نے نشہ معنی کیا ہے۔ اگرچہ تفاسیر میں نشہ بھی معنی لیا گیا ہے اور یہ بیان کیا گیا ہے کہ آیت فخر کی حرمت کی آیت سے منسوخ ہے لیکن امام ابو حنیفہ اور امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہما اس آیت کو منسوخ نہیں مانتے بلکہ وہ اس سے مراد نبیذ لیتے ہیں اور اس کی حالت پر یہی آیت دلیل مانتے ہیں۔ علیٰ حضرت کا ترجمہ اسی کے مطابق ہے۔ مدارک میں ہے: وقیل السکر النبذ وهو عصیر العنب والزبيب والتمر اذا طبخ حتى يذهب ثلثاه تریترک حتی یشتد وهو جلد عند ابی حنیفۃ وابی یوسف الی حد السکر ویحتج ان بهذه الایۃ بیان کیا ہے کہ سکر سے مراد نبیذ ہے۔ نبیذ کے کہا جاتا ہے جو انگور اور کشمش اور کھجور کو جب پکایا جائے اور اس کے دو حصے زائل ہو جائیں ایک حصہ باقی رہ جائے پھر اس کو چھوڑ دیا جائے یہاں تک کہ وہ گاڑھا ہو جائے وہ نشین کے نزدیک حلال ہے جب تک نشہ نہ دے۔ انھوں نے اسی آیت سے دلیل پکڑی ہے۔

وَالَّذِينَ يَدْعُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ لَا يَخْلُقُونَ شَيْئًا وَهُمْ يُخْلَقُونَ الْآیۃ (پ ۸۴)

• اور جن کو پکارتے ہو سوائے اللہ کے نہیں پیدا کرتے کچھ اور وہ پیدا کیے جاتے ہیں مردہ ہیں نہیں زندہ اور نہیں جانتے کب اٹھائیں جائیں گے۔

(شاہ رفیع الدین)

• اور جن لوگوں کو یہ خدا کے سوا پکارتے ہیں وہ کوئی چیز بھی تو نہیں بنا سکتے بلکہ خود ان کو اور بناتے ہیں وہ لاشیں ہیں بے جان، ان کو یہ بھی تو معلوم نہیں کہ اٹھائے کب جائیں گے۔ (فتح محمد)۔

• اور وہ دوسری ہستیاں جنہیں اللہ کو چھوڑ کر لوگ پکارتے ہیں وہ کسی چیز کے بھی خالق نہیں بلکہ خود مخلوق ہیں مردہ ہے نہ کہ زندہ اور ان کو کچھ معلوم نہیں ہے کہ انھیں کب (دوبارہ زندہ کر کے) اٹھایا جائے گا۔ (مودودی)

• اور جن کو پکارتے ہیں اللہ کے سوا کچھ پیدا نہیں کرتے اور آپ پیدا ہوتے ہیں مردے ہیں جن میں حی نہیں اور خبر نہیں رکھتے کب اٹھائے جائیں گے۔ (شاہ عبدالقادر)۔

• اور جن کو پکارتے ہیں اللہ کے سوا پیدا نہیں کرتے اور وہ خود پیدا کیے ہوئے ہیں۔ مردے ہیں جن میں جان نہیں اور نہیں جانتے کب اٹھائے جائیں گے۔

(مولانا محمود الحسن)

• اور جن کو یہ اللہ کے علاوہ پکارتے ہیں وہ کسی کو پیدا نہیں کر سکتے اور وہ خود بھی مخلوق ہیں اور وہ مردے ہیں نہ کہ زندہ اور ان کی اتنی بھی خبر نہیں کہ (مردے) کب اٹھائے جائیں گے۔ (عبدالماجد دریا آبادی)۔

• اور اللہ کے سوا جن کو پوجتے ہیں وہ کچھ نہیں بناتے وہ خود بنائے ہوئے ہیں۔ مردے ہیں زندہ نہیں اور انھیں خبر نہیں لوگ کب اٹھائے جائیں گے۔ علیٰ حضرت۔ اس مقام پر علیٰ حضرت نے یہ نحوں کا ترجمہ کیا ہے ”پوجتے ہیں“ اور دیگر مذکور تراجم میں ”پکارتے ہیں“۔ اپنا مقصد ثابت کرنے کے لیے اسی آیت کو بڑے زور و شور سے اولیائے عظام اور انبیائے کرام پر حیاں کیا جاتا ہے یہی ان کا طریقہ واردات ہے۔ وہی آیتیں جو مشرکین کے حق میں نازل ہوئیں ان کو مسلمانوں پر حیاں کرنا اور جو آیتیں بتوں کے بارے میں ہیں ان کو اولیاء و انبیاء کرام پر محمول کرنا بس یہی ان کا ایمان، یہی علم۔ ان کے اعتراضات کا محور مسلمان، اولیائے کرام اور انبیائے کرام ہیں۔

شاہ عبدالقادر کے حاشیہ میں ہے۔ شاید یہ ان کو فرمایا جو مرے بزرگوں کو پوچھتے ہیں۔ شاید کوئی وہم کرے کہ اس سے مراد ان حضرات کی یہود و نصاریٰ ہوں جو حضرت عزیر اور حضرت عیسیٰ علیہما السلام کو معبود مانتے تھے لیکن یہ وہم اس لیے درست نہیں کہ اکثر و بیشتر اسی طرح تعادیر اور اپنے درس قرآن میں حضرات کو یہی کہتے سنا گیا ہے کہ مزارات پر جانا منع ہے بلکہ نہایت شدت سے کہا جاتا ہے کہ مزارات پر جانا حرام ہے وہ تو خود مر چکے ہیں وہ تو کچھ نہیں کر سکتے۔ اس آیت کریمہ کا ترجمہ نوٹ کر لے لیں۔ یہ ظلم عظیم! کوئی مسلمان کسی بزرگ کو معبود نہیں مانتا ہے اور نہ اس کو پوجتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات میں کسی کو شریک نہیں ٹھہراتا۔ پھر یہ کہنا کیسے کہ یہ مشرک ہیں۔ اب یہاں دو باتیں توجہ طلب ہیں:-

ایک بزرگان دین کے مزارات پر جانا، ان کے توسل سے دعا کرنا کہاں تک جائز ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ یہ آیت کریمہ بتوں اور بت پرستوں کے حق میں نازل ہوئی ہے۔ اسی وجہ سے اس کو مسلمانوں، اولیائے کرام اور انبیائے کرام کے حق میں بیان کرنا ظلم ہے پہلے اس بات کو تفاسیر کی روشنی میں بیان کر دیا ہوں کہ یہ آیت کریمہ بتوں اور بت پرستوں کے حق میں نازل ہوئی۔ جلالین میں اس طرح تفسیر کی گئی: والذین یبدعون بالشا والیاء یعبدون من دون الله وهو لا صنم لا یخلقون شئیاً و هم یخلقون یصورون من الجعاش و غیرہا۔ اموات لا یروح فیہم خبیثان غیر اعیان تاکید و ما یشعرون ای الا صنم ایان وقت یبعثون ای الخلق فکیف یعبدون اذ لا ینکون الہماً الا الخالق الخ العالم بالغیب یعنی والذین یدعون میں دو قرأتیں ہیں یدعون بالیاء اور تدعون بالیا، معنی اس کا یعبدون یا تعبدون ہوگا جو لوگ عبادت کرتے ہیں پوجتے ہیں اللہ کے بغیروں کو یہاں غیروں سے مراد بت ہیں وہ کسی چیز کو نہیں بناتے وہ تو خود بنائے جاتے ہیں پتھروں وغیرہ سے ان کو تیا یا جاتا ہے۔ وہ مردہ ہیں یعنی ان میں روح ڈالی ہی نہیں گئی۔ یہ دوسری خبر ہے اور غیر احیاء تاکید ہے۔ وہ بت جانتے ہی نہیں کس وقت مخلوق کو اٹھایا

جائے گا۔ ان کی کیسے عبادت کی جاسکتی۔ ہے جب کہ معبود تو وہ ہوتا ہے جو خالق ہو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے زندہ ہو، غیبی امور کو جاننے والا ہو لیکن بت تو ان صفات سے عاری ہیں۔ مدارک میں ہے نفی عنہم خصائص الالہیۃ یعنی کوہم خالقین و احیاء لا یموتون و عالمین بوقت البعث و اثبت لہم صفات الخلق با انہم مخلوقون اموات جاہلون بالبعث و معنی اموات غیر احیاء انہم لو کانوا الہد علی الحقیقۃ لکانوا احیاء غیث اموات۔ یہاں الوہیت کی نفی کی گئی ہے کیونکہ وہ خالق نہیں دائمی طور پر زندہ نہیں، وقت البعث کو جانتے نہیں۔ ان کے لیے مخلوق کی صفات ثابت نہیں یعنی وہ مردہ ہیں، قیامت سے بے خبر ہیں۔ ان کے مردہ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ ان میں زندگی آئی ہی نہیں اگر وہ حقیقتاً معبود ہوتے، پوجنے کے قابل ہوتے، وہ دائمی طور پر زندہ ہوتے۔ روح المعانی میں ہے: تشریح فی تحقیق ان الہیت ہم بمعزل عن استحقاق العبادۃ۔ اسی آیت کریمہ کی وضاحت میں یہ کہا ہے کہ یہاں سے تحقیق شروع کی جا رہی ہے کہ ان کے معبود جن کو وہ پوجتے ہیں وہ مستحق عبادت نہیں۔ بلکہ اس استحقاق سے دور ہیں۔ اسی تفسیر میں والذین یدعون کے ماتحت یہ بھی آتا ہے: واللہ الذین تعبدون ہم ایما الکفار۔ وہ معبود جن کو اے کافر تم پوجتے ہو۔ اسی طرح بیان کیا گیا ہے و هذا من باب التہکیم بہم بناء علی اس اداة الا صنم لان شعور الجماد بالامور الظاہرة بدیہی الاستحالة عند کل احد فکیف بما لا یعلم الا العلم الخبیر۔ و فی البحران فیہ تمکنا بالمشورکین و ان الہتہم لا یعلمون وقت بعثتہم بیجاؤہم علی عبادتہم ایاہم۔ یہ کلام تمکیم کے طور پر کی گئی ہے کیونکہ جماد ہیں ان سے امور ظاہر کا شعور ممکن نہیں بلکہ ہر ایک کے نزدیک بدستہ محال ہے۔ پھر خاص کر کے ان چیزوں کو وہ کیسے جان سکتے ہیں جن کو صرف علیم و خبیر جانتا ہو۔ اسی طرح بحر میں ہے کہ مشرکوں سے تمکیم ہے کہ ان کے معبود جب قیامت کے

وقت کو ہی نہیں جانتے ان کو ان کی عبادت پر جو کیا دیں گے۔ یہاں خیال ہے کہ روح المعانی میں اموات غیر احیاء کی تاویل کر کے حضرت عزیر اور حضرت عیسیٰ علیہما السلام اور ملائکہ کو بھی شامل کیا ہے اور والدین یدعون کو بھی بعض کے نزدیک عام رکھا گیا ہے لیکن مراد پھر بھی معیوہ ہی ہیں۔

بفضلہ تعالیٰ مسلمان انبیائے کرام یا اولیائے کرام کو موجود نہیں سمجھتے اس لیے اس آیت کریمہ کو اپنے مقصد پر دلیل بنانے والے اس غموم سے کوئی فائدہ نہیں اٹھا سکتے۔

اب دوسری بحث یہ سمجھنے کے قابل ہے کہ توسل اور تبرک آثار صالحین سے جائز ہے۔ پہلے مطلقاً توسل پر پھر انبیائے کرام اور اولیائے کرام کے فزارات سے توسل و تبرک پھر زندگی بعد از وفات پر مختصر بحث کر رہا ہوں تفصیلی بحث اگر مرقس کا سننا اور ان کی بزرخی زندگی پر اگر کوئی دیکھنا چاہے تو استاذی المکرم حضرت علامہ مولانا ابوالحسنات محمد اشرف سیالوی صاحب مدظلہ العالی کی کتاب جلالہ الصدور کا مطالعہ کرے اس میں یہ بحث بالتفصیل ہے اور تحقیق و تدقیق پر مبنی ہے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا جبہ مبارک تھا جو حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے پاس تھا اس کے بعد وہ حضرت اسماء رضی اللہ عنہا کے پاس آیا۔ اس جبہ مبارک کو دھو کر اس کے پانی سے بیمار شفا حاصل کرتے حضرت اسماء فرماتی ہیں: وکان النبی صلی اللہ علیہ وسلم یلبسها فتنفخ نفسها لمرضی لئن شفی بها مسلم ثم یرفی جلد ثانی باب تعویج اناء الذهب والفضة علی الرجال الخ حضرت اسماء فرماتی ہیں کہ نبی کریم جو جبہ پہنا کرتے تھے ہم اسے مریضوں کی صحت یابی کے لیے دھو کر اس کے پانی کو استعمال میں لاتے تھے۔ اس حدیث پاک کے ماتحت علامہ نووی فرماتے ہیں: وفي هذا الحديث دليل علی استحباب التبرک بالآثار الصالحین شایع یعنی اس حدیث پاک میں دلیل ہے کہ آثار صالحین اور ان کے کپڑوں سے تبرک حاصل کرنا جائز ہے۔ اب علامہ نووی کی اس تحقیق کے بعد مزید ضرورت نہ رہی کہ بیان کیا جائے کہ آثار صالحین سے تبرک جائز ہے کیونکہ آپ نے صرف جواز ثابت نہیں کیا بلکہ استحباب ثابت کیا ہے۔

جس پر عمل کرنے کا ثواب حاصل ہوتا ہے۔

اسی طرح ایک اور حدیث پاک میں آتا ہے کہ حضرت سہل نے ایک مرتبہ ابو حازم اور دیگر حضرات کو بتایا کہ یہ وہ پیالہ ہے جس سے نبی کریم اور آپ کے صحابہ کرام نے پیلے بعد میں اسی پیالہ سے ان حضرات نے بطور تبرک پیا قال ابو حازم فاخرج لنا سہل ذلک القدم فشرینا ذیہ شراستوہب بعد ذلک عمر بن عبد العزیز فرحبہ۔ مسلم شریف جلد ثانی

باب اباحتہ التبرک۔ ابو حازم کہتے ہیں کہ حضرت سہل رضی اللہ عنہ نے وہ پیالہ ہمیں عطا فرمایا، ہم نے اس سے پیا۔ بعد میں حضرت عمر بن عبد العزیز رحمۃ اللہ علیہ نے وہ طلب کیا تو ان کو دے دیا گیا۔ ابو حازم وغیرہ کا اس پیالہ سے پینا اور حضرت عمر بن عبد العزیز کا مانگنا صرف بوجہ تبرک تھا اس میں کوئی اور وجہ نہ تھی بلکہ اس حدیث پاک کی شرح میں علامہ نووی کا بیان نہایت جامع ہے۔ هذا فیہ التبرک بالآثار النبی صلی اللہ علیہ وسلم وما سواہ لیسہ او کان منہ فیہ

سبب وهذا نحو ما اجمعوا علیہ واطبق السلف والخلف علیہ من التبرک بالصلوة فی مصلی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم و فی الروضة الکرمیة ودخول الخار الذی دخلہ صلی اللہ علیہ وسلم وغیر ذلک ومن هذا اعطاه صلی اللہ علیہ وسلم ابی طلحة شعرہ لیقسمہ بین الناس واعطاه صلی اللہ علیہ وسلم حقوہ لتکفی فیہ بفتہ وجعلہ الجرییدتین علی القبرین و جمعت بدلت ملحان عرقہ صلی اللہ علیہ وسلم و تمسحوا بوضوئہ و دکنوا وجوہہم بخامۃ صلی اللہ علیہ وسلم واشباہ هذا کثیرہ مشہورۃ فی الصحیح وکل ذلک واضح لا شک فیہ۔ علامہ نووی فرماتے ہیں کہ اس حدیث پاک سے پتہ چلا کہ نبی کریم کے آثار سے تبرک حاصل کرنا بہتر ہے جس کو نبی کریم نے مس کیا ہو یا پہنا ہو یا کسی طرح بھی وہ چیز نبی کریم

سے متعلق ہوئی ہو اس سے تبرک حاصل کرنا مستحب ہے سلف صالحین متاخرین کا اس پر اجماع و اتفاق ہے کہ نبی کریم کے نماز پڑھنے کی جگہ نماز پڑھنے سے تبرک حاصل کیا جائے نبی کریم کے روضہ مطہرہ سے تبرک حاصل کیا جائے جس غار میں نبی کریم داخل ہوئے اس غار میں داخل ہو کر تبرک حاصل کیا جائے۔ اس پر نبی کریم کا ابو طلحہ کو اپنے بال مبارک عطا کرنا تاکہ لوگوں میں تقسیم کریں اور ان کو اپنی چادر مبارک دینا تاکہ اس میں بیسی کو دفن کریں اور دو قبروں پر دو شاخوں کا رکھنا۔ اور بنت مہکان کا نبی کریم کا پسینہ مبارک جمع کرنا اور صحابہ کرام کا وضو کے پانی کو اپنے جسم پر ملنا اور آپ کے نخامہ مبارک کو چہروں پر ملنا، یہ تمام اسی پر دل ہیں۔ اس قسم کی کثیر صورتیں احادیث صحیحہ میں موجود ہیں اور یہ واضح ہے کہ ان میں کوئی شک نہیں۔

اب علامہ توفیقی کی وضاحت کے بعد جس کو آپ نے بلا شک کہا ہے اگر کوئی شک کرے تو وہ اپنی قسمت پر روتے ہیں اس کا کیا علاج کر سکتے ہیں۔ ماننے والے صاحب عقل سلیم کے لیے تو یہ کافی ہے نہ ماننے والے کے لیے کثیر دلائل بھی ناکافی!

مزارات انبیائے کرام اور صلحا سے تبرک | حضرت یوسف کی وفات سے تبرک حاصل کی غرض سے ہر ایک نے خواہش کا اظہار کیا کہ آپ کو ہمارے محلہ ہی دفن کیا جائے۔ مدارک نے پلا توفیقی مسلما والمحقنی بالصالحین کے تحت بیان کیا: فخاصم اهل مصر وتشاجروا في دفنه كل يحب ان يدفن في محله حتى هموا بالقتال فراوا ان يعملوا له صندوقا من مصر وجعلوه فيه ودفنوا في النبل بمكان يسمون عليه الماء فصر يصل الى مصر ليكونوا كلهم فيه شرعا۔

حضرت یوسف علیہ السلام کی وفات کے بعد اہل مصر نے جھگڑا کیا۔ تمام نے آپ کے دفن میں کوشش کی کیونکہ ہر ایک یہی پسند کرتا تھا کہ آپ کو ہمارے محلہ میں دفن کیا جائے یہاں تک کہ جنگ کا خطرہ پیدا ہو گیا۔ آخر کار اس بات پر صلح ہوئی کہ آپ کو ننگ ممر

کے صندوق میں بند کر کے دریائے نیل میں دفن کیا جائے تاکہ وہاں سے پانی گزر کر شہر میں آئے اور سب ہی اس سے فائدہ حاصل کریں۔

نبی کریم کے مزار انور سے تبرک

اهل المدينة قحطاً شديداً فشكروا الى عائشة فقالت انظروا قبر النبي صلى الله عليه وسلم فاجعلوا فيه كبرى الى السماء حتى لا يكون بينه وبين السماء سقف ففعلوا فمطر وامطر حتى نبت الدشب وسمنت الابل حتى تفتقت من الشحم فسمى عام الفتن سوراة اليلامى۔ مشکوٰۃ باب الکبريات ابن جوزا سے مڑی ہے ایک مرتبہ اہل مدینہ سخت قحط میں مبتلا ہو گئے یعنی بارش نہیں ہو رہی تھی تو انھوں نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے پاس شکایت کی۔ آپ نے فرمایا: نبی کریم کے مزار انور کی طرف دیکھو اور ان کے حجرہ سے محض سوراخ کر دو یہاں تک کہ آپ کی قبر انور اور آسمان کے درمیان کوئی چھت یعنی حجاب نہ رہے۔ پس صحابہ کرام نے ایسے ہی کیا۔ اتنی کثیر بارش ہوئی جس سے بہت بارش سے بہت سی گھاس اُگی۔ اونٹ وہ گھاس کھا کھا کر اتنے موٹے ہوئے کہ چربی کی وجہ سے ان کی گوبائیں وغیرہ پھٹ گئیں۔ اس سال کا نام ہی عام الفتن (پھٹنے کا سال) پڑ گیا۔

اس حدیث کے ماتحت علامہ علی قاری رحمۃ اللہ علیہ مرقاة میں بیان فرماتے ہیں۔ وقيل انه صلى الله عليه وسلم كان يستشفهم به عند الجدب فتسطن السماء فامرت عائشة بكشف قبره مباغتة في لا مستشفاع فلا يبقى بينه وبين السماء حجاب بيان کیا گیا ہے کہ نبی کریم کے توسل سے جب قحط سالی میں بارش طلب کی جاتی تو بارش ہو جاتی تھی۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے جو فرمایا کہ آپ کے مزار انور اور آسمان کے درمیان کوئی حجاب نہ رہے یہ توسل میں مباغتہ ثابت کرنا تھا۔ اسی طرح ایک واقعہ دلو انہم اذ ظلموا انفسهم الخ کے ماتحت بحوالہ مدارک گزر چکا ہے سمجھنے کے لیے کافی ہے طوالت سے بچنے کے لیے مختصار سے کام لیا جا رہا ہے ورنہ اور کئی

واقعات پیش کئے جاسکتے ہیں۔

صلی کے مزارات سے توسل

قال الامام الشافعی الى لا تقبل
بالی حنیفہ رحمۃ اللہ و اجبت الی قبرہ فاذا عرضت لی حاجۃ
صلیت رکعتین و سالت اللہ عند قبرہ فتقضى سؤلیا۔ شامی جلد اول
حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا قول یہ ہے کہ میں امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ
سے تبرک حاصل کرتا ہوں۔ آپ کے مزار انور پر حاضری دیتا ہوں جب کوئی حاجت
درپیش آتی ہے تو دو رکعت نماز نفل ادا کرتا ہوں۔ پھر امام ابو حنیفہ کی قبر کے پاس آکر
اللہ سے سوال کرتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ میری حاجت کو جلدی پورا کر دیتا ہے۔
معلوم ہوا کہ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ سوال تو اللہ تعالیٰ سے کرتے ہیں لیکن امام
اعظم رحمۃ اللہ علیہ کی قبر انور کے توسل سے۔ اور تبرک حاصل کرتے ہیں اور ان کی حاجت
پوری کی جاتی ہے۔ معروف الکرخی بن فیروز من المشائخ الکبار
مجتاب الدعوات یستقی بقبرہ و هو استاذ السمری السقطی۔

رد المختار جلد اول

سمری سقطی رحمۃ اللہ علیہ کے اُستاد کرنی بن فیر و جو بہت بڑے مشائخ سے
بچتے جن کی دعا کو قبول کیا جاتا تھا۔ ان کی قبر انور کے توسل سے دعا قبول کی جاتی تھی
حیات الانبیاء و اولیاء علیہم السلام حضرت ابوالدرداء سے حدیث مڑی ہے جس
کا کچھ حصہ یہ ہے: ان اللہ حرم علی الامرض ان یشاء اجساد الانبیاء
فنبی اللہ حی یسرق۔ رواہ ابن ماجہ مشکوٰۃ باب الجمعة
نبی کریم کا ارشاد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے زمین پر حرام کر دیا کہ وہ انبیاء کے کرام
کے جسموں کو کھائے۔ اللہ کے نبی زندہ ہوتے ہیں انکو رزق دیا جاتا ہے۔

اس پر مرقاۃ میں ہے: ولذا قبل اولیاء اللہ لایموتون و لکن
ینتقلون من دار الفناء الی دار البقاہ۔ اسی وجہ سے کہا گیا کہ اللہ تعالیٰ

کے ولی نہیں مرتے لیکن وہ ایک دار سے دوسرے دار میں منتقل ہوتے ہیں۔ یزرق کے
ماتحت لکھتے ہیں: ولاینافیہ ان یکون ہناک ریحاً حسی ایضا وہو
الظاہر المتبادر۔ وہ فرماتے ہیں کہ اگر انبیاء کو رزق دیے جائے کہ متعلق یہ کہا
جائے کہ ان کو فی الواقع حسار زرق دیا جاتا ہے یہ کوئی منافی نہیں بلکہ ظاہر متبادر ہی
ہے۔ والبیہقی فی کتاب حیاۃ الانبیاء عن انس ان النبی صلی اللہ علیہ

وسلم قال الانبیاء احياء فی قبورہم یرسلون (الحاوی للفتاویٰ)
بیہقی نے کتاب حیاۃ الانبیاء میں حضرت انس سے روایت کی ہے نبی کریم نے فرمایا:
کہ انبیاء کرام اپنی قبر میں زندہ ہوتے ہیں اور نماز ادا کرتے ہیں۔ الحاوی للفتاویٰ
میں بیہقی کے حوالہ سے ہی بیان کیا گیا ہے ان علی بعد موتی کعلی فی الحیوۃ
نبی کریم فرماتے ہیں کہ میرا علم وفات کے بعد بھی اسی طرح ہے جس طرح ظاہری زندگی میں
قال الشیخ عقیف الدین الیافعی الاولیاء مترجہ علیہم احوال یشاہدون
فیہا ملکوت السموات والارض وینظرون الانبیاء احياء غیر اموات
کما نظر النبی صلی اللہ علیہ وسلم الی موسیٰ علیہ السلام فی قبرہ
قال وقد تقرن ان ما جان للانبیاء معجزۃ جاز لا لانبیاء کرامۃ
بشرط عدم التحدی (الحاوی للفتاویٰ)

شیخ عقیف الدین یافعی فرماتے ہیں کہ اولیاء کرام پر احوال پیش کیے جاتے ہیں وہ
زمین و آسمان کے ملکوت کا مشاہدہ کرتے ہیں اور انبیاء کرام زندہ حالت میں دیکھتے
ہیں جس طرح کہ نبی کریم نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ان کی قبر میں دیکھا۔ شیخ یافعی فرماتے
ہیں کہ یہ ثابت ہے کہ جو خیر انبیاء کرام کے لیے بطور معجزہ ثابت ہو سکتی ہے وہ اولیاء
کرام کے لیے بطور کرامت ثابت ہو سکتی ہے البتہ انبیاء کرام کے معجزات بوقت معاضدہ ثابت
ہوتے ہیں لیکن کرامات میں معارضہ نہ ہونا شرط ہے۔ آخر میں بطور تبرک قبلہ استاذی
المکرم کی کتاب جلال الصدور سے ایک حوالہ مع ترجمہ نقل کر رہا ہوں۔ دلائل اس موضوع
پر اسی میں دیکھے جائیں۔ میں نے تو تراجم کا فرق بیان کرتے ہوئے صنف اس موضوع پر مختصر

بحث کردی جس پر تراجم کے فرق کا سمجھنا موقوف تھا۔

علامہ قسطلانی شراح بخاری مواہب لدنیہ میں فرماتے ہیں لا خرق بین موتہ و حیاتہ صلی اللہ علیہ وسلم فی مشاہدۃ الامتہ و معرفتہم باحوالہ السہم و نیاتہم و عزائمہم و خواطرہم و ذلک جلی عندہ لا خفاء بہ۔

(مواہب لدنیہ مع زرقانی جلد ثامن ص ۳۵۵) ترجمہ: آن حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ظاہری حیات طیبہ اور عالم برزخ کی زندگی مبارک میں اپنی امت کے مشاہدہ اور ان کے احوال و کیفیات قلبی ارادوں اور نیات عزائم و خواطر کی معرفت میں کوئی فرق نہیں اور امت کے سب امور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر واضح و منکشف ہیں۔ ان میں کسی قسم کا خفا اور پوشیدگی نہیں۔ (انتہی)

صلی اللہ علیہ وسلم کے جسم محفوظ رہتے ہیں۔ طحاوی میں آتا ہے کہ فان معاویہ لما اراد ان یحرقہ لیجری العین التي باحد عند قبوس الشہداء و جددہم کما د فسنوا حق ان المسحاة اصابت اصبع حمزة رضی اللہ عنہ فانقطرت دما فترکہ۔ طحاوی فی فضل الصلوۃ علیہ (علی الشہید) حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے جب احد کے شہداء کو کرام کی قبروں کو بدھنے کا ارادہ کیا تا کہ احد کے پتھروں کو جاسی کیا جاسکے۔ ان کو ایسے ہی پایا جیسے وہ دفن کئے گئے تھے یہاں تک کہ غلطی سے کندالی حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کی انگلی مبارک پر لگی تو خون جاری ہو گیا۔ پھر اسی حال پر ان شہداء کو کرام کو چھوڑ دیا گیا۔

اب اس وضاحت کے بعد ثابت ہو گیا کہ اولیائے کرام اور انبیائے کرام کو قبروں میں زندگی حاصل ہے۔ ان کے توسل سے دعا جائز ہے۔ کوئی مسلمان ان کو محبوب سمجھ کر پوچھتا نہیں۔ محبوب صرف اللہ تعالیٰ وحدہ لا شریک لہ ہے۔ اب بھی اگر کوئی مسلمان ان کو مشرک کہے اور اس آیت کریمہ کو ان پر ثابت کرنے کی کوشش کرے تو اللہ ہی اس کو ہدایت دے۔

صلی اللہ علیہ وسلم کے اجسام محفوظ رہنے میں راقم کو اس لیے بھی کامل یقین ہے کہ راقم کے

کے پردہ اوقاضی غلام نبی رحمۃ اللہ علیہ کی وفات کے ۱۸ سال بعد قبر میں سوراخ ہو جانے کی وجہ سے پانی بھر گیا۔ اس پانی کو نکالنے کے لیے آپ کے جسم مبارک کو قبر سے باہر نکالا گیا تو جسم صحیح اور کفن درست۔ ڈاڑھی مبارک میں غسل کے پانی کے قطرات موجود تھے۔

قُلْ ادْعُوا الدِّينَ زَعَمْتُمْ مِنْ دُونِهِ فَلَا يَمْلِكُونَ كَشْفَ الضُّعْفِ عَنْكُمْ وَلَا تَحْوِيلًا أُولَٰئِكَ الَّذِينَ يَدْعُونَ يَبْتَغُونَ إِلَىٰ رَبِّهِمُ الْوَسِيلَةَ أَيُّهُمْ أَقْرَبُ وَيَجُودُونَ رَحْمَةً وَيَخَافُونَ عَذَابَ إِنَّ عَذَابَ رَبِّكَ كَانَ مَحْظُورًا (۱۵۱)

• کہ پکارو جن کو سمجھتے ہو سوا اس کے نہیں اختیار رکھتے کہ تکلیف کھول دیں تم سے نہ بدل دیں۔ وہ لوگ جن کو یہ پکارتے ہیں ڈھونڈتے ہیں اپنے رب تک وسیلہ کہ کون بندہ بہت نزدیک ہے اور امید رکھتے ہیں اس کی مہر کی اور ڈرتے ہیں اس کی ما سے۔ بے شک تیرے رب کی مار ڈرنے کی چیز ہے۔ (شاہ محمد القادر)

• آپ فرما دیجیے کہ جن کو تم خدا کے سوا قرار دے رہے ہو ذرا ان کو پکارو تو وہی سو وہ نہ تم سے تکلیف دور کرنے کا اختیار رکھتے ہیں اور نہ اس کے بدل ڈالنے کا۔ اور نہ لوگ کہ جن کو مشرکین پکارتے ہیں وہ خود ہی اپنے رب کی طرف ذریعہ ڈھونڈ رہے ہیں کہ ان میں کون زیادہ مقرب بنتا ہے اور وہ اس کی رحمت کے امیدوار ہیں اور اس کے عذاب سے ڈرتے ہیں۔ واقعی آپ کے رب کا عذاب ہے بھی ڈرنے کے قابل (مولانا اشرف علی)۔

• کہو پکارو جن کو تم سمجھتے ہو سوائے اس کے، وہ اختیار نہیں رکھتے کہ کھول دیں تکلیف تم سے اور نہ بدل دیں وہ لوگ جن کو یہ پکارتے ہیں۔ وہ خود ڈھونڈتے ہیں اپنے رب تک وسیلہ کہ کون سا بندہ بہت نزدیک ہے اور امید رکھتے ہیں اس کی مہربانی کی اور ڈرتے ہیں اس کے عذاب سے۔ بے شک تیرے رب کا عذاب

دُرنے کی خبر ہے۔ (مولانا محمود الحسن)۔

ان سے کہو پکار دیجھو ان معبودوں کو جن کو تم خدا کے سوا (اپنا کارساز) سمجھتے ہو۔ وہ کسی تکلیف کو تم سے نہ ٹھا سکتے ہیں نہ بدل سکتے ہیں۔ جن کو یہ لوگ پکارتے ہیں وہ تو خود اپنے رب کے حضور رسائی حاصل کرتے کا وسیلہ تلاش کر رہے ہیں کہ کون ان سے قریب تر ہو جائے اور وہ اس کی رحمت کے اُمیدوار اور اس کے عذاب سے خائف ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ تیرے رب کا عذاب ہے ہی ڈرنے کے لائق (مودودی)۔ تم قراؤ پکارو انھیں جن کو اللہ کے سوا گمان کرتے ہو تو وہ اختیار نہیں رکھتے تم سے تکلیف دور کرنے اور نہ پھیر دینے کا وہ مقبول بندے تھیں یہ کافر پوجتے ہیں وہ آپ ہی اپنے رب کی طرف وسیلہ ڈھونڈتے ہیں کہ ان میں کون زیادہ مقرب ہے، اس کی رحمت کی امید رکھتے ہیں اور اس کے عذاب سے ڈرتے ہیں۔ بے شک تمھارے رب کا عذاب ڈر کی چیز ہے۔ (اعلیٰ حضرت)

اس مقام پر اولئکب الدین یدیعون کا ترجمہ اعلیٰ حضرت نے کیا ہے ”وہ مقبول بندے جنہیں یہ کافر پوچھتے ہیں“ دوسرے تراجم میں مطلقاً ذکر ہے اور ان پوچھنے کی بجائے پکارا جا رہا ہے اعلیٰ حضرت کے ترجمہ کی فوقیت یہ ہے کہ یہاں جن مجبوروں کا ذکر ہوا ہے وہ حضرت عزیر اور حضرت عیسیٰ علیہما السلام اور ملائکہ ہیں۔ وہ یقیناً مقبول بندے ہیں۔

اسی طرح بعض تراجم میں یہ ہے ”اور یہ لوگ کہ جن کو مشرکین پکار رہے ہیں“ لیکن
 اعلیٰ حضرت کے ترجمہ میں مشرکین کی جگہ کافر ہے۔ ”مخلصین یہ کافر پوجتے ہیں۔ اس لیے کہ اہل۔
 کتاب یہود و نصاریٰ پر مشرکین کے لفظ کا اطلاق اختلافی ہے لیکن کافر کا اطلاق اتفاقی
 ہے۔ اب تفسیر کبیر سے عبارت پیش کی جا رہی ہے جس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ معبودوں
 سے مراد حضرت عزیر اور حضرت عیسیٰ علیہما السلام اور ملائکہ ہیں۔ اسی طرح معبودوں
 کے مناسب لفظ پوجنا ہے نہ کہ پکارنا : وليس المراد الاصنام لانہ تعالیٰ
 قال فی صفتہم اولئک الذین یدعون یتغنون الی ربہم الوسیلۃ
 وابتغوا الوسیلۃ الی اللہ تعالیٰ لایلیق بالاصنام البتۃ ۔

یہاں بت مراد نہیں ہو سکتے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا وہ مجبور تو خود اپنے سے زیادہ
مقرب کا وسیلہ تلاش کرتے ہیں۔ (یعنی ان کو مجبور مانتے تو وہ تمہارے قول کے مطابق کثرت
مجبور ہونے کے اللہ سے مقابلہ کریں اور تم سے ضرر و نفع کو دور کریں۔ یہ ممکن نہیں)۔
بت تولیٰ فی سبیلہ تلاش کرنے سے عاجز ہیں: اُولَئِكَ الَّذِينَ يَدْعُونَ
هُمُ الْاَنْبِيَاءَ الَّذِينَ ذَكَرَهُمُ اللّٰهُ تَعَالٰی بِقَوْلِهِ وَلَقَدْ فَصَّلْنَا
بَعْضَ النَّبِيِّينَ عَلٰی بَعْضٍ وَتَعْلَقَ هٰذَا الْكَلَامُ بِمَا سَبَقَ هَرَانِ
الَّذِينَ عَظُمَتْ مُنْزِلَتُهُمْ وَهُمْ الْاَنْبِيَاءُ لَا يَعْبُدُونَ
الَّا اللّٰهَ وَلَا يَسْتَعِينُونَ الرَّسُولَ اِلَّا اِلَيْهِ فَاَنْتُمْ بِالْاَقْتِدَاءِ بِهِمْ حَقٌ
فَلَا تَعْبُدُوا غَيْرَ اللّٰهِ تَعَالٰی۔ یعنی اُولَئِكَ الَّذِينَ يَدْعُونَ سے مراد انبیائے کرام
جن کا ذکر اللہ تعالیٰ نے اپنے قول سے ماقبل کی آیت کریمہ میں بیان کیا ہے ولقد
فصلنا بعض النبیین علی بعض۔ ہم نے بعض انبیاء کو بعض پر فضیلت
دی۔ اس کلام کا تعلق ماسبق سے ہے۔ وہ جن کو عظیم مرتبہ عطا ہوا (وہ مقبول بندے
ہیں) اور وہ انبیائے کرام ہیں۔ وہ اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہیں کرتے۔ اپنے سے
مقرب (زیادہ مرتبے والے نبی) کا وسیلہ صرف اللہ کے قرب کے لیے ہی تلاش کرتے
ہیں۔ بتخصیص بھی ان کی اقتدا کا ہی حق پہنچتا ہے۔ پس تم بھی اللہ کے بخیر کسی کی عبادت نہ
کرد۔ اب اس وضاحت کے بعد اس میں سمجھنا مشکل نہ رہا
کہ وہ جن کو پوجا کا ذکر ہے وہ انبیائے کرام ہیں۔ وہ مقبول بندے ہیں۔ مراد عبادت
(پوجا کرنا ہے) صرف پکارنا نہیں۔ اور منع عبادت سے کیا ہے نہ کہ ان کے وسیلہ
سے۔ مقرب کا وسیلہ تو خود قرآن پاک سے ثابت ہوا اسے رد نہیں کیا گیا کیونکہ یستعین
الی سببہم الوسیلۃ فرمایا گیا ہے۔ ان کے ضرر و نفع کی نفی ان
کی الوہیت سے مفید ہونے کی صورت میں ہے مطلق نہیں ورنہ شفاعت، دعا
اور ان کے وسیلہ سے نفع کا اندفاع پہلے کسی مقامات پر پیش کیا جا چکا ہے۔

وَكَانَ وَرَثَتُهُمْ مِّمْلِكٌ يَأْخُذُ كُلَّ سَفِيْنَةٍ غَضْبًا ۝

اور تھا پھر ان کے ایک بادشاہ جو لے لیتا تھا ہر کشتی کو (شاہ رفیع الدین) کیونکہ آگے ایک ایسے بادشاہ کا علاقہ تھا جو ہر کشتی کو زبردستی چھین لیتا تھا۔

(مودودی)

ان کے پڑے تھا ایک بادشاہ جو لے لیتا تھا ہر کشتی کو چھین کر (مولانا محمود الحسن)۔

ان کے پڑے تھا ایک بادشاہ جو لے لیتا تھا ہر کشتی کو چھین کر (شاہ عبد القادر) اور ان لوگوں کے آگے کی طرف ایک بادشاہ تھا جو ہر کشتی کو زبردستی پکڑ رہا تھا۔

(مولانا اشرف علی)

اور ان کے سامنے (کی طرف) ایک بادشاہ تھا جو ہر ایک کو زبردستی چھین لیتا تھا (فتح محمد)۔

اور ان کے پیچھے ایک بادشاہ تھا کہ مراثیت کشتی زبردستی چھین لیتا۔ اعلیٰ حضرت یہاں حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت خضر علیہ السلام کا ذکر ہے جب کہ حضرت خضر علیہ السلام نے کشتی کو توڑ دیا تھا یعنی اس کے دو تختے اکھڑ دیے تھے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس پر تعجب کرتے ہوئے اس امر کو امر عظیم سمجھا کیونکہ کشتی بان نے ان حضرات سے کرایہ بھی وصول نہیں کیا تھا۔ اس وجہ سے بھی یہ بات حیران کن تھی کہ ایسے شخص کا نقصان کرنا بہت ہی امر عظیم ہے۔ تو حضرت خضر علیہ السلام نے ان کے اس تعجب پر مبینی سوال کا جواب دیتے ہوئے فرمایا کہ کشتی کو توڑنے کی وجہ یہ ہے کہ ایک بادشاہ ہے ان کے پیچھے جو ہر مراثیت کشتی کو چھین لیتا ہے اس لیے اس کشتی کو عیب ناک کیا ہے تاکہ اس سے بچ جائے اور معمولی مزدوری سے اس کو صحیح کرالے۔

یہ مضمون اعلیٰ حضرت کے ترجمہ سے زیادہ واضح ہے کیونکہ اگر وہ بادشاہ ہر کشتی کو چھین رہا تھا تو یہ بھی کشتی تھی باوجودیکہ عیب ناک تھی حالانکہ وہ تو فقط صحیح اور ثابت کو چھین لیتا۔ تفسیر کبیر میں ہے فلان ذلک العالم علوانہ لولہ

یحب تلك السفينة بالتحقيق يغصبها ذلک الملك وفانت منافعها عن ملاکها بالکلیۃ۔ یعنی آپ کو معلوم تھا کہ اگر وہ کشتی کو توڑ کر عیب ناک نہیں کرتے تو وہ بادشاہ اس کو چھین لے گا اور کشتی کے مالکوں کا مکمل طور پر نفع حاصل کرنا ختم ہو جائے گا۔

اس سے مقصد یہ حاصل ہوا کہ اعلیٰ حضرت کا ترجمہ تفسیر کے مطابق ہے اور بات کو مکمل طور پر سمجھاتا ہے۔

مُفْسِدُونَ فِي الْأَرْضِ ۝

دھوم اٹھاتے ہیں ملک میں۔ (مولانا محمود الحسن)؛ شاہ عبد القادر)۔

زمین میں فساد مچاتے ہیں۔ (اعلیٰ حضرت)۔

یہاں ذکر ہوا ہے سکندر ذوالقمرین کا جب ان کو ایک قوم نے کہا کہ یا جوج ماجوج زمین میں فساد مچاتے ہیں۔ ہم تمہیں پیسے جمع کر کے دیتے ہیں تم ہمارے او ان کے درمیان ایک دیوار بنا دو۔ اعلیٰ حضرت نے ترجمہ مفسدین کا کیا ہے زمین میں فساد مچاتے ہیں۔ دیگر مذکورہ تراجم میں ہے ”دھوم اٹھاتے ہیں“ حالانکہ اردو محاورہ میں اچھے کام کی شہرت ہو تو پھر بھی دھوم اٹھاتے ہیں یا دھوم مچاتے ہیں الفاظ استعمال ہوتے ہیں اس لیے دھوم اٹھانا مقصد کو واضح نہیں کرتا بلکہ مقصد کے مطابق یہ ہی ہے کہ زمین میں فساد مچاتے ہیں۔ ان کے فساد کو تفسیر کبیر میں اس طرح ذکر کیا گیا ہے :

واختلفوا فی کیفیتہ افساءہم فی الارض فقیل کانوا یقتلون الناس وقیل کانوا یاکلون لحوم الناس وقیل کانوا یشربون ایام المریبع فلا یستقون لہم شیتا اخضر بالجملة فلفظ الفساد محتمل لكل هذه الاقسام۔ یا جوج ماجوج کے زمین میں فساد پھیلانے میں مختلف قول ہیں کہ وہ کیسے فساد پھیلاتے تھے۔ ایک قول یہ ہے کہ وہ لوگوں کو قتل کر دیتے تھے۔ ایک قول یہ ہے کہ وہ لوگوں کا گوشت کھاتے تھے۔ ایک قول یہ ہے کہ موسم بہار میں نکلتے تھے۔

ان کے لیے کوئی سبز چیز یعنی درخت، پودے وغیرہ نہیں چھوڑتے تھے۔
 حاصل کلام یہ ہے کہ لفظ فساد ان تمام صورتوں کا احتمال رکھتا ہے کہ وہ ان قسموں
 میں سے ہر ایک کو شامل ہے یعنی وہ ان فساد کاموں میں سے ہر ایک کام کرتے تھے۔
 روح المعانی میں ہے: مفسدون فی الاموال فی ارضنا
 بالقتل والنزب وسائر وجوه الافساد المعروف
 من البشرد وہ زمین میں فساد مچاتے ہیں یعنی وہ ہماری زمین میں قتل و غارت
 تخریب کاری، ہر قسم کا غلط کام جو انسانوں سے واقع ہوتا ہے وہ کرتے ہیں۔
 معلوم ہو کہ ان مذکورہ معانی کو "فساد مچاتے ہیں" ترجمہ حاوی ہے نہ کہ "مضموم
 مچاتے ہیں"۔

قُلْ إِنَّمَا أَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ

آپ کہ دیجیے کہ میں تو ایسا تمہارا ہی جیسا بشر ہوں۔ (عبدالماجد دریا آبادی)۔
 کہ دو کہ میں تمہاری طرح کا ایک بشر ہوں۔ (فتح محمد)۔
 تو کہ میں ایک آدمی ہوں جیسے تم (محمود الحسن)۔
 تو کہ میں بھی ایک آدمی ہوں جیسے تم۔ (شاہ عبدالقادر)۔
 کہ سوائے اس کے نہیں کہ میں آدمی ہوں مانند تمہارے (شاہ رفیع الدین)۔
 آپ کہ دیجیے کہ میں تو تم ہی جیسا بشر ہوں۔ (اشرف علی)۔
 اے نبی کہو میں تو ایک انسان ہوں تم ہی جیسا (مودودی)۔
 تم فرماؤ ظاہر صورت بشری میں تو ایسا تم جیسا ہوں (اعلیٰ حضرت)۔
 اعلیٰ حضرت کے اس ترجمہ پر معترضین نے ان الفاظ میں اعتراض کیا :-
 "مولانا بریلوی نے یہاں تمہاری طرح کے ساتھ ظاہری صورت بشری کا اضافہ کر کے
 قرآنی مضموم کو اپنے عقیدے کے مطابق ڈھالنے کی سازش کی"۔ یہ اعتراض فقط مخالفت
 پر مبنی ہے یا نبی کریم کی حقیقت سے بے خبری کی علامت ہے اور نبی کریم کی نورانیت کا

انکار ہے حالانکہ قرآن پاک سے نبی کریم کی نورانیت روز روشن کی طرح عیاں ہے :
 قد جاءكم من الله نورا و کتاب مبین پ اس آیت کریمہ کی تفسیر میں علامہ آلوسی
 روح المعانی میں ذکر فرماتے ہیں : قد جاءكم من الله نور عظیم و هو نور الانوار
 والنبی المختار صلی اللہ علیہ وسلم تحقیق تمہارے پاس اللہ کی طرف سے نور عظیم آگیا
 جو تمام نوروں کا نور اور نبی المختار صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ اس کے بعد اس طرح ذکر کیا :
 وقال الطیبی انه ارفق لتکریب قوله سبحانه وتعالى قد جاءكم بغير عطف
 فخلق به اولاد وصف الرسالة والثانی وصف الکتاب ولا یبعد عندی ان
 یؤاد بالنور والکتاب المبین هو النبی صلی اللہ علیہ وسلم علامہ طیبی فرماتے ہیں کہ
 یہاں زیادہ مناسب یہ ہے کہ نور سے مراد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات ہی
 ہو کیونکہ پہلے یا اهل الکتاب قد جاءکم رسولنا ذکر فرمایا پھر بغیر عطف کے
 قد جاءکم من الله نور ذکر فرمایا۔ دونوں سے مراد ایک ہی ذات ہے۔ اسی
 لیے صرف عطف کو ذکر نہیں فرمایا لیکن صرف عطف مختار پر دلالت کرتا ہے علامہ آلوسی
 فرماتے ہیں کہ میرے نزدیک یہ کوئی بعید نہیں کہ نور سے مراد اور کتاب مبین سے مراد نبی
 کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہی ہیں۔ بلا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ شرح شفا میں یہی فرماتے ہیں
 وای مانع من ان یجعل البعثان للرسول صلی اللہ علیہ وسلم فانه
 نور عظیم لکمال ظهوره بین الانوار و کتاب مبین حیث انه جامع
 لجميع الاسماء ومظهر للحکام والاحوال والاخبار۔ کون سا امر مانع ہے
 کہ نور اور کتاب مبین دونوں ہی سے مراد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہوں کیونکہ آپ انوار
 کے درمیان کمال ظہور کے لیے نور عظیم ہیں اور آپ کتاب مبین اس لیے ہیں کہ آپ
 تمام اسرار کے جامع ہیں اور تمام احکام و احوال اور اخبار کے ظاہر کرنے والے ہیں۔
 البتہ معترضوں نے نور اور کتاب مبین سے مراد قرآن پاک لیا ہے جیسا کہ روح المعانی
 میں ہے : وقال ابو علی الجبائی عنی بالنور القرآن لکشفه و اظہاره طرف
 الهدی والیقین واقتصر علی ذلک الزمخشری۔ ابو علی جبائی نے

کہا کہ نور سے مراد قرآن پاک ہے کیونکہ قرآن پاک ہدایت و یقین کے طریق کو ظاہر اور
منکشف کرتا ہے۔ زمخشری بھی اسی کا قائل ہے۔ لیکن اہل علم حضرات سے یہ مخفی نہیں
کہ ابوعلی جہانی اور زمخشری مختزلہ کے امام اور رئیس مانے جاتے ہیں۔
نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی نورانیت کے انکار میں اس حد تک متجاوز ہونا کہ مختزلہ
کا مقلد بن جانا اور اکابر اہل سنت علامہ آلوسی صاحب روح المعانی اور علی قاری اور
دیگر مفسرین کرام کے اقوال سے روگردانی عقل و دانش کا کام نہیں۔ اور پھر نبی کریم
صلی اللہ علیہ وسلم کے مشہور ارشاد گرامی اول ما خلق اللہ نوری (سب سے پہلے
اللہ تعالیٰ نے میرے نور کو پیدا کیا) کو مولانا حسین احمد مدنی نے اَشہابِ ثناب میں
نقل کیا مولانا اشرف علی صاحب نشر الطیب میں نور محمدی کے باب میں کئی احادیث
بیان کرتے ہیں جن میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی نورانیت کا ذکر ہے۔ اور مولانا محمد قاسم
نانوتوی قصائد قاسمیہ میں اس طرح فرماتے ہیں :-

رہا جمال پہ تیرے حجابِ بشریت نہ جانا کسی نے تجھے بجز ستار
سوا خدا کے بھلا کوئی تجھ کو کیسا جانے تو نشستی تو ہے شیرِ غمط اولوالابصار
اپنے اکابر کی ان تحریروں کو پڑھنے کے بعد تو اعلیٰ حضرت کے ترجمہ پر اعتراض نہ کیا
جلئے کہ آپ نے ظاہر بشریت کہا ہے حالانکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حقیقت نور اور
ظاہر بشریت کے عقیدہ میں اعلیٰ حضرت منفرد نہیں بلکہ یہی عقیدہ سلف صالحین کا ہے
علامہ خفاجی شرح شفا میں لا یمکن فی سنة اللہ اس سال الملک الذلیم
هو من جنسہ او من خصہ اللہ کالانبیاء والرسل کے تحت فرماتے ہیں :-
فانہم خلقہم اللہ تعالیٰ بابدان بشریۃ واسرارہم ملکیتہ فکانوا دون غیہم
مستعذین لمقاومت الملک ومخالطۃ ومخاطبۃ (نسیم الریاض جلد ۱)
انبیاء اور رسولوں پر ملائکہ کا نزول اسی وجہ سے ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے
بدن ظاہری بشری بنائے لیکن ان کے ارواح ملکی یعنی نوری ہیں اسی وجہ سے انبیاء
ملائکہ سے میل جول اور خطاب کی طاقت رکھتے ہیں جب کہ دوسرے انسان اس طاقت

سے قاصر ہیں۔

اسی طرح نسیم الریاض جلد سوم میں اعلیٰ حضرت کے ترجمہ کے مطابق بعینہ الفاظ ملتے
ہیں ظاہرہ صلی اللہ علیہ وسلم بشری و باطنہ ملکی۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ظاہر بشری ہیں
اور باطنی ملکی ہیں۔

مذکورہ دلائل کی روشنی میں اعلیٰ حضرت کے ترجمہ کو دیکھیں تو اس سے انکار ممکن نہیں
کہ آپ کا ترجمہ کتنی بڑی تفصیل کو بالا اختصار حاوی ہے۔
اس مسئلہ نور و بشر کو اگر کوئی بالتفصیل دیکھنا چاہے تو اس ذاتی المکرم کی کتاب
تنویر الابصار کا مطالعہ کرے۔

قَالَ رَبِّ اِنِّیْ وَهْنَ الْعَظْمِ مِثِّیْ (پتا ۱)

بولالے رب میرے بوڑھی ہو گئیں ہڈیاں (شاہ عبدالقادر)۔
عرض کیا کہ اے میرے پروردگار میری ہڈیاں کمزور ہو گئیں۔ (اشرف علی)۔
بولالے رب میرے بوڑھی ہو گئیں میری ہڈیاں (محمود الحسن)۔
عرض کیا کہ اے میرے رب میری ہڈی کمزور ہو گئی (اعلیٰ حضرت)۔
یہ حضرت زکریا علیہ السلام کی پیرائہ سالی میں التجا ہے۔ اس مقام پر اعلیٰ حضرت
کے ترجمہ پر اعتراض کیا جاتا ہے۔ خاں صاحب اعظم کا ترجمہ ہڈی کرتے ہیں۔ تمام
مترجمین فارسی اور اردو اس کا ترجمہ جمع کے صیغہ میں ہڈیاں لکھتے ہیں۔ حالانکہ
کو یہ بھی معلوم نہیں کہ غظم پر الف لام کیسا ہے اور اس کا ترجمہ بصیغہ جمع تمام سلف
نے کیوں کیا۔ پہلے تو یہ غور کریں کہ یہاں حضرت زکریا علیہ السلام نے بیٹے کے لیے دعا
کی اور عرض کیا کہ میری ہڈی کمزور ہو گئی۔ اس ہڈی سے مراد صلب یعنی پشت کی ہڈی
مراد ہے جو نطفہ کی جائے قرار ہے۔ قرآن میں دوسرے مقام پر ارشاد ہوتا ہے :-
یخرج من بین الصلب والترائب جو نکلتا ہے پیٹھ اور سینوں کے بیچ
سے چونکہ مرد کا نطفہ پیٹھ میں ہوتا ہے۔ روح المعانی میں ہے :- وھن العظم

ای ضعف و اسناد ذلت الی العظم لانه عماد البدن و دعاء الجسد
 فاذا اصابه الضعف والرخاوة تداعی ماوسا و تساقطت
 قوته - یعنی وہن کا معنی کمزور ہے اور اس وہن کی نسبت ہڈی کی طرح
 کی گئی ہے کیونکہ وہ جسم و بدن کا ستون ہے جب وہ کمزور ہو جائے تو تمام کمزور ہو
 جاتا ہے اور قوت ختم ہو جاتی ہے یہاں سے سمجھ آتا ہے کہ بدن کا ستون اگر ٹھیک
 ہڈی ہی ہے اور وہی معتبر ہے۔ روح المعانی کی عبارت میں مفرد ضمائر بھی اس معنی
 پر وال ہیں :- و افرد علی ما قالہ العلامة من الریح حشری و اما تضاه کثیر
 من المحققین لان المفرد هو الدال علی معنی الجنسیة و المقصد الی
 ان الجنس الذی هو العمود والقوام و اشد ما ترکب منه الجسد
 قد اصابه الوهن - (روح المعانی) یہاں عظم (ہڈی) کو مفرد لایا گیا علامہ ریشتر
 نے بھی یہی کہا ہے اور کثیر محققین نے اسے ہی پسند کیا ہے کیونکہ مفرد وہ معنی جنسیہ پر
 دال ہے اور جنس سے مراد جسم کا ستون اور قوام ہے اور وہ سخت ہے جس سے جسم مرکب
 ہوتا ہے اور کبھی اس میں کمزوری آجاتی ہے مفرد معنی کثیر محققین کا پسندیدہ ہے اور مراد
 اس سے ریشتر کی ہڈی ہی ہے۔ و قد دلل الواحد هو الدال علی معنی
 الجنسیة والمراد ان هذا الجنس الذی هو العمود والقوام و اشد
 ما ترکب به الجسد قد اصابه الوهن - (مدارک)
 عظم (ہڈی) کو واحد ذکر کیا گیا ہے کیونکہ واحد یہاں معنی جنسیہ پر دال ہے اور جنس سے
 مراد وہ ستون اور قوام اور وہ سخت ہے جس سے جسم مرکب ہوتا ہے اور اس میں
 کمزوری واقع ہوتی ہے۔ مدارک سے بھی پتہ چلا کہ معنی مفرد والا ہی زیادہ مناسب ہے
 اب یہ کہنا کہ خال صاحب کو یہ بھی معلوم نہیں کہ الف لام جنسی ہے۔ اس سے یہ بہتر تھا
 کہ کہا جاتا کہ خال صاحب کو تو یہ معلوم تھا کہ الف لام جنسی ہے البتہ خال صاحب
 کے بغیر دو سرائل کو الف لام کا ترجمہ کرنا نہیں آیا کہ الف لام جنسی کا ترجمہ کیسے کیا جانا
 چاہیے۔ الف لام جنسی کا ترجمہ جمع سے نہیں کیا جاتا۔ الرجل خیر من المرأة

یعنی ماہیت رجل ماہیت مرآة سے بہتر ہے۔ اور یہ معنی نہیں کہ افراد رجل افراد مرآة
 سے بہتر ہیں۔ (ایضاح المطالب شرح کافیہ مولانا مشیت اللہ دیوبندی)۔
 ان الجنسی ما یشتر بہا الی ماہیة الشئ من غیر ملاحظۃ الوحدة والکثرة
 (تحریر سندھ) الف لام جنسی سے کسی چیز کی ماہیت کی طرف
 اشارہ ہوتا ہے وحدت و کثرت کا لحاظ نہیں ہوتا۔ الف لام جنس آنرا گویند کہ اشارہ کند
 بسوی ماہیة مدخل خود قطع نظر از فرد و افراد (جامع الفوائد) الف لام جنسی اسے
 کہتے ہیں کہ جس سے ماہیت کی طرف اشارہ ہو کسی ایک فرد یا زیادہ افراد کا لحاظ نہ
 کیا جائے جب کہ الف لام جنسی کثرت یعنی جمع کے معنی کو مستلزم ہی نہیں تو پھر جمع
 کا معنی کرنے پر اصرار کیوں اور اپنی لاعلمی کو دوسرے پر محمول کرنا کہاں کی دانش ہے۔

فَخَرَجَ عَلَى قَوْمِهِ مِنَ الْمِحْرَابِ (پ ۱۸)

- پھر وہ اپنی قوم کے روبرو حجرہ میں سے برآمد ہوئے (عبداللہ ماجہ دریا آبادی)۔
- پس نکلا اوپر قوم اپنی کے محراب سے۔ (شاہ رفیع الدین)۔
- پھر نکلا اپنے لوگوں کے پاس حجرے سے (شاہ عبدالقادر) (مولانا محمود الحسن)
- پس حجرے میں سے اپنی قوم کے پاس برآمد ہوئے۔ (اشرف علی)۔
- چنانچہ وہ محراب سے نکل کر اپنی قوم کے سامنے آیا (مووودی)۔
- تو اپنی قوم پر مسجد سے باہر آیا۔ (اعلیٰ حضرت)۔

حضرت زکریا علیہ السلام کا ذکر ہے جب آپ محراب سے اپنی قوم پر باہر تشریف
 لائے۔ یہاں محراب کا معنی باقی حضرات نے حجرہ کیا ہے لیکن اعلیٰ حضرت کے ترجمہ میں
 محراب کو مسجد معنی میں لیا گیا ہے۔ تفاسیر میں بھی محراب کو مسجد کے معنی میں لیا گیا ہے
 حجرہ عام ہے کسی کمرہ پر بھی بولا جاسکتا ہے لیکن مسجد خاص ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ
 حجرہ کا اطلاق مسجد پر ضروری ہے جلالین میں ہے: من المِحْرَابِ ای مسجد
 وکانوا یستظرون فقہا ً یصلوا فیہ بامرہ علی العادة - یعنی محراب سے مراد

مسجد ہے۔ لوگ آپ کے کھولنے کے منتظر رہتے تھے تاکہ بحسب اوقات آپ کے حکم سے اس میں نماز ادا کریں۔ جمل میں ہے: وَكَانُوا يَنْتَظِرُونَ اَلْمَحْكَانَ هُوَ مَقْبَلُهُ وَلَا يَفْتَحُهُ اِلَّا وَقْتُ الصَّلَاةِ وَلَا يَدْخُلُونَهُ اِلَّا بِاِذْنِهِ۔ آپ اس میں مقیم رہتے تھے سوائے نماز کے وقت کے۔ اس کو نہیں کھولتے تھے۔ اولہ لوگ آپ کی اجازت کے بغیر اس میں داخل نہیں ہوتے تھے۔ رُوحِ المعانی میں ہے: مِنَ الْمَحْرَابِ اَيُّ مَنْ الْمَصْلٰی یعنی نماز کی جگہ (مسجد) سے نکلے۔ ویسی ہی محل العبادۃ محراب الممان العابد کالمحارب للشیطان ذیہ (روح المعانی) عبادت کی جگہ کو محراب کہا جاتا ہے کیونکہ عابد وہاں شیطان سے لڑائی کرتا ہے کیونکہ محارب کا معنی لڑائی کرنا ہے۔ مدارک میں ہے: مِنَ الْمَحْرَابِ اَيُّ مَنْ مَوْضِعُ صَلَواتِهِ وَكَانُوا يَنْتَظِرُوْنَهُ۔ محراب سے مراد نماز و اہل کی جگہ (مسجد) ہے۔ لوگ آپ کی انتظار فرماتے تھے۔

ان تقاسیر کے بیان کو سامنے رکھتے ہوئے یہ کہنا مشکل نہیں کہ محراب کا معنی مسجد ہی زیادہ مناسب ہے اس لیے کہ حجرہ ضروری نہیں کہ نماز کی جگہ ہو اور مسجد کو بھی شامل ہو۔ جلالین اور جمل کی عبارات سے یہ عقیدہ بھی حل ہو گیا کہ مراد مسجد ہی ہے۔ عام حجرہ میں کبھی کبھی نماز ادا کر لی جاتی ہو یہ مراد نہیں بلکہ عام لوگ اس میں نماز پڑھتے تھے اور اس کی چابی حضرت زکریا کے پاس ہوتی تھی اور آپ اسے نماز کے وقت کھولتے تھے۔ یہ واضح حقائق اس کا بین ثبوت ہیں کہ مراد مسجد ہے۔

وَاتَيْنَاهُ الْحُكْمَ صَبِيًّا (پہلے)

- اور دیا ہم نے اس کو حکم کرنا لڑکپن میں۔ (شاہ عبد القادر)۔
- اور دیا ہم نے اس کو حکم لڑکپن سے (شاہ رفیع الدین)۔
- اور ہم نے اُن کو لڑکپن میں سمجھ دے دی تھی (عبد الماجد دریا آبادی)۔
- اور ہم نے اُن کو لڑکپن ہی میں دانائی عطا فرمائی۔ (فتح محمد)۔

- اور دیا ہم نے اس کو حکم کرنا لڑکپن میں (محمود الحسن)۔
- اور اُن کو لڑکپن ہی میں سمجھ عطا فرمائی (مولانا اشرف علی)۔
- ہم نے اسے بچپن ہی میں حکم سے نوازا۔ (مودودی)۔
- اور ہم نے اسے بچپن ہی میں نبوت دی۔ (اعلیٰ حضرت)۔

باقی حضرات کے تراجم میں تو حکم کرنا مذکور ہے۔ اسی طرح دانائی سمجھ عطا کرنا لیکن اعلیٰ حضرت کے ترجمہ میں یہ ہے کہ ہم نے نبوت دی۔ اس معنی کی تائید کی تفسیر کبیر کو دیکھا جائے جس میں یہ مذکور ہے: وَالْاَقْرَبُ حَمْلُهُ عَلَى الْمُنْبُوءَةِ لَوَجْهِهِنِ الْاَوَّلِ اِنَّ امْتَنَ تَعَالٰی ذَكَرَ فِيْ هَذِهِ الْاٰیَةِ صِفَاتٍ شَرَفٍ وَمَنْقِبَةٍ وَمَعْلُومٌ اَنَّ الْمُنْبُوءَةَ اشْرَفُ صِفَاتِ الْاِنْسَانِ فَذَكَرَهَا فِيْ مَعْرِضِ الْمَدْحِ اَوَّلٰی مَنْ ذَكَرَ غَيْرَهَا فَوْجِبَ اَنْ تُكْرَمَ نُبُوَّتُهُ مَذْكَوْمًا فِيْ هَذِهِ الْاٰیَةِ وَلَا لَفْظٌ يَصْلَحُ لِلدَّلَالَةِ عَلَى الْمُنْبُوءَةِ الْاِهْذِهِ اللَّفْظَةُ فَوْجِبَ حَمْلُهَا عَلَيْهَا۔ وَالثَّانِیْ اَنَّ الْحُكْمَ هُوَ مَا يَصْلَحُ لَنْ يُحْكَمَ بِهِ عَلَى غَيْرِهِ وَالْخِيَرَةُ عَلَى الْاِطْلَاقِ وَذَلِكَ لَا يَكُونُ اِلَّا بِالْمُنْبُوءَةِ۔ تفسیر کبیر میں علامہ رازی رحمۃ اللہ علیہ نے حکم کے مختلف معانی بیان کرتے ہوئے ایک معنی نبوت کیا ہے اور حکم بمعنی نبوت کے زیادہ بہتر سمجھتے ہوئے اس پر دلائل قائم کرتے ہوئے فرماتے ہیں: حکم کو نبوت کے معنی میں لینا زیادہ مناسب ہے۔ اس کی دو وجہ ہیں۔ ایک تو یہ ہے کہ اس آیت میں حضرت یحییٰ علیہ السلام کی صفات میں سے اشرف صفات کا ذکر فرمایا اور آپ کی منقبت بیان کی ہے اس لیے یہ بات یقیناً ثابت ہے کہ انسان کی صفات میں سے اشرف صفت نبوت ہی ہے اس لیے مقامِ مدح میں اسی کا ذکر کرنا بہ نسبت اوصاف کے زیادہ مناسب ہے۔ لہذا ضروری ہے کہ اس آیت میں نبوت کا ذکر ہو اور نبوت پر دلالت کرنے کے لیے اس لفظ (حکم) کے بغیر اور کوئی لفظ نہیں۔ اس لیے ضروری ہے کہ اس کو نبوت کے معنی میں لیا جائے۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ بغیر حکم دینا یعنی اوامر و نواہی، جزا و سزا کا علی الاطلاق

بغیر نبوت کے ممکن نہیں اس لیے بھی حکم کو بمعنی نبوت لینا زیادہ مناسب ہے۔

وَعَصَىٰ رَبِّهِ فَغَوَىٰ (پلا ۱۶)

- اور حکم ٹالا آدم نے اپنے رب کا پھر راہ سے بہکا۔ (شاہ عبد القادر)۔
- اور آدم نے نافرمانی کی اپنے رب کی۔ پس گمراہ ہوئے (مولوی عاشق الہی میرٹھی)۔
- حکم ٹالا آدم نے اپنے رب کا پھر راہ راست سے بہکا (مولانا محمود الحسن)۔
- آدم سے اپنے رب کا قصور ہو گیا سو غلطی میں پڑ گئے۔ (مولانا اشرف علی)۔
- آدم نے اپنے رب کی نافرمانی کی اور راہ راست سے بھٹک گیا۔ (مؤدودی)۔
- آدم سے اپنے رب کا قصور ہو گیا سو وہ غلطی میں پڑ گئے (عبد المجاہد دریا آبادی)۔
- آدم سے اپنے رب کے حکم میں لغزش واقع ہوئی جو مطلب چاہا تھا اس کی راہ د پائی۔ (اعلیٰ حضرت)

اس مقام پر اعلیٰ حضرت نے ترجمہ کرتے وقت حضرت آدم علیہ السلام کے مقام کو مد نظر رکھتے ہوئے ترجمہ کیا کیونکہ نبی کا گمراہ ہونا، بہک جانا، بھٹک جانا، غلطی میں پڑ جانا شان نبوت کے خلاف ہے اسی وجہ سے اعلیٰ حضرت نے ادبِ احترام پر مبنی الفاظ کو استعمال کیا۔ اس مقام پر علامہ رازی رحمۃ اللہ علیہ نے تفسیر کبیر میں اس طرح ذکر فرمایا:

ان ظاہر القمات وان دل علی ان آدم عصی وغویٰ لکن لیس لاحد ان یقول ان آدم کان عاصیا غاویا۔ یعنی بیشک ظاہر قرآن پاک اگرچہ دلالت کرتا ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام سے عصیاں غواہیت واقع ہوئے لیکن کسی کو یہ کہنے کا کوئی حق نہیں کہ وہ یہ کہے کہ حضرت آدم علیہ السلام نے حکم ٹالا، وہ گمراہ ہوئے، بھٹک گئے۔ یعنی مقصد یہ ہے کہ یہ الفاظ اللہ تعالیٰ نے استعمال فرمائے جس کو حق پہنچا ہے۔ وہ اپنے بندے کے حق میں جو الفاظ استعمال کرے لیکن وہی حقیقتاً ان کے معانی سے بھی آگاہ ہے۔ روح المعانی میں ہے: وقد صرح القاضي ابوبکر بن العربی بعد من جواز نسبة العصیان للآباء الاذنیین البینا المماثلین

لنا فکیف یجوز نسبة الذنب لآباء الاقدام والنبی المقدم الکرم وامر تفضی ذلک القریبی۔

قاضی ابوبکر نے صراحت بیان فرمایا کہ عصیاں یعنی نافرمانی، بھٹک جانا، بہک جانا، گمراہ ہو جانا، اس قسم کے الفاظ کی نسبت جب ہم اپنے والدین، آباؤ اجداد کی طرف نہیں کر سکتے اور یہ جائز نہیں تو انبیائے کرام جو کہ برگزیدہ، مکرم اور ہر طرح تعظیم و تکریم کے لحاظ سے مقدم ہیں انکی طرف ایسے الفاظ کی نسبت کیونکر ہو سکتی ہے بمعالم التنزیل میں ہے: واعلم انه لا یجوز اطلاق العاص وغیره علی آدم علیہ السلام لان انما یتقال عاصی لمن اعتاد فعل المعصیۃ کا الرجل یخیط ثوب ولا یقال هو خياط حتی یحاد ذلک ویعتاد۔ یہ یقین بات ہے کہ آدم علیہ السلام ہر عاصی وغیرہ کے الفاظ یعنی نافرمان ہوا، بہک گیا، حکم ٹالا، گمراہ ہوا، قصور کیا، غلطی میں پڑ گیا، بھٹک گیا، اکا اطلاق جائز نہیں اس لیے کہ عاصی تو اسے کہیں گے جو عصیاں بار بار کرے اور اس کی عادت بنائے جس طرح کوئی آدمی کپڑا سیتا ہے اسے اس وقت تک عیاط (دوری) نہیں کہیں گے جب تک وہ دوبارہ نہ کرے اور عادت نہ بنائے۔ اسی طرح آدم علیہ السلام کے بارے میں یہ تو کہیں گے کہ ان سے موصول واقع ہوئی، لغزش واقع ہوئی، لیکن معاذ اللہ صاحب ایمان جو شان انبیائے کرام سے واقف ہو اس کے لیے تو ممکن ہی نہیں کہ وہ کہے کہ نبی نے رب کا حکم ٹال دیا، نبی بہک گیا، نبی نے قصور کیا، نبی غلطی میں پڑ گیا، نبی بھٹک گیا، نبی گمراہ ہو گیا۔ ہر صاحب خرد ان الفاظ سے جو آدم علیہ السلام کی طرف منسوب کیے گئے ہیں اور اعلیٰ حضرت کے ترجمہ میں جو الفاظ آپ کی طرف منسوب کئے گئے ہیں، فرق سمجھ سکتا ہے۔ یہ بات خود بخود واضح ہے کہ جس مقام پر بڑے بڑے جلیل القدر مفسرین کرام تاویلات کرتے نظر آتے ہیں اور عاصی اور غاوی کے الفاظ کو براہ راست «بغیر تاویل کیے» آدم علیہ السلام پر جمول کرتے ہوئے چکپاتے ہیں اور اس نازک مرحلہ میں اپنے ایمان کی کشتی کو بھنور میں پھنسنے سے گھبراتے ہوئے تاویلات کر کے اپنے آپ کو بچاتے ہیں تو ان کے شانہ نشانہ اعلیٰ حضرت بھی ترجمہ کرتے ہوئے اردو زبان میں

وہ الفاظ استعمال کرتے ہیں جن سے سلامتی کے کنارے کشتی کو پار لگاتے ہیں لیکن اس کے عکس دیگر مترجمین اللہ کے نبی کو بہک گیا، بھٹک گیا، گمراہ ہو گیا کہ کون کس طرح وادیِ خاددا میں بھٹکتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اس پر تبصرہ کرنے کی ضرورت نہیں۔ ہر ذی دانش تراجم پر نظر کرنے سے تفاوت مقامات اور علمی سطح کا اندازہ خود کر سکتا ہے۔

اِذَا وَحْيًا إِلَىٰ امِّكَ مَائُوْحٰی ﴿۱۶﴾

• یاد کرو وہ وقت جب کہ ہم نے تیری ماں کو اشارہ کیا۔ ایسا اشارہ جو وحی کے فریہ سے ہی کیا جاتا ہے۔ (مودودی)۔

- جب حکم بھیجا ہم نے تیری ماں کو جو آگے سناتے ہیں۔ (محمود الحسن)۔
- جب حکم بھیجا ہم نے تیری ماں کو جو آگے سناتے ہیں۔ (شاہ عبدالقادر)۔
- جب ہم نے تمہاری والدہ کو الہام کیا تھا جو تمہیں بتایا جاتا ہے۔ (فتح محمد)
- جس وقت کہ وحی ڈالی ہم نے طرف ماں تیری کے وہ چیز کہ وحی کی جاتی ہے۔ (شاہ رفیع الدین)۔

• ہم نے تیری ماں کو الہام کیا جو الہام کرتا تھا۔ (اعلیٰ حضرت)۔

یہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی والدہ کا ذکر ہے۔ یہاں ظاہر طور پر یہ ہم ہوتا تھا کہ موسیٰ علیہ السلام کی والدہ کی جانب وحی آئی تو کیا وہ مقام نبوت پر فائز تھیں؟ اس کا ازالہ مفسرین نے اس طرح کیا ہے کہ یہاں وحی معنی الہام ہے۔ اور الہام کے لیے نبی کا ہونا ضروری نہیں۔ الہام غیر نبی کو بھی ہوتا ہے۔ اعلیٰ حضرت کا ترجمہ اس مقصد کو واضح کرتا ہے کیونکہ آپ کے ترجمہ پر یہ اعتراض نہیں ہو سکتا بلکہ پہلے ہی اس کو زائل کر دیا گیا ہے۔ لیکن جب یہ ترجمہ کیا جائے کہ ”جب حکم بھیجا ہم نے تیری ماں کو“ تو اس میں وہ اعتراض برقرار ہے کہ ہو سکتا ہے وہ حکم بواسطہ جبرائیل بھیجا گیا ہو اور موسیٰ علیہ السلام کی والدہ نبی ہوں۔ اسی وجہ سے اعلیٰ حضرت کے ترجمہ کو فوقیت حاصل ہے کہ اس میں اعتراضات کو زائل کر دیا جاتا ہے اور ترجمہ تفاسیر کے مطابق ہوتا

ہے۔ مدارک نے مائوْحٰی کے بعد منا اور الہام کے الفاظ کو ذکر کیا یعنی آپ کو الہام ہوا (کسی چیز کا منکشف ہونا) یا آپ کو سوئے ہوئے خواب میں یہ حکم دیا گیا ہے۔ علامہ رازی نے بھی تفسیر کبیر میں وحی کو معنی الہام یا خواب یا دل میں نچتہ ارادہ کا پایا جانا لیا ہے اور وجہ ان تاویلات کی یہ بیان کی ہے۔ اذاً وحیاً فقد

اتفق الاکثرون علی ان ام موسیٰ علیہ السلام ماکانت من الانبیاء والرسول فلا یجوز ان یکون المراد من هذا الوحی

هو الوحی الواصل الی الانبیاء وکیف لا نقول ذلك والمرأة لا تصلح لتلقض امر والامامة بل عند الشافعی رحمه الله لا تمکن من تنویرها نفساً فکیف تصلح للنبوۃ۔ اکثرین کا اتفاق ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کی والدہ نبی نہیں تھیں نہ ہی رسول تھیں پس اسی وجہ سے یہ جائز نہیں کہ اس وحی سے مراد وہ وحی ہو جو انبیاء کی طرف آتی ہے۔ یہ ہم کیسے نہ کہیں کیونکہ عورت جبکہ قاضی اور امام نہیں بن سکتی بلکہ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک تو وہ اپنا نکاح بھی خود بخیر ولی کی اجازت کے نہیں کر سکتی تو نبی کیسے بن سکتی ہے۔

اسی وجہ سے مذکورہ بالا توجہات کی ضرورت درپیش آئی۔ اعلیٰ حضرت کا ترجمہ بھی اس مقصد پر دال ہے۔ نیز مولوی فتح محمد صاحب کا ترجمہ جو انھوں نے کیا یوْحٰی کا کیا ہے، مقصد کے خلاف ہے۔

وَفَتَّلَتْ فُتُوْنَا ﴿۱۷﴾

• اور جانچا ہم نے تجھے ایک ذرا جانچنا (محمود الحسن)۔

• اور جانچا تجھے کو ایک ذرا جانچنا۔ (شاہ عبدالقادر)۔

• اور آزمایا ہم نے تجھے کو آزمائش۔ (شاہ رفیع الدین)۔

• اور خوب تجھے جانچ لیا (اعلیٰ حضرت)۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کا ذکر یہاں ہے کہ ہم نے تمہیں غموں سے نجات اور

کئی قسم کی آزمائشوں میں مبتلا کیا۔ اعلیٰ حضرت کا ترجمہ خوب جانچ لیا یعنی کئی آزمائشوں میں مبتلا کیا۔ دوسرے مذکورہ تراجم میں ہے ایک ذرا جانچنا۔ لفظ فتون مصدر ہو یا جمع ہو، قلت کے معنی پر دال نہیں اور نہ تنوین کو تفتیل کے معنی میں لینے کی ضرورت ہے کیونکہ مصدر ہو تو تاکید کے معنی کو مستلزم ہے اور تاکید کے لحاظ پر صرف اتنا ترجمہ کافی ہے۔ جانچا ہم نے تجھے جانچنا۔ اور جمع کے لحاظ پر معنی ہی یہ ہوگا جو اعلیٰ حضرت نے کیا ہے: فتونا وجهان احد هما انت مصدر کا العکوف والجلوس والمعنى وفتناك حقاً كقوله تعالى وكلمنا سبطاً موسیٰ تكليماً والشافی انه جسم فتن او فتنه ای فتناك ضرور یا من الفتن (المؤمن الكبير) فتون میں دو وجہیں۔ ایک یہ ہے کہ وہ مصدر ہے جس طرح عکوف اور جلوس مصدر ہیں اور معنی یہ ہے فتناك حقاً یعنی ہم نے تمہیں یقیناً آزمایا ہے جسے اللہ تعالیٰ کے ارشاد گرامی میں ہے: وكلمنا سبطاً موسیٰ تكليماً۔ اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام سے یقیناً کلام کی۔ یا یہ معنی کیا جائے۔ اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام سے کلام کی کلام کرنا۔ جس طرح یہاں قلت کا معنی مقصود نہیں اسی طرح فتونا میں بھی قلت کا معنی مقصود نہیں۔

اور دوسری وجہ یہ ہے کہ فتونا فتن یا فتنہ کی جمع ہے اور اب اس صوت میں معنی یہ ہوگا کہ ہم نے تمہیں کئی قسموں کی آزمائشوں سے آزمایا۔ اسی کے مطابق اعلیٰ حضرت کا ترجمہ ہے کہ ہم نے تجھے خوب جانچ لیا۔

قَالُوا سَمِعْنَا فَتًى يَذْكُرُهُمْ يُقَالُ لَهُ إِبْرَاهِيمُ دَبَّ ۝

• وہ بولے ہم نے سنا ہے ایک جوان ان کو کچھ کہتا اس کو پکارتے ہیں ابراہیم۔

(شاہ عبد القادر)

• بولے ہم نے ایک نوجوان کو ان کا ذکر کرتے سنا تھا جس کا نام ابراہیم ہے۔

(مؤدودی)

• کہا انھوں نے ہم نے ایک جوان کو کہ ذکر کرتا تھا ان کا کہتے ہیں اس کو ابراہیم۔

(شاہ فیض الدین)

• وہ بولے ہم نے سنا ہے ایک جوان بتوں کو کچھ کہتا ہے اس کو کہتے ہیں ابراہیم (محمود الحسن)۔

• بعضوں نے کہا کہ ہم نے ایک نوجوان آدمی کو جس کو ابراہیم کہتے ہیں پکارا جاتا ہے، ان بتوں کا ذکر کرتے سنا۔ (مولانا اشرف علی)۔

• لوگوں نے کہا کہ ہم نے ایک جوان کو ان کا ذکر کرتے ہوئے سنا ہے اس کو ابراہیم کہتے ہیں۔ (فتح محمد)

• ان میں کچھ بولے ہم نے ایک جوان کو انھیں برا کہتے سنا جسے ابراہیم کہتے ہیں۔ (اعلیٰ حضرت)۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ذکر ہو رہا ہے جبکہ آپ نے بتوں کو توڑ دیا تو آپ کی قوم جب اپنے میلے سے واپس آئی تو کہنے لگے کہ یہ ہماری بتوں سے ایسا کام کس نے کیا؟ تو ان میں کچھ نے کہا کہ ہم نے ابراہیم کو ان بتوں کو برا کہتے سنا۔

اعلیٰ حضرت کے ترجمہ سے یہ ظاہر ہے کہ ابراہیم علیہ السلام بتوں کے عجیب نکالتے تھے ان کو برا کہتے تھے جبکہ دیگر تراجم میں یہ ظاہر نہیں کیونکہ بتوں کو کچھ کہنا یا ان کا ذکر کرنا ان کے عجیب نکالنے اور ان کے برا کہنے کو مستلزم نہیں جبکہ مقصود یہی ہے۔ اسی طرح یہ کلام ان میں سے بعض کی تھی جنھوں نے ابراہیم علیہ السلام کی کلام کو سنا ہوا تھا نہ کہ تمام کی۔

دوسرے مذکورہ تراجم میں سے بعض نے مطلقاً یہ ذکر کیا "وہ بولے"۔ اس سے یہ نہیں سمجھ میں آتا کہ یہ کلام بعض کی تھی یا کہ تمام کی۔

یہ دونوں فرق جو بیان کئے گئے ہیں ان پر تفاسیر کو دیکھیں:۔ قالوا ای بعض منهم وہ الذین سمعوا قولہ علیہ السلام۔ (روح المعانی)

یعنی ان میں سے بعض نے کہا جنھوں نے حضرت ابراہیم علیہ السلام سے سنا تھا

کہ آپ سے ایسا سلوک کریں گے جو ان کے سامنے آیا۔ سمعنا فتی یذکرہم
یعینہم فلعل الذی فعل ذلک بہم۔ (روح المعانی) ہم نے ایک جوان کو ان
کے عجیب نکالتے سنا، شاید اسی نے ان سے یہ کام کیا ہوگا۔ قالوا ای بعضہم
لبعض سمعنا فتی یذکرہم ای یعینہم یقال لہ ابراہیم (جلالین)
بعض نے بعض کو کہا ہم نے ایک جوان کو انہیں برا کہتے سنا جسے ابراہیم کہتے ہیں۔
اب واضح ہو کہ اعلیٰ حضرت کے ترجمہ میں یہ واضح ہے کہ کلام بعض کی تھی اور
ابراہیم علیہ السلام بتوں کی برائی بیان کیا کرتے تھے۔

قَالَ بَلْ فَعَلَ كَبِيرُهُمْ هَذَا (پ ۱۰)

- بولا نہیں، پر یہ کیا ان کے اس بڑے نے۔ (شاہ عبدالقادر)۔
- بولا نہیں، پر یہ کیا ان کے اس بڑے نے (محمود الحسن)۔
- انھوں نے فرمایا کہ نہیں بلکہ اس بڑے نے کی (مولانا اشرف علی)۔
- اس نے جواب دیا بلکہ یہ سب کچھ ان کے اس سردار نے کیا ہے۔ (مودودی)۔
- کہا بلکہ کیا ہے اسکو بڑے ان کے نے یہ (شاہ رفیع الدین)۔
- فرمایا بلکہ ان کے اس بڑے نے کیا ہوگا۔ (اعلیٰ حضرت)

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جب بتوں کو توڑ دیا، کلہاڑا سب سے بڑے
بت کے کندھے پر رکھ دیا جب وہ لوگ واپس آئے تو آپ سے پوچھنے لگے کہ
یہ کام تم نے کیا ہے؟ تو آپ نے یہ جواب دیا۔

اب بظاہر یہ اعتراض ہوتا ہے کہ اگر آپ نے اس بڑے بت کی طرف اشارہ
کرتے ہوئے یہ فرمایا کہ اس بڑے نے یہ کام کیا ہے تو چھوٹ لازم آتا ہے جبکہ
اس بت میں یہ صلاحیت ہی نہیں تھی کہ وہ دوسرے بتوں کو توڑ سکتا۔ تو آپ نے
یہ کیسے فرمایا؟ اس کے جواب میں مفسرین کرام نے مختلف توجیہات پیش کی ہیں۔
ان میں سے ایک یہ ہے: : یکون حکایتہما یلزم علیٰ حدیثہم

کأنہ قال لہم ما شکرون ان یفعلہ کبیرہم فان من حق من یعبد ویدعی
الہما ان یقدس علیٰ ہذا واشد منہ (کبیر) ان کے مذہب کے مطابق ہو لازم آتا
ہے اس کی حکایت ہے، گویا کہ انھیں آپ نے فرمایا، تم تو ان کے بڑے کے فعل کا
انکار نہیں کر سکتے کیونکہ جس کو مجبود سمجھتے ہو اور اس کے خدا ہونے کے دعویدار
ہو اس کو یہ کام کرنے کی قدرت ہونی چاہیے بلکہ وہ اس سے بھی زیادہ کام کرنے کا
حق دار ہونا چاہیے۔

اسی توجیہ کے مطابق اعلیٰ حضرت کا ترجمہ ہے کہ یہ کام ان کے اس بڑے نے
کیا ہوگا جس کو تم خدا سمجھ کر عبادت کرتے ہو۔ تمہارے خیال میں تو یہ کام اس نے
ضرور ہی کیا ہوگا۔ آپ کا یہ ترجمہ اس وہم کو بھی زائل کر رہا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام
نے یہ کیسے کہا۔ کذب کی نسبت آپ پر لازم آتی ہے۔

دوسرا فائدہ یہ بھی ہو کہ ان کو نہ سمجھا بھی دیا کہ جس کو تم بڑا معبود سمجھ رہے
ہو وہ اپنے دوسرے بتوں کو نہیں بچا سکا تو معبود بننے کے لائق کیسے ہو سکتا ہے۔
عام آدمی اس وجہ کو آسانی سے سمجھ سکتا ہے۔ اگرچہ اور بھی کئی توجیہات ہیں
لیکن یہ زیادہ معتبر اور مفید ہے۔

لَقَدْ عَلِمْتُمْ مَا هَؤُلَاءِ يَنْطِقُونَ (پ ۱۰)

- تو تو جانتا ہے جیسا یہ بولتے ہیں (مولانا محمود الحسن)، (شاہ عبدالقادر)۔
- کہ تمہیں خوب معلوم ہے یہ بولتے نہیں۔ (اعلیٰ حضرت)۔

اعلیٰ حضرت نے مانافہ کے مطابق ترجمہ کیا ہے کہ ”یہ بولتے نہیں“ اس پر تفاسیر
کی تائید موجود ہے۔ مدارک میں ہے: والمعنی لقد علمت عجزہم عن النطق
فکیف نسألہم۔ معنی یہ ہے کہ آپ تو یقیناً جانتے ہیں کہ یہ بت بولنے سے عاجز
ہیں (یہ بولتے نہیں) ان سے ہم کیسے سوال کریں۔ ابو السعود میں ہے: والله
لقد علمت ان لیس من شأنہم النطق فکیف تأمرنا بسؤالہم

بخدا آپ تو خوب جانتے ہیں یہ بولتے نہیں، آپ ہمیں ان سے سوال کرنے کا کیسے حکم دے رہے ہیں۔

اِنَّ لَكُمْ وَلِمَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِطَاعَةٌ

• بیزارہوں میں تم سے اور جن کو تم پوجتے ہو اللہ کے سوائے (محمود الحسن)۔
 • تفسیر ہے تم پر اور جن کو تم خدا کے سوا پوجتے ہو، ان پر بھی (فتح محمد)۔
 • بیزارہوں میں تم سے اور جن کو تم پوجتے ہو اللہ کے سوا (شاہ عبدالقادر)۔
 • تفسیر ہے تم پر اور ان بتوں پر جن کو تم خدا کے سوا پوجتے ہو (اشرف علی)۔
 • تفسیر ہے تم پر بھی اور ان پر بھی جنہیں تم اللہ کے سوا پوجتے ہو (عبدالماجد)۔
 • تفسیر ہے تم پر اور ان بتوں پر جن کو اللہ کے سوا پوجتے ہو۔ (اعلیٰ حضرت)۔
 یہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی کلام ہے جو انھوں نے اپنی قوم سے کی۔ اعلیٰ حضرت کے ترجمہ میں واضح ہے کہ اس سے مراد وہ قوم اور ان کے معبود بت مراد ہیں نہ کہ مطلقاً وہ جن کی وہ لوگ عبادت کرتے تھے کیونکہ آپ کی قوم کے لوگ چاند، سورج اور ستاروں کو پوجتے والے بھی تھے لیکن یہاں چاند، سورج اور ستارے مراد نہیں ہیں بلکہ بت مراد ہیں۔ اسی پر تفسیر جلالین کی عبارت دال ہے: اِیْ هٰذِهِ الْاَوْثَانُ لَا تَسْتَحِقُّ الْعِبَادَةَ وَلَا تَصْلَحُ لِمَا وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ اِنَّهَا لَا تَصْلَحُ لِمَا وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ۔ یعنی یہاں بت مراد ہیں۔ یہ مستحق عبادت نہیں اور نہ ہی ان میں صلاحیت ہے کہ ان کی عبادت کی جائے۔ صرف اللہ تعالیٰ ہی عبادت کا مستحق ہے۔

اعلیٰ حضرت کے ترجمہ میں جتنی وضاحت ہے اور مقصد کے مطابق ہے اس کی مثال نہیں ملتی۔ یہ ہی اس ترجمہ میں غلطی ہے کہ تفسیر کے مطابق ہے اور مقصد کو سمجھانے میں اس کا ایک منفرد مقام ہے۔

مولانا اشرف علی صاحب کا ترجمہ یہاں درست ہے۔

وَمَا اَرْسَلْنَاكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِیْنَ (پ ۱۱)

• اور جب تجھ کو ہم نے بھیجا سو مہربانی کر جہان کے لوگوں پر (محمود الحسن)۔
 • اور تجھ کو جو ہم نے بھیجا سو مہربانی کر جہان کے لوگوں پر (عبدالقادر)۔
 • آپ کو اور کسی کے واسطے نہیں بھیجا مگر دنیا جہان کے لوگ (یعنی مکلفین) پر مہربانی کرنے کے لیے۔ (مولانا اشرف علی)۔
 • اے محمد ایم نے جو تجھے بھیجا ہے تو یہ دراصل دنیا والوں کے حق میں ہماری رحمت ہے۔ (مودودی)۔

• اور ہم نے تمہیں نہ بھیجا مگر رحمت سارے جہان کے لیے۔ (اعلیٰ حضرت)۔
 اس مقام پر اعلیٰ حضرت کے ترجمہ میں وسعت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تمام جہان کے لیے رحمت ہیں آپ نے اپنے ترجمہ میں لوگوں کے لیے رحمت کی قید نہیں لگائی لیکن دوسرے مترجمین نے جہان کے لوگوں یا دنیا جہان کے لوگوں کی قید سے نبی کریم کی رحمت کا دائرہ تنگ کیا ہے اور مولانا مودودی نے تو نبی کریم کی رحمت کو ہی تسلیم نہیں کیا کیونکہ وہ کہتے ہیں کہ نبی کریم کو بھیجا دنیا والے لوگوں پر رب کی رحمت ہے یعنی آپ خود رحمت نہیں۔ نبی کریم کی رحمت کا دنیا والے لوگوں پر انحصار یا آپ کی رحمت ہی تسلیم نہ کرنا کسی طرح بھی درست نہیں۔ نبی کریم کا رحمت ہونا اور آپ کی رحمت کی وسعت تفسیر سے ثابت ہے جمل میں اس طرح بیان کیا گیا ہے:

الرحمة یجوز ان یکون مفعولاً لہ ای لا یحل الرحمة وان ینتصب علی الحال مبالغة فی ان جعلہ نفس الرحمة واما علی حذف مضاف ای دار رحمة او بسمہ فی الرحمہ فی الحدیث یا ایہا الناس انما انار رحمة مہداة۔ یعنی رحمت پر نصب کی وجہ یا مفعول نہ ہونے کی وجہ سے ہے۔ مطلب یہ ہو گا کہ ہم نے آپ کو بھیجا ہے کیونکہ آپ کے سارے جہان والوں کے لیے رحمت ہونا اس ارسال کی علت اور وجہ ہے۔ یا نصب کی وجہ

حالیہ کے ہے مقصد یہ ہوا کہ ہم نے آپ کو بھیجا اور اسکا ایک آپ سارے جہان کے لیے رحمت ہیں۔ رحمت مصدر ہے حال بنا بظاہر درست نظر نہیں آتا تھا۔ اس کی وجہ بیان کرتے ہوئے یہ فرمایا کہ یہاں مبالغہ ہے۔ تو معنی یہ ہوگا کہ آپ اتنا رحم فرمانے والے ہیں گویا عین رحمت ہیں اس طرح اور اس کے نصب کی وجہ یہ ہے کہ حذف مضائقہ ہے یعنی دار رحمت۔ مفہوم یہ ہوگا کہ آپ صاحب رحمت ہیں۔ یا پھر رحمت مصدر یعنی بلقاعل ہے۔ راحم کے معنی ہیں کہ آپ رحم فرمانے والے ہیں کیونکہ نبی کریم خود فرماتے ہیں کہ میں رحم کرنے والا، ہدایت دینے والا ہوں۔

اس تقریر سے اتنا واضح ہو گیا کہ رحمت سے مراد نبی کریم ہی ہیں مولانا مودودی صاحب کا ترجمہ حقیقت حال سے کوسوں دور ہے۔ اگرچہ نبی کریم کو بھیجا بلاشبہ رب تعالیٰ کی رحمت ہے لیکن اس آیت کریمہ کا معنی اس طرح کرنا جس میں آپ کو بھیجا رب کی رحمت ہے، سمجھ آئے۔ یہ ترجمہ نہ تو عربی عبارات کا گرامر کی رو سے درست ہے اور نہ ہی مقصد بیان کے مطابق ہے۔ نبی کریم کی رحمت عامہ کو علامہ آگوسی رحمۃ اللہ روح المعانی میں اس طرح بیان فرماتے ہیں: المراد بالعالمین جمیع المخلوقات العالم ما سوى الله تعالى، صفاته جل شانہ وجمع جمع الحق لا رب لغيره الا لشراف على غيره۔ وكونه صلى الله عليه وسلم رحمة للعالمين باعتبار ان الله عليه الصلاة والسلام واسطة الفيض الانبياء على المخلوقات على حسب القابل لذلك ان نزل الله عليه وسلم الى المخلوقات في المراحل لخلق الله تعالى نوره نبياً يا جاس و جاء الله المعطي وانا القاسم۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سارے جہان کے لیے رحمت ہیں کیونکہ عالمین سے مراد تمام مخلوق ہے اس لیے کہ علم اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات کے بغیر تمام کائنات پر مشتمل ہے۔ (اگرچہ عالم کا اطلاق ذوی العقول غیر ذوی العقول تمام کو شامل ہے لیکن جمع و اولون اور یار مانون سے ذوا العقول کی ہوتی ہے تو عالمین کا اطلاق تمام کائنات پر کیسے؟) تو اس کا جواب یہ دیا گیا ہے کہ ذوی العقول کو شرافت کے پیش

نظر غیر ذوی العقول پر غلبہ دیتے ہوئے اس طرح جمع بنائی گئی۔ نبی کریم تمام کائنات کے لیے رحمت ہیں اس لیے آپ اللہ تعالیٰ کے فیضانِ کرم اور کائنات کے درمیان واسطہ ہیں۔ اسی وجہ سے آپ کا نور اول المخلوقات سے ہے۔ اور حدیث پاک میں یہ بھی آتا ہے کہ نبی کریم نے فرمایا :-

”اے جابر! اللہ تعالیٰ نے تمھارے نبی کے نور کو سب سے پہلے پیدا کیا۔“

اور حدیث پاک میں یہ بھی آتا ہے کہ :-

”اللہ تعالیٰ نعمتیں عطا فرماتا ہے اور میں تقسیم کرتا ہوں۔“

اسی طرح اور یہ فرمایا: العالم جسد واحد النبوة ولا قيام للجسد بدون روح۔ ”تمام جہان ایک جسم ہے اور نبوت اس کی روح ہے بغیر روح کے جسم کا قیام ممکن نہیں۔“

اس کے بعد اور فرمایا: والذي اختار الله صلى الله عليه وسلم انما بعث رحمة لكل فرد فرد من العالمين ملائكتهم وانسهم و جنهم ولا فرق بين المؤمن والكافر من الانس والجن في ذلك مختار مسلک یہ ہے کہ نبی کریم کو تمام کائنات کے ہر فرد کے لیے رحمت بنا کر مبعوث فرمایا گیا۔ ملائکہ، انسانوں اور جنوں تمام کے لیے رحمت ہیں مومنوں اور کافروں کا کوئی امتیاز نہیں تمام مومنوں اور کافروں کے لیے رحمت ہیں خواہ وہ انسان ہوں یا جن۔

اب آپ خود توجہ فرمائیں کہ اہل حضرت کا ترجمہ کتنا حسین اور خوب تر کامل ہے جس میں نبی محترم کی رحمت عامہ کا ذکر واضح طور پر تفاسیر کے مطابق موجود ہے۔ جب کہ دیگر مترجمین نے رحمت کا دائرہ تنگ کر کے یا اشارتاً انکا کر کے شان مصطفیٰ علیہ التمجید والثناء کو چھپانے کی کوشش کی ہے لیکن جس شان رحیم کو مالک کائنات ظاہر فرمائے وہ کیسے چھپ سکتی ہے!

وَذَا النُّونِ إِذْ ذُهِبَ مُغَاضِبًا فَظَنَّ أَنْ لَنْ نَقْدِرَ عَلَيْهِ
فَنَادَى فِي الظُّلُمَاتِ أَنْ لَا إِلَهَ إِلَّا أَنْتَ سُبْحَانَكَ إِنِّي
كُنْتُ مِنَ الظَّالِمِينَ (پانچ)

• اور مچھلی والے (پیغمبر کا بھی ذکر کیجیے) جبکہ وہ خفا ہو کر چلے گئے اور یہ سمجھے کہ ہم ان پر تنگی نہ کریں گے۔ پھر انھوں نے اندھیروں میں سے پکارا کہ تیرے سوا کوئی معبود نہیں۔ تو ہی سب نقائص سے پاک ہے۔ بیشک میں ہی قصود وار ہوں۔ (عبدالماجد دریا آبادی)

• اور ذوالنون کو یاد کرو جب وہ اپنی قوم سے ناراض ہو کر غصے کی حالت میں چل دیے اور خیال کیا کہ ہم ان پر قابو نہ پاسکیں گے۔ آخر اندھیرے میں خدا کو پکارنے لگے کہ تیرے سوا کوئی معبود نہیں اور بیشک میں قصود وار ہوں (فتح محمد)

• اور مچھلی والے کو بھی ہم نے نوازا یاد کرو جب وہ بگڑ کر چلا گیا تھا اور سمجھا تھا کہ ہم اس پر گرفت نہ کریں گے۔ آخر کو اس نے تاریکیوں میں پکارا، نہیں ہے کوئی خدا مگر تو پاک ہے تیری ذات۔ بیشک میں نے قصور کیا (مودودی)

• پھر سمجھا کہ ہم نہ پکڑ سکیں گے اس کو، پھر پکارا ان اندھیروں میں کہ کوئی حاکم نہیں سوائے تیرے تو بے عیب ہے میں تھا گنہگاروں سے (محمود الحسن)۔

• اور مچھلی والے کو جب چلا گیا غصہ سے تو نہ کر پھر سمجھا کہ ہم نہ پکڑ سکیں گے پھر پکارا ان اندھیروں میں کہ کوئی حاکم نہیں سوائے تیرے تو بے عیب ہے میں تھا گنہگاروں سے۔ (شاہ عبدالقادر)۔

• اور ذوالنون کو یاد کرو جب چلا غصہ میں بھرا تو گمان کیا کہ ہم اس پر تنگی نہ کریں گے تو اندھیروں میں پکارا کوئی معبود نہیں سوا تیرے پاکی ہے تجھ کو بے شک مجھ سے بے جا ہوا (اعلیٰ حضرت)

اس مقام پر اعلیٰ حضرت نے فظن ان لن نقدر علیہ کا ترجمہ کیا ہے تو گمان کیا ہم اس پر تنگی نہ کریں گے۔ دوسرے مذکورہ تراجم میں ہے سوائے عبدالماجد کے سمجھا کہ ہم نہ پکڑ سکیں گے گرفت نہ کریں گے۔ اسی طرح اعلیٰ حضرت کے ترجمہ اس طرح آیا ہے اخی کنت من الظالمین بے شک مجھ سے بے جا ہوا اور باقی مذکورہ تراجم میں اس طرح ذکر کیا گیا ہے میں گنہگاروں سے تھا میں نے قصور کیا۔ تراجم میں پہلا فرق جو بیان کیا ہے اس پر توجہ فرمائیں کہ یہ کہنا سمجھا کہ ہم نہ پکڑ سکیں گے یا یہ کہنا سمجھا ہم پکڑنے کی قدرت نہیں رکھتے یا یہ کہنا ہے کہ سمجھا ہم پکڑنے کی طاقت نہیں رکھتے۔ اردو محاورہ میں تمام الفاظ کا ایک ہی مطلب لیا جاتا ہے۔ حالانکہ اسی مطلب کو علامہ رازی نے تفسیر کبیر میں رد کیا ہے۔ وہ بیان کرتے ہیں:

و ثانیہ اقولہ تعالیٰ فظن ان لن نقدر علیہ و ذلک یقتضی کونہ شکا فی قدسہ اللہ تعالیٰ۔ جن حضرات نے انبیائے کرام سے گناہ سمرزد ہوتا جائز قرار دیا ہے ان کی یہ دوسری دلیل ہے کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد و کرامی فظن ان لن نقدر علیہ۔ تقاضا کرتا ہے کہ یونس علیہ السلام اللہ تعالیٰ کی قدرت میں شک کر نیوالے ہوں (جو شک کر نیوالا ہوتا ہے وہ گنہگار ہوتا ہے) اس دلیل کو آپ نے اس طرح رد فرمایا: والجواب عن التشبہ بالثانیہ وهو التمسک

بقولہ تعالیٰ فظن ان لن نقدر علیہ ان نقول من فظن عجز اللہ تعالیٰ فهو کافر ولا خلاف انہ لا یجوز فی نسبتہ ذلک الی احاد المؤمنین فکیف الی الانبیاء علیہم السلام فاذا لا بد فیہ من التاویل وفی وجہ احدہا فظن ان لن نقدر علیہ لن تضیق علیہ وهو کقولہ تعالیٰ اللہ یبسط الرزق لمن یشاء من عباده ویضیق

ومن قدس علیہ رزقہ ای ضیق و اما اذا ما بتلاہ فقد ر علیہ ہذا قہ ای ضیق و معذاتہ ان لن تضیق علیہ و علیران ہذا التاویل تفسیر الایستحجۃ لتاویذ لک لان یونس علیہ السلام ظن انہ مغیر

ان شاء اقام وان شاء رجع وان شاء تعالیٰ لا یضیق علیہ فی اختیارہ -

مختصر خدین کی دلیل کو رد کرتے ہوئے فرمایا کہ یہاں لن تقدس علیہ کا معنی لن تضیق علیہ ہے تو اب یہ معنی ہوا کہ انھوں نے گمان کیا کہ ہم ان پر تنگی نہ کریں گے۔ آپ نے اس معنی پر قرآن پاک کی تین آیات سے استدلال پکڑا ہے کہ قدر کا معنی تنگی قرآن پاک میں استعمال ہوا ہے۔ املہ یبسط الرزق لمن یشاء ویقدر

ومن قدس علیہ رزقہ - اور واما اذا ما بتلاد فقدس علیہ رزقہ

ان تمام آیات میں قدر کا معنی تنگی کرتا ہے لہذا یہاں بھی اس کا معنی تنگی کرتا ہی ہے۔ پھر آپ نے یہ فرمایا کہ یہ تاویل ہمارے لیے دلیل ہے کہ حضرت یونس علیہ السلام نے یہ خیال کیا کہ آپ کو اختیار ہے اگر چاہیں مقیم رہیں اور چاہیں تو اس قوم کو چھو کر چلے جائیں اور اللہ تعالیٰ آپ کے اس اختیار میں تنگی نہیں فرمائے گا۔ اسی طرح

مدارک میں بھی آتا ہے: فظن ان لن نقدر تضیق علیہ وعن ابن عباس انه داخل علی معاویہ فقال لقد ضربتني امواج الفزان البارحة فغضبت فيهما فلم اجد لنفسی خلاصا الا بك قال وما هی يا معاویہ ففقا اءالایت وقال او یظن نبی امثله ان لا یقدس علیہ قال هذا من القدس لا من القدسرة - یعنی اس کا معنی یہ ہے کہ اس نے گمان کیا کہ ہم اس پر تنگی نہیں کریں گے۔

حضرت ابن عباس سے مڑی ہے کہ وہ ایک مرتبہ حضرت امیر معاویہ کے پاس گئے۔ انھوں نے کہا کہ میں گذشتہ رات سے قرآن پاک کی موجوں میں غرق ہوں آپ کے بغیر ان سے نجات ممکن نہیں۔ آپ نے کہا کہ اے معاویہ اوہ کیا ہے؟ انھوں نے یہی آیت مبارکہ پڑھی اور کہا کہ کیا اللہ کا نبی بھی گمان کر سکتا ہے کہ اللہ قدرت نہیں رکھتا تو آپ نے کہا ان لن نقدر قدر سے مشتق ہے نہ کہ قدرت سے۔ مطلب یہ ہے کہ اس کا معنی تنگی ہے نہ کہ طاقت۔ لہذا معنی یہ نہیں کہ ہم پکڑ نہیں سکیں گے بلکہ معنی یہ ہے کہ ہم تنگی نہیں کریں گے۔

آب دوسرا فرق دیکھیں: انی کنت من الظالمین کا ترجمہ بیشک مجھ سے بے جا ہوا۔ دوسرے تراجم میں میں تھا گنہگاروں سے، میں نے قصور کیا، میں قصور وار ہوں۔ اعلیٰ حضرت کے ترجمہ پر تاہم تفسیر کبیر سے ملتی ہے۔ آپ بیان کرتے ہیں: انی کنت من الظالمین فهو واجب التاویل لانا الواجبنا اعلیٰ ظاہرنا لوجب القول بكون النبی مستقلا للطعن وهذا لا یقول مسلم واذا وجب التاویل فنقول لا شک انه كان نارا کامله فضل مع الظلمة علی تحصیل الا فضل فكان ذلك ظلما - یعنی اس آیت میں تاویل ضروری ہے کیونکہ اگر ظالم ہر پر رکھا جائے البتہ نبی کا مستحق لعنت ہونا (الحیاذ باللہ) لازم آئے گا کیونکہ حضرت یونس علیہ السلام کا اگر قول یہ ہو کہ میں ظالم (گنہگار) تھا تو ظالم لعنت کا مستحق ہے اس لیے کہ قرآن پاک میں ہے فلعنت امثله علی الظالمین - ظالموں پر اللہ تعالیٰ کی لعنت ہو: حالانکہ کوئی مسلمان یہ نہیں کہہ سکتا کہ اللہ کا نبی ظالم (گنہگار) اور لعنت کا مستحق ہے۔ اس لیے تاویل ضروری ہے۔ لہذا ہم بلا شک یہ کہتے ہیں کہ آپ نے افضل کو چھوڑا یعنی وہاں رہنے کو باوجود اس کے کہ آپ افضل کے حامل کرنے کی قدرت رکھتے تھے یعنی آپ وہاں سے چلے گئے۔ یہ جانا ترک افضل تھا اسی کو ظلم سے تعبیر کیا ہے۔ معنی یہ ہوا کہ میں نے افضل کو چھوڑا اس لیے مجھ سے بے جا ہوا۔ یہ مراد نہیں کہ مجھ سے گنہ ہوا، ظلم ہوا، میں تھا گنہگاروں سے۔ یہ معنی نبی کی شان کے لائق نہیں۔ اسی لیے علامہ رازی رحمۃ اللہ علیہ نے اسے رد کیا اور تاویل کر کے اس کا صحیح استعمال بنایا اور اعلیٰ حضرت نے بھی اسی حقیقت کو سمجھتے ہوئے ایسا ترجمہ فرمایا جو بلا غبار ہے جس پر اعتراض کی گردش ممکن نہیں۔

فَاذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ عَلَيْهِمْ صَوَافَّ (پ ۱۴)

• پس انھیں کھڑا کر کے ان پر اللہ کا نام لو۔ (مودودی)۔
• پس یاد کرو نام اللہ کا اوپر اس کے پاؤں باندھے ہوئے۔ (شاہ رفیع الدین)

• سو پڑھوان پر نام اللہ کا قطار باندھ کر (شاہ عبدالقادر)۔
 • سو تم ان پر کھڑے کر کے اللہ کا نام لیا کرو (مولانا شرف علی)۔
 • سو تم انھیں کھڑا کر کے اللہ کا نام لیا کرو (عبدالماجد دریا آبادی)۔
 • تو اقر بانی کرتے وقت قطار باندھ کر ان پر خدا کا نام لو (فتح محمد)۔
 • تو ان پر اللہ کا نام لو ایک پاؤں بندھے تین پاؤں کھڑے۔ (اعلیٰ حضرت)۔
 قربانی کے جانوروں کا ذکر ہو رہا ہے کہ وہ قربانی کے جانور یعنی اونٹ اور گائے
 اللہ کی تثنیوں سے ہیں۔ اس کے بعد اونٹوں کے ذبح کرنے کا طریقہ بیان فرمایا کہ
 ان کو مسنون طریقہ سے ذبح کیا جائے اور وہ طریقہ یہ ہے کہ وہ اونٹ ایک پاؤں سے
 بندھے ہوں اور تین پاؤں سے کھڑے۔

اعلیٰ حضرت کے ترجمہ سے مطلب بہت واضح ہے جبکہ دیگر تراجم میں یہ مقصد
 ظاہر نہیں۔ تفاسیر علی حضرت کے ترجمہ پر تا یہ نہ کر رہی ہیں۔ جلالین میں ہے:
 فاذا ذكروا اسم الله عليها عند نحرها صواها قائمت على ثلاث معقولة
 اليد اليسرى یعنی ذبح کے وقت ان پر اللہ کا نام ایسے حال میں لیا جائے جب
 وہ تین پاؤں پر کھڑے ہوں اور ان کا اگلا پایا پاؤں بندھا ہوا ہو۔ فاذا كسر
 اسم الله عليها بان تقولوا عند ذبحها بسم الله والله أكبر اللهم منك
 ولك۔ صواها ای قائمات قد ضعفن ايديهن وارجلهن لان البدنة
 عند الذبح تعقل إحدى يديها فتقوم على ثلاث وعقلها عند الفرسنة
 عن ابن سابط رضي الله عنه۔ ان النبي صلى الله عليه وسلم واجهه به كانوا
 يعقلون بيد البدنة اليسرى ويخرونها قائمتة على
 بقية من قوائمها۔ (المختصر من روح المعاني) یعنی ان کو ذبح کے وقت
 کہے: بسم الله والله أكبر اللهم منك ولك اس طرح کہ تین پاؤں کھڑے
 ہوں کیونکہ اونٹ کے ذبح میں مسنون یہی ہے کہ اس کا اگلا پایا پاؤں باندھا جائے
 اور تین پاؤں پر وہ کھڑا ہو۔ کیونکہ حضرت ابن سابط رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ

نبی کریم اور آپ کے صحابہ کرام اونٹ کو ذبح کے وقت اس کا اگلا پایا پاؤں باندھ
 دیتے تھے اور ذبح کرتے جبکہ وہ تین پاؤں پر کھڑا رہتا۔

وَلَوْلَا دَفْعُ اللَّهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَهْدِمَتْ صَوَامِعُ
 وَيَعْبُورُ صَلَوَاتُ وَمَسَاجِدُ يُذَكِّرُ فِيهَا اسْمُ اللَّهِ كَثِيرًا (پس)

• اگر نہ ہٹایا کرتا اللہ لوگوں کو ایک کو ایک سے تو ڈھلے جاتے بکلیے اور مدرسے
 اور عبادت خانے اور مسجدیں جن میں نام پڑھا جاتا ہے اللہ کا بہت (شاہ عبدالقادر)۔
 • اور اگر نہ ہٹایا کرتا اللہ لوگوں کو ایک کو دوسرے سے تو ڈھلے جاتے بکلیے اور مدرسے
 اور عبادت خانے اور مسجدیں جن میں نام پڑھا جاتا ہے اللہ کا بہت (محمود الحسن)۔
 • اور اگر اللہ آدمیوں میں ایک دوسرے سے دفع نہ فرماتا تو ضرور ڈھادی جاتیں
 خانقاہیں اور گرجا اور کلیسے اور مسجدیں جن میں اللہ کا بکثرت نام لیا جاتا ہے۔
 (اعلیٰ حضرت)

اعلیٰ حضرت کے ترجمہ کو تفاسیر کے مطابق دیکھیں کیسے مقصد کو واضح کر رہا ہے
 جب کہ دیگر مذکورہ تراجم اس سے خالی ہیں اور وہ کہاں تک درست ہیں؟ تفاسیر کی
 عبارات کو دیکھنے سے واضح ہو جائے گا۔ ہذا رک میں اس طرح ذکر کیا گیا ہے: ولما
 دبت كوا اليه صوايح بيحوا ولا سرب انهم صوامع ولا لله يهود صلوات
 اي كنائس سميت الكنيسة لانه يصلي فيه ولا للمسلمين
 مساجد يعني اگر اللہ تعالیٰ لوگوں کو ایک دوسرے سے مندرفع نہ فرمایا تو نصاریٰ کے
 گرجے نہ رہتے اور ان کے پادریوں کی خانقاہیں نہ رہتیں اور یہود کے کلیسے نہ رہتے۔
 کلیسا کو مجازاً صلوة سے تعبیر کیا گیا ہے کیونکہ وہ محل صلوة ہے۔ اور نہ مسلمانوں
 کی مسجدیں رہتیں۔ جلالین میں ہے: صوامع للمسيحيين وبيح كنائس
 للمسلمين و صلوات كنائس لليهود بالحبرانية و مسجد المسلمين۔

یعنی صوامع سے مراد نصاریٰ کے پادریوں کی خانقاہیں ہیں اور بیچ سے مراد نصاریٰ کے گرجے اور صلوٰت سے مراد یہود کے کلیسے اور مساجد سے مراد مسلمانوں کی مسجدیں۔
روح المعانی میں جو ذکر کیا گیا ہے وہ مختصر یہ ہے: وَالسَّبِيحُ وَاحِدٌ
بِسَبْعَةِ بَيِّنَاتٍ فَعَلَتْهُ وَهِيَ مَصْدَرُ النَّصَارَى وَلَا تَخْتَصُصُ
بِوَحْدَانِهِمْ كَالصَّلَاةِ وَصَلَوَاتِ جَمْعِ صَلَاةٍ وَهِيَ كَنِيْسَةُ الْيَهُودِ -
یعنی بیچ کا واحد سبیحہ بوزن فعلتہ یہ عیسائیوں کا گرجا ہے۔ یہ عبادت
خانہ ان کے پادریوں سے خاص نہیں جس طرح صومعنہ (صوامع کا واحد)۔ ان
کی پادریوں کی عبادت گاہ سے خاص ہے۔ اور صلوٰت، صلوٰۃ کی جمع ہے اور یہ
یہودیوں کا کلیسا ہے۔ اسی طرح کی عبارات کبیر، ابوالسعود، الخطیب میں بھی ہیں۔
اعلیٰ حضرت کا ترجمہ تفاسیر کے مطابق ہے اور آیت کریمہ میں جو مقصد معتبر ہے
اس کا صحیح ترجمان ہے۔

لَتَجْزُوا الْيَوْمَ اِنَّكُمْ مِّنَ الْاَشْرَارِ (پہلے)

• مت چلاؤ آج کے دن تم ہم سے چھڑائے نہ جاؤ گے (شاہ عبدالقادر)۔
• مت چلاؤ، آج کے دن تم ہم سے چھوٹ نہ کر سکو گے (محمود الحسن)۔
• آج فریاد نہ کرو۔ ہماری طرف سے تمہاری مدد نہ ہوگی (علیٰ حضرت)۔
اس مقام پر لا تنصرون کا ترجمہ کیا گیا ہے "تم چھڑائے نہ جاؤ گے"۔
اعلیٰ حضرت کے ترجمہ میں آیا ہے تمہاری مدد نہ ہوگی۔ لغوی معنی یہ بھی ہے مولانا
اشرف علی صاحب نے بھی یہی ترجمہ کیا ہے۔ اگرچہ امداد کے نہ ہونے سے عذاب
سے نہ چھڑایا جاتا ہے۔ یا من کو لا تنصرون کا صلہ مانا جائے تو معنی ہوگا:
تمہیں عذاب سے روکا نہیں جائے گا۔ لیکن مختصرین تو بامحاورہ ترجمہ
کے قائل ہی نہیں تو یہاں بامحاورہ ترجمہ یا مجازی طور پر ترجمہ کیوں کیا گیا ہے؟ کیونکہ
اعلیٰ حضرت نے ظلم کا معنی بے جا کیا تو اعتراض یہ کیا گیا کہ لفظ کی لغوی اور اصطلاحی

حقیقت کا علم یہاں کون سا لغوی معنی یا اصطلاحی معنی کیا گیا ہے۔
تفسیر مدارک میں علیٰ حضرت کے ترجمہ پر تائید موجود ہے۔ ذکر ہے: انکم منا
لا تنصرون ای من جہنم لا یلحقکم نفسہ و معونۃ یعنی ہماری طرف سے
تمہاری مدد نہ ہوگی۔ روح المعانی میں ہے: لا یلحقکم منہ نصرة تغیثکم
مما انتم فیہ۔ یعنی جس عذاب میں تم ہو اس سے نجات حاصل کرنے کے
لیے ہماری طرف سے تمہاری مدد نہیں ہوگی۔

مُسْتَكْبِرِينَ بِسَمِرَاتِهِمْ جُرُونِ (پہلے)

• تکبر کرتے ہوئے ساتھ اس کے افسانہ گوئی کرتے ہوئے بے ہودہ بکتے
تھے۔ (شاہ رفیع الدین)۔
• اپنے گھمنڈ میں اس کو خاطر ہی میں نہ لاتے اپنی پوپالیوں میں اس پر باتیں چھانٹتے
اور بکواس کیا کرتے تھے۔ (مودودی)
• اس سے بڑائی کر کر ایک کہانی والے کو چھوڑ کر چلے گئے (شاہ عبدالقادر)
• اس سے تکبر کر کے ایک قصہ گو کو چھوڑ کر چلے گئے (محمود الحسن)۔
• تکبر کرتے ہوئے قرآن کا مشغلہ بناتے ہوئے یہودہ بکتے ہوئے (عبداللہ)
• ان سے سرکشی کرتے کہانیوں میں مشغول ہوتے اور یہودہ بکواس کرتے
تھے (فتح محمد)۔

• خدمتِ حرم پر بڑائی مارتے ہوئے رات کو وہاں بے ہودہ کہانیاں بکتے تھے
کو چھوڑے ہوئے۔ (اعلیٰ حضرت)۔
مضمون یہ بیان کیا جا رہا ہے، اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ جب ہم نے کفار کے
امیروں کو عذاب میں پکڑا یعنی وہ مسلمانوں سے شکست کھانے لگے، ان کی تلواروں کے
عذاب میں آئے یا قحط سالی میں مبتلا ہوئے تو وہ فریاد کرنے لگے۔ اللہ تعالیٰ نے
ان کی فریاد پر فرمایا، آج تم فریاد نہ کرو۔ ہماری طرف سے تمہاری کوئی امداد نہ ہوگی

کیونکہ جب میری آیات تم پر تلاوت کی جائیں تم ان سے روگردانی کر جاتے تھے اور خدمتِ حرم کی وجہ سے تم اپنی ٹرائی مارتے اور تکبر کرتے تھے اور رات کو یہودہ باتیں کرتے کبھی قرآن کو جادو کہتے، کبھی شعر کہتے اور نبی کریم کی شان میں گستاخانہ کلام کرتے اور اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول اور قرآن پاک کو چھوڑتے تفاسیر میں اسی طرح بیان کیا گیا ہے اور علحضرت کے ترجمے سے بھی یہ واضح ہے :-

متكبرين به اى بالبيت الحرام لانهم يستكبرون ويفخرون بانهم خدام البيت وقوام هذا ما عليه جمهور المفسرين سيما اى قسرون بذكر القرآن والطعن فيه وذالك انهم كانوا يجتمعون حول البيت بالليل قسرون وكانت عامة قسورهم ذكور القرآن وقسمية سحر وشعوذة (هذا ما حصل من روح المعاني)

یعنی متکبرین یہ ہے مراد یہ ہے کہ وہ خدمتِ حرم کی وجہ سے تکبر کرتے تھے، اپنی ٹرائی بیان کرتے اور فخر کرتے تھے کہ ہم بیت اللہ شریف کے خادم اور اس کی تعمیر کرنے والے ہیں۔ جمہور مفسرین کرام کے نزدیک یہی معنی ہے۔ سمرآ کا معنی یہ ہے کہ وہ رات کو بے ہودہ کہانیاں کہتے، قرآن پاک کا تذکرہ کرتے اور اس میں طعن کرتے۔ بیت اللہ شریف کے ارد گرد رات کو جمع ہوتے اور یہودہ باتوں اور کہانیوں میں قرآن پاک کو جادو اور شعر کہتے۔ تہجرون ہجر سے لیا ہوا ہے جس کا معنی قطع کرنا اور ترک کرنا ہے یعنی وہ اللہ تعالیٰ یا نبی کریم یا قرآن پاک کو چھوڑنے والے ہوئے جلالین میں ہے :

متكبرين عن الايمان به اى بالبيت او الحرام بانهم اهل في امن بخلاف سائر الناس في مواطنهم سائر حال اى جماعة يتحدون بالليل حول البيت (يتحدون حول البيت بالطعن في القرآن) (حاشیہ) تہجرون من المثلثي تتكون القرآن من الوباى اى تقولون غير الحق في البنى والقسر ان - یعنی وہ ایمان لانے سے تکبر کرتے تھے بیت اللہ شریف یا

حرم کی وجہ سے کیونکہ حرم والے بنسبت دوسرے لوگوں کے امن میں رہتے۔ رات کو بیت اللہ شریف کے گرد یہودہ کہانیاں کہتے۔ قرآن پاک میں عیب نکالتے۔ تہجرون اگر ثنائی سے ہو یعنی ہجر سے مشتق ہے تو معنی یہ ہے کہ قرآن پاک کو چھوڑتے اور اگر رباعی سے ہو یعنی بابِ فعال سے (رباعی کا مصطلح معنی نہیں) ہو تو معنی یہ ہوگا کہ نبی کریم اور قرآن پاک کی شان میں ناحق کہتے۔

تفاسیر کے بیان کے بعد علحضرت کے ترجمہ کی فوقیت و زور و روشن کی طرح ہو گی۔ زیادہ تبصرہ کی محتاج نہیں۔ نیز مولانا مودودی صاحب کا ترجمہ حقیقت سے دور، تہجرون کا ترجمہ کیا ہی نہیں۔ باقی ترجمہ بھی ذہنی اختراعات پر مبنی ہے۔

بَلْ آتَيْنَاهُمْ بَذِكْرِهِمْ فَهُمْ عَنْ ذِكْرِهُ مُعْرِضُونَ (پ ۱۶)

• نہیں بلکہ ہم نے ان کا اپنا ہی ذکر ان کے پاس لائے ہیں اور وہ اپنے ذکر سے مٹھ مٹھ رہے ہیں۔ (مودودی)

• کوئی نہیں پہنچائی ہم نے انکو ان کی نصیحت۔ سو وہ اپنی نصیحت کو دھیا نہیں کرتے۔ (محمود الحسن)

• بلکہ ہم نے ان کے پاس ان کی نصیحت کی بات بھیجی۔ سو یہ لوگ اپنی نصیحت سے بھی روگردانی کرتے ہیں۔ (مولانا اشرف علی)

• کوئی نہیں ہم نے پہنچائی ہے انکو ان کی نصیحت۔ سو وہ اپنی نصیحت کو دھیا نہیں کرتے۔ (شاہ عبدالقادر)

• بلکہ ہم نے تو ان کے پاس ان کی نصیحت (ہی کی بات) بھیجی سو یہ لوگ اپنی نصیحت سے بھی روگردانی کرتے ہیں (عبدالماجد)

• بلکہ ہم تو ان کے پاس وہ چیز لائے جس میں ان کی ناموری تھی تو وہ اپنی عزت سے ہی منہ پھیرے ہوئے ہیں (علحضرت)

• علحضرت کے ترجمہ کی تائید تفسیر روح المعانی سے ملتی ہے مقصد بیان یہ ہے

کہ ان کو قرآن پاک عطا فرمایا جس میں ان کی ناموری تھی۔ انھوں نے قرآن پاک سے منہ پھیرا جس پر ایمان لانے میں ان کی عزت تھی۔ تو قرآن پاک سے اعراض عزت سے اعراض ہوا۔ روح المعانی میں اس طرح ذکر کیا گیا ہے: ای بل اتینا ہم بفخرهم و شرفهم الذی کان یحب علیہم ان یقبلوا علیہ کم من اقبال و یقبلوا ما فیہ کم من قبول فہم بما فعلوا من المنکوح عن ذکرہم ای فخرہم و شرفہم خاصۃ مع رضوان لا عن غیر ذلک مما لا یوجب الاقبال علیہ ولا اعتناء بہ والمراد بالذکر القرآن الذی ہو فخرہم و شرفہم ینطق بقولہ تعالیٰ و انہ لذلک و لقولک یعنی قرآن پاک میں تو ان کو ذکر کیا گیا ہے۔ معنی یہ ہوا کہ بلکہ ہم نے ان کو عطا کیا وہ جس میں ان کے لئے شرافت و فخر تھا یعنی ان کی ناموری تھی۔ ان پر واجب تھا کہ وہ اس کی طرف کامل توجہ کرتے اور اس کے جمیع احکام و اخبار کو تسلیم کرتے لیکن انھوں نے الٹ کیا اور انھوں نے ذکر سے یعنی اپنے فخر و شرافت (عزت) سے اعراض کیا، منہ پھیرا۔ ان کا منہ پھیرنا اسی چیز سے تھا جس کی طرف ان کو توجہ کرنی ضروری تھی اور اہتمام شان ضروری تھا۔ یعنی ذکر سے مراد قرآن پاک ہے جو ان کے لیے باعث شرافت و فخر تھا ان کے پاس وہ چیز لائے جس میں ان کی ناموری تھی اس پر خود قرآن پاک شاہد ہے کہ بیشک یہ قرآن پاک آپ کے لیے اور آپ کی قوم کے لیے ذکر ہے۔

اعلیٰ حضرت کا ترجمہ اسی مقصد کو واضح کر رہا ہے اور آپ کی دقت نظر کی نشاندہی کر رہا ہے۔

وَلَا تُكْرِهُوا فَتَيَاتِكُمْ عَلَى الْبِغَاءِ إِنْ أَرَدْنَ تَحَصُّنًا (۱۰۱)

- اور نہ زور کرو اپنی چھو کر یوں پر بدکاری کے واسطے اگر وہ چاہیں قید سے رہنا۔ (شاہ عبدالقادر)
- اور نہ زبردستی کرو اپنی چھو کر یوں پر بدکاری کے واسطے اگر وہ چاہیں قید

سے رہنا (محمود الحسن)۔

• اور مجبور نہ کرو اپنی کنیزوں کو بدکاری پر جب کہ وہ بچنا چاہیں (اعلیٰ حضرت) اعلیٰ حضرت نے فتیات کا ترجمہ کیا ہے "کنیزوں" اور دوسرے مترجمین نے ترجمہ کیا ہے "چھو کر یوں"۔ اسی طرح محضاً کا ترجمہ اعلیٰ حضرت نے کیا ہے "بچنا" اور دوسرے حضرات نے ترجمہ کیا "قید سے رہنا"۔

اس آیت کریمہ کے شان نزول سے فرق سمجھ آ جائیگا۔ شان نزول روح المعانی میں اس طرح بیان کیا گیا ہے: آخر مسلم و ابو داؤد عن جابر رضی اللہ عنہ ان جابر بن عبد اللہ بن سہل یقال لہا مسکتہ و اخری یقال لہا امیمہ کان یملکہما علی الزنا فشکنا ذلک الی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فمزلت۔ مسلم ثم یف اور ابو داؤد میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ عبد اللہ بن سہل اپنی کنیز مسکتہ اور دوسری کنیز امیمہ کو زنا پر مجبور کرتا تو انھوں نے نبی کریم کی خدمت میں آکر شکایت کی تو یہ آیت کریمہ نازل ہوئی۔

و الفتیات جمع فتاة و کل من الفتی و الفتاة کتاب مشہورہ عن العبد والامۃ مطلقاً ان اردن تحصن الیس لتخصیص السنۃ بصبر و اسرار تمین التعفف عن الزنا۔ (روح المعانی) فتیات جمع فتاة کی ہے۔ فتی یافتاة سے مراد کنایہ غلام اور کنیز ہیں۔ ان اردنا تحصن سے یہ وہم نہ پڑے کہ شاید ان عورتوں کو مجبور نہ کیا جائے جو بچنا چاہیں بلکہ کسی کو بھی مجبور نہ کیا جائے۔

مقصد بیان یہی ہے کہ کنیزوں پر جبر نہ کرو جب وہ بچنا چاہیں۔ چھو کر یا قید سے رہنا یہ مقصد کو واضح نہیں کرتے جس طرح اعلیٰ حضرت کا ترجمہ مقصد کو واضح کر رہا ہے۔

وَقَدْ مَنَّا عَلَى الْمُؤْمِنِينَ إِذْ بَعَثْنَا فِيهِمْ رَسُولًا مِنْ أَنْفُسِهِمْ فَمَنْ هُوَ الْمُتَكَبِّرُ (۱۰۲)

- اور آئے ہم طرف اوس چیز کے کہ کیا تھا انھوں نے سب کاموں سے پس

کیا ہم نے اس کو جیسے ذرے پر آگندہ - (شاہ رفیع الدین)۔
 • اور جو انھوں نے عمل کیے ہوں گے ان کی طرف متوجہ ہونگے تو ان کو اُڑتی خاک
 کر دیں گے - (فتح محمد)۔

• اور ہم ان کے کاموں کی طرف متوجہ ہونگے جو یہ کر چکے ہیں سو ان کو ایسا ہی کر دیا
 گے جیسے پریشان غبار (عبدالماجد دریا آبادی)۔

• اور ہم پہنچے ان کے کاموں پر جو کئے تھے انھوں نے پھر ہم نے کر ڈالا اس
 کو خاک اُڑتی ہوئی (محمود الحسن)۔

• اور ہم اُن کے کاموں کی طرف جو وہ کر چکے تھے متوجہ ہوں گے سو اُن کو ایسا
 ہی کر دیں گے جیسے پریشان غبار - (مولانا اشرف علی)۔

• اور جو کچھ بھی اُن کا کیا دھرا ہے اسے لے کر ہم غبار کی طرح اُڑا دیں گے -
 (مورود علی)۔

• اور جو کچھ انھوں نے کام کئے تھے ہم نے قصد فرما کر انہیں باریک باریک
 غبار کے بکھرے ہوئے ذرے کر دیا کہ روزن کی دھوپ میں نظر آتے ہیں (علی حضرت)
 اس مقام پر علی حضرت نے قدیمنا کا ترجمہ فرمایا ہے "ہم نے قصد فرمایا" یہ

تفسیر کے مطابق ہے وقد منا ای عمدنا قصدنا لعمای عن ابن عباس
 (روح المعانی) قدیمنا کا معنی ہم نے ارادہ کیا حضرت ابن عباس نے ایسا ہی فرمایا

ہے وقد منا ان القدوم لا یصح الا علی الاجسام لان القدوم حركه والموقوف
 بالحركة یثبت و ثبت ان امثله عز وجل لا یخوضات لیکون محدثا

فوجدنا تاویل لفظ القدوم وهو من وجوه احدها وقد منا الی ما عملوا من
 عمل ای وقصدنا الی اعمالهم و اطلق المسبب علی السبب مجازا

(المختصر من الکسب) یعنی قدوم (آنا، پہنچنا، متوجہ ہونا) یہ
 صرف اجسام پر پولا جاتا ہے کیونکہ قدوم حرکت ہے اور حرکت حادث میں پائی جاتی
 ہے۔ اللہ تعالیٰ حادث ہو ہی نہیں سکتا۔ اس لیے لفظ قدوم میں تاویل ضروری ہے۔

اور وہ تاویل کئی وجہ سے ہے۔ ایک یہ ہے کہ ہم نے قصد فرمایا یعنی قدیمنا بعضی قصد
 ہے۔ یہاں مسبب کا اطلاق مجازاً سبب پر ہے۔ اسی طرح علی حضرت کا ترجمہ غبار
 منتشر کا واضح ہے۔ کیونکہ صرف خاک اُڑانا، غبار کا پریشان ہونا صحیح ترجمانی
 نہیں و اخراج جماعة عن مجاهد والحسن وعكرمة وابن مالك
 وعامر ان شعاع الشمس في اللوة وكانهم اساد وامايرو في من
 الغبار كما هو المشهور عند اللغويين قال الراغب الغبار قاق
 السراب وما انبث في الهواء فلا یبدو الا في اثناء خروجه الشمس
 في الكوة منتشرا مما لغت في الغاء اعمالهم فان الغبار تراه منتظما
 مع الضرب فاذا حركته الريح تنثر و ذهب كل مذهب فلم یكف
 ان شبه اعمالهم بالغبار حتى جعل منتشرا لا یمكن جمعه
 والانتفاع به اصلا - (المختصر من روح المعانی)۔

ایک جماعت نے مجاہد حسن، عکرمہ، ابومالک اور عامر سے بیان کیا ہے کہ سورج
 کی شعائیں جو روزن (روشن دان) سے نظر آتی ہیں جن کو دیکھنے والا غبار کے ذرات
 سمجھتا ہے اسے غبار کہتے ہیں۔ یہی اہل لغت کے نزدیک مشہور ہے۔

راغب نے کہا، غبار مٹی کے چھوٹے چھوٹے ذرات کو کہتے ہیں جو ہوا میں اُٹھتے
 ہیں۔ وہ نظر فقط اس وقت آتے ہیں جب سورج کی روشنی روزن سے باہر آتی ہے

منتشرا کا مطلب ہے کہ ان کے اعمال کامل طور پر لغو اور بے کار ہیں کیونکہ
 غبار کے ذرات جب روشنی میں منتظم ہوتے ہیں چھوٹے چھوٹے ذرات کو کہتے ہیں تو وہ ہر طرف

پکھڑ جاتے ہیں۔
 اسی طرح ان کے اعمال کی بھی غبار سے اس وقت تشبیہ کامل ہوگی جب کہ

ان کے اعمال بھی منتشر بکھرے ہوئے سمجھے جائیں گے کہ ان کا جمع ہونا
 ممکن نہیں اور ان کو ان کے اعمال کا کوئی نفع نہیں۔ تفاسیر کی

ان عبارات کو دیکھنے کے بعد اعلیٰ حضرت کے ترجمہ پر نظر کی

جائے تو واضح ہوتا ہے کہ آپ نے قدِ منا کا معنی ہم نے قصد کیا بیان کیا ہے وہ ایک اعتراض کو مندرج کر رہا ہے اور سبباً منشوراً کا بھی آپ کا ترجمہ کامل اور واضح ہے۔ دوسرے تراجم کو دیکھ کر اہل انصاف خود ہی کوئی رائے قائم کر لیں: اِنَّ اللّٰهَ يَجِبُ الْقِسْطَ لِكُلِّ شَيْءٍ

اِذْ قَالَ لَهُمْ اَخُوهُمْ نُوحٌ اَلَا تَتَّقُوْنَ (پہلے ۱۹)

- جب اُن سے ان کے بھائی نوح نے کہا کہ تم ڈرتے کیوں نہیں (فتح محمد)۔
- جس وقت کہ کہا واسطے ان کے بھائی نوح نے کیا نہیں ڈرتے تم۔
- (شاہ رفیع الدین)
- جب کہا اُن کو ان کے بھائی نوح نے کیا تم کو ڈر نہیں (شاہ عبد القادر)
- " " " " " " " " (محمود الحسن)۔
- جب کہ ان کے بھائی نوح نے ان سے کہا تمہارا کیا تم ڈرتے نہیں ہو؟
- (مودودی)
- جب کہ اُن سے اُن کے بھائی نوح نے کہا کیا تم ڈرتے نہیں (عبدلماجد)۔
- جبکہ ان سے ان کے ہم قوم نوح نے کہا کیا تم ڈرتے نہیں (علیٰ حضرت)
- اعلیٰ حضرت نے یہاں اُنہیں ہم کا ترجمہ اُن کے ہم قوم کیا ہے جب کہ دوسرے حضرات نے "ان کے بھائی" کیا۔ صرف بھائی کہنے میں وہم ہے کیا حقیقی بھائی تھے یا دینی بھائی؟ اِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ اَخْوَةٌ کے مطابق یا کہ قومی بھائی تھے یا شان کے لحاظ سے بھائی کی طرح تھے۔ لیکن اعلیٰ حضرت کا ترجمہ حقیقت کو واضح کر رہا ہے کسی وہم کی اس میں گنجائش نہیں ہے کہ وہ ان کے ہم قوم تھے۔ اسی وجہ سے جلالین میں ذکر ہے اَنَّهُمْ نَسَبًا بَيْنَ اَسْطُورِيٍّ صَاوِيٍّ کے حوالہ سے ہے اِىٰى لَدِي الدِّمِينِ یعنی اُن کے ہم قوم نے کہا۔ یہاں دینی بھائی مراد نہیں۔ تفسیر کبیری میں ہے: اَنَّهُمْ نَسَبًا لَانَّهُ كَانَ مِنْهُمْ مَنْ قَتَلَ الْعَرَبَ

یا اَخَابَنِي تَمِيمٌ يَّرِيدُ دَنٍ وَاَحَدًا مِنْهُمْ۔ یعنی اُن کے نسبی بھائی ہم قوم مراد ہیں کیونکہ وہ ان سے سے ایک ہفتے جس طرح اہل عرب کہتے ہیں: یا اَخَابَنِي تَمِيمٌ۔ اور مراد اس سے ان میں سے ایک فرد ہوتا ہے۔ اِیٰى طَرَحِ یہاں بھی ہے۔ مدارک میں بھی ہے: اِذْ قَالَ لَهُم اَخُوهُمْ نَسَبًا لَدِي دِیْنِنَا جب کہ اُن کو ہم قوم نے کہا کہ دینی بھائی نے۔

وَتَنَحِّتُوْنَ مِنَ الْجِبَالِ يُّوْتًا فَاَرِهٰی (پہلے ۱۹)

- اور تراش لیتے ہو تم پہاڑوں سے گھر یا تکلف۔ (شاہ رفیع الدین)
- اور تم پہاڑوں کو تراش تراش کر اتراتے ہوئے مکان بناتے ہو۔ (عبدلماجد)
- اور تکلف سے پہاڑوں میں تراش تراش کر گھر بناتے ہو (فتح محمد)۔
- اور تراشتے ہو پہاڑوں کے گھر تکلف کے (مولانا محمود الحسن)۔
- اور تراشتے ہو پہاڑوں کے گھر تکلف سے (شاہ عبد القادر)۔
- اور کیا تم پہاڑوں کو تراش تراش کر اتراتے ہوئے مکانات بناتے ہو (اشرف علی)
- تم پہاڑ کھود کھود فخریہ انداز میں عمارتیں بناتے ہو۔ (مودودی)۔
- اور پہاڑوں میں گھر تراشتے ہو استاد دی سے۔ (اعلیٰ حضرت)
- قوم ثمود کا ذکر ہے۔ اعلیٰ حضرت نے فارہین کا معنی کیا استاد دی سے۔ اس کی تائید میں تفسیر کی عبارت ذکر کی جا رہی ہیں۔ مدارک میں ہے: فَاَرِهٰی شَامِيٍّ وَكَوْنِي حَاذِقِيْنَ حَالِ غَيْرِهِمْ فَرِهِيْنَ اَشْرَسِيْنَ وَالْخَاثِمِيْنَ اَلْكَيْسِ وَالنَّشَاطِ۔ شامی اور کوئی حضرات نے فارہین (الف کے سا) پڑھا ہے جس کا معنی ماہر ہونا، استاد ہونا۔ یہ حال واقع ہے۔ شامیوں اور کوئیوں کے غیروں نے فرہین (بغیر الف کے) پڑھا ہے جس کا معنی مجبور کرنا، اترانا۔ فراہت کا معنی عقلمندی، زیرکی اور ہشاش بشاش رہنا ہے۔ جلالین میں ہے: فَرِهِيْنَ بِطَرِيْنٍ وَفِيْ قَوَاةٍ فَاَرِهِيْنَ حَاذِقِيْنَ یعنی جس

قرأت میں فرہین ہے اس کے مطابق معنی ہے اترانا، تکبر کرنا اور مشہور قرأت میں
 فارہین (الف کے ساتھ) ہی ہے اس لیے اس کا ترجمہ تفاسیر کے مطابق مہارت
 سے، اتادی سے ہوگا۔ اگر مشہور قرأت فرہین (بغیر الف کے) ہوتی تو اترانا،
 اکڑنا، تکبر کرنا یہ معانی درست ہوتے لیکن مشہور و معروف قرأت کے مطابق تفاسیر
 کی رائے کو دیکھتے ہوئے کہنا پڑے گا کہ اعلیٰ حضرت کا ترجمہ تفاسیر سے مطابقت
 رکھتا ہے۔

وَادْخُلْنِي بِرَحْمَتِكَ فِي عِبَادِكَ الصَّالِحِينَ (پ ۱۹ ع ۲)

• اور داخل کر مجھ کو ساتھ رحمت اپنی کے بیچ بندوں اپنے صالحوں کے۔
 (شاہ رفیع الدین)

- اور مجھے اپنی رحمت سے داخل رکھ اپنے نیک بندوں میں (عبدالماجد)
- مجھے اپنی رحمت سے اپنے نیک بندوں میں داخل فرما (فتح محمد)
- اور ملائے مجھ کو اپنی رحمت سے اپنے نیک بندوں میں (مولانا محمود الحسن)
- اور ملا مجھ کو اپنی مہر سے اپنے نیک بندوں میں (شاہ عبدالقادر)
- اور مجھ کو اپنی رحمت سے اپنے نیک بندوں میں داخل رکھے (اشرف علی)
- اپنی رحمت سے مجھے اپنے صالح بندوں میں داخل کر (مودودی)
- اور مجھے اپنی رحمت سے اپنے ان بندوں میں شامل کر جو تیرے قرب
 خاص کے سزاوار ہیں۔ (اعلیٰ حضرت)۔

یہ حضرت سلیمان علیہ السلام کی دعا ہے اس لیے نبی کی دعا صرف نیک بندوں
 میں ہونے کی کافی نہیں بلکہ نیک بندے وہ مراد ہیں جن کو اللہ تعالیٰ کا قرب خاص
 حاصل ہو کیونکہ نیک آدمی تو عام غیر انبیاء بھی ہیں۔ اسی وجہ سے جلالین میں صلیب
 کی تفسیر الانبیاء والاء لیا چونکہ یہ قرب خاص کے سزاوار ہیں لہذا ان میں شامل کرنے
 کی دعا کی مدارک تفسیر کی ہے: ای فی ذمۃ الانبیاء المرسلین

اور مع عبادک الصالحین یعنی مجھے انبیاء و مرسلین کی جماعت میں شامل کر
 یا اپنے خاص مقرب بندوں میں شامل کر۔

لَوْلَا اَنْ رَّبَّنَا عَلٰی قُلُوبِنَا دِیْمٌ

- اگر نہ ہم نے گمراہی ہوتی اس کے دل پر (محمود الحسن)۔
- اگر نہ ہم نے گمراہی ہوتی اس کے دل پر (شاہ عبدالقادر)
- اگر ہم ان کے دل کو مضبوط نہ کئے رہے (عبدالماجد دریا آبادی)
- اگر ہم نہ ڈھارس بندھاتے اس کے دل پر (اعلیٰ حضرت)۔
- یہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی والدہ کا ذکر ہے جب کہ انھوں نے موسیٰ علیہ السلام
 کو صندوق میں بند کر کے دریا میں ڈال دیا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اگر ہم اس کے
 دل کی ڈھارس نہ بندھاتے تو قریب تھا کہ وہ بے قرار ہوتیں۔
- اس جگہ لولا کا جواب محذوف ہے جس پر ماقبل ان کاد ث کتبہ دخی یہ
 دلالت کر رہا ہے۔ یہاں بھی اعلیٰ حضرت کا ترجمہ مقصود پر دلالت کر رہا ہے اور جو معنی تفاسیر
 نے لیا ہے اسی کو آپ نے ذکر فرمایا۔ جلالین میں ہے: لَوْلَا اَنْ رَّبَّنَا عَلٰی
 قُلُوبِنَا دِیْمٌ ای سکنہ یعنی اگر ہم اس کے دل کو تسکین نہ دیتے، ڈھارس
 نہ بندھاتے۔ اسی طرح روح المعانی میں ہے: لَوْلَا اَنْ رَّبَّنَا عَلٰی قُلُوبِنَا
 ای بما انزلنا علیہ من السکین والمراد لولا ان ثبتنا قلوبہا و صبرناھا
 فالتربط علی القلب مجاز عن ذلک یعنی ربطنا علی قلوبہا
 کا معنی ہے کہ ہم نے جو اس پر تسکین کو نازل کیا۔ مراد یہ ہے کہ اگر ہم اس کے دل کو
 ثابت نہ رکھتے اور نہ صبر دلاتے معنی اس کے دل کی ڈھارس نہ بندھاتے۔ یہاں ربط
 قلب کا یہی مجازی معنی ہے۔ اعلیٰ حضرت کا ترجمہ مقصود کو واضح کر رہا ہے۔ اس کے
 سمجھنے میں کوئی استحالہ درپیش نہیں آتا اور حقیقی معنی گمراہی دینا مراد نہیں بلکہ مجازی
 معنی ہی مختیر ہے جیسا کہ روح المعانی سے واضح ہے۔

فَصُرْتُ بِهٖ عَنْ جَنْبٍ (پتہ ۱)

پھر دیکھتیں رہیں اس کو جنبی ہو کر (محمود الحسن)۔

تو اسے دور سے دیکھتی رہی (شاہ عبدالقادر)۔

حضرت مولیٰ علیہ السلام کو جب دریا میں ڈال دیا گیا تو آپ کی بہن دریا کے

کنارے کنارے دور سے منہ دیکھتی رہی۔

اعلیٰ حضرت نے عن جنب کا ترجمہ "دور سے" کیا ہے۔ مفسرین کرام نے بھی زیادہ

طور پر یہی معنی لیا۔ تفسیر کبیر میں ہے عن جنب ای عن بعد یعنی دور سے۔

مدارک میں بھی اسی طرح ہے عن جنب عن بعد دور سے۔ جلالین میں ہے

عن جنب من مکان بعید اختلافاً یعنی دور مکان سے نظر بچا بچا کر

دیکھتی رہی۔ جو روح المعانی میں ہے اختصاراً ذکر کیا جا رہا ہے: عن جنب

ای عن بعد وقیل ای عن شوق وقال الکرمانی الموصوف

محذوف ومعناه عن مکان بعید۔ وقیل عن جانب لاندھا کانت

تمشی علی الشریط۔ یعنی دور سے دیکھتی رہی بعضوں نے کہا

کہ اس کا معنی ہے شوق سے دیکھتی رہی۔ کرمانی نے کہا کہ اس کا موصوف محذوف

ہے۔ اصل عبارت ہوئی مکان جنب۔ اس کا معنی یہ ہوا "دور مکان سے دیکھتی رہی"۔

بعضوں نے کہا "ایک کنارے سے دیکھتی رہی کیونکہ وہ کنارے پر چل رہی تھی۔"

جنبی ہو کر دیکھتی رہی "میں کسی حد تک ہے وہ یہ ہے: وقیل انظر

عن جانب ان تنظر الی الشئ کانت لا تمیدہ بعضوں نے کہا ایک

طرف سے دیکھتی رہی یعنی کسی چیز کی طرف اس طرح نظر کرنا گویا کہ اس کو دیکھنے کا

ارادہ نہیں تھا تاہم اس کا بھی واضح معنی تو یہ تھا کہ نظر بچا بچا کر دیکھتی رہی۔ حقیقت

ہے کہ اعلیٰ حضرت کے ترجمہ کی تائید میں زیادہ تفاسیر کے اقوال ہیں۔

عَلَىٰ أَنْ تَأْجُرَنِي ثَمَانِي حَجَّجٍ (پتہ ۲)

اس عہد پر کہ تم آٹھ برس میری خدمت کرو (فتح محمد)۔

اس شرط پر کہ تو میری نوکری کرے آٹھ برس (محمود الحسن)۔

اس پر کہ تو میری نوکری کرے آٹھ برس (شاہ عبدالقادر)۔

اس شرط پر کہ تم آٹھ سال میری نوکری کرو (مولانا اشرف علی تھانوی)۔

بشرطیکہ تم آٹھ سال تک میرے ہاں ملازمت کرو (مودودی)۔

اس مہر پر کہ تم آٹھ برس میری ملازمت کرو (اعلیٰ حضرت)۔

یہ حضرت شعیب علیہ السلام کی کلام ہے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کی کہ

میں اپنی دو بیٹیوں میں سے ایک کا تمہارے ساتھ نکاح کرنے کا ارادہ رکھتا ہوں۔

شرط یہ ہے کہ مہر کے عوض تم آٹھ سال میری ملازمت کرو۔ اس وقت آپ کی شریعت

میں یہ مہر تھا۔

اعلیٰ حضرت کے ترجمہ سے یہ واضح ہے آٹھ سال تک ملازمت کی شرط بطور

مہر تھی۔ یہ وہم نہیں ہو سکتا کہ شاید آپ صرف بیٹی کا رشتہ دینے کا لالچ دے کر یہ

خدمت کرانا چاہتے ہوں اور مہر بعد میں کوئی اور مقرر کیا جانا ہو۔ باقی تراجم

میں یہ وہم ہو سکتا ہے لیکن اعلیٰ حضرت کے ترجمہ میں اس وہم کا کوئی ثبوت نہیں۔

روح المعانی میں ہے ویحییٰ بذلک المہر کہ اس سے مہر مراد ہے۔

إِنَّكَ لَا تَهْدِي مَنْ أَحْبَبْتَ (پتہ ۳)

تحقیق تو نہیں ہدایت کرتا جس کو چاہے (شاہ رفیع الدین)۔

جس کو آپ چاہیں ہدایت نہیں کر سکتے (عبدالماجد دریا آبادی)۔

اے (محمد) تم جس کو دوست رکھتے ہو اسے ہدایت نہیں کر سکتے (فتح محمد)۔

تو راہ پر نہیں لاتا جس کو چاہے (شاہ عبدالقادر محمود الحسن)۔

• اے نبی! تم جسے چاہو اُسے ہدایت نہیں دے سکتے (مودودی)۔

بے شک یہ نہیں کہ تم جسے اپنی طرف سے چاہو ہدایت کرو (اعلیٰ حضرت)
اعلیٰ حضرت کے ترجمہ میں یہاں یہ الفاظ استعمال ہوتے ہیں ”جسے اپنی طرف سے چاہو“
کیونکہ آپ نے ایک اعتراض کو مندرجہ کیا۔ اعتراض یہ ہوتا ہے کہ یہاں اللہ تعالیٰ نے نبی
کریم کی ہدایت کی نفی فرمائی کہ آپ ہدایت نہیں دے سکتے۔ دوسرے مقام پر ارشاد ہے
وَإِنَّكَ لَتَهْدِي إِلَى صِرَاطٍ مُسْتَقِيمٍ کہ آپ سیدھی راہ کی ہدایت فرماتے ہیں۔
اب ایک ہی ذات کا ہدایت فرمانا اور ہدایت نہ دینا ان میں منافات ہے۔ اس لیے
اعلیٰ حضرت نے یہ ترجمہ فرمایا کیونکہ مقصد یہ ہے کہ آپ اللہ تعالیٰ کی اجازت کے بغیر خود ہی
اپنی طرف سے کسی کو ہدایت نہیں کر سکتے۔

اسی وجہ سے مدارک میں لا تقدر ان تدخل فی الاسلام کل من
اجبت کہ آپ جسے چاہیں اس کو اسلام میں داخل کرنے کی قدرت نہیں رکھتے۔
مطلب یہ ہوا کہ نفی قدرت ہے نہ کہ نفی ہدایت وہ بھی مشیتِ انبوی کے بغیر اگر رب
خود قدرت عطا فرمائے تو اس میں کیا اعتراض ہو سکتا ہے تفسیر کبیر میں ہے: انہ
تعالیٰ قال فی هذه الآية انک لا تهدي من اجبت وقال فی
آية اخرى وانک لتهدي إلى صراط مستقیم ولا منافاة فی
بینہما فان الذی اثبتہ و اضافہ الیہ الدعوة والذی نفی
عنہ هادیت التوفیق وشرح الصدوق وهو خود یقذف
فی القلب فی حیایہ القلب۔ مطلب یہ ہے کہ ایک آیت میں ہدایت
کا ثبوت ہے اور دوسری آیت میں ہدایت کی نفی ہے لیکن ان میں کوئی منافات نہیں
اس لیے کہ جس آیت میں ہدایت کا ثبوت ہے اس میں دعوت حق اور بیانِ شریعہ ہے۔
جس میں نفی ہے اس میں توفیق عطا کرنا، سینہ کو کھولنا، دل میں نور ڈالنا جس سے
دل کو زندگی حاصل ہو اور نور ایمان کو قبول کر سکے۔

روح المعانی میں ہے: انک لا تهدي هادیت من صراط

إلى البغیة لا محالة من اجبت ای کل من اجبتہ طبعاً من
الناس قد ملک و غیرہم ولا تقدر ان تدخل فی الاسلام
یہاں ہدایت مراد منزل مقصود تک پہنچانا یعنی ایمان عطا کرنا جس کو آپ اپنی قوم
وغیرہ سے پسند فرمائیں اس کو ایمان عطا فرمائیں یہ نہیں ہو سکتا۔ اس لیے مقصد یہ
واضح ہوا کہ نفی اس ہدایت کی ہے جس میں قدرت و توفیق پائی جائے وہ اللہ تعالیٰ
کی اجازت کے بغیر ممکن نہیں۔ اللہ تعالیٰ کی اجازت سے ہدایت فرمانا رب تعالیٰ
کے لیے ہی ارشادِ گرامی سے ثابت ہے۔ نیز مولوی فتح محمد صاحب کے ترجمہ میں
”اے محمد! کس عربی لفظ کا ترجمہ ہے۔“

وَنَفَخَ فِيهِ مِنْ رُوحِهِ (پہلے)

- اور پھونکی اس میں اپنی ایک جان (مولانا محمود الحسن)۔
 - اور پھونکی اس میں اپنی جان میں سے (شاہ عبد القادر)۔
 - اور اس میں اپنی روح پھونکی (مولانا اشرف علی)۔
 - اور اس کے اندر اپنی روح پھونک دی (مودودی)۔
 - اور پھونکنا پچ اس کے روح اپنی سے (شاہ رفیع الدین)۔
 - اور اس میں اپنی طرف کی روح پھونکی۔ (اعلیٰ حضرت)۔
- اعلیٰ حضرت کے ترجمہ سے پتا چلتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو اپنی طرف سے
ایک روح عطا فرمائی یہ مراد نہیں کہ وہ اللہ کی اپنی روح انسان کو حاصل ہو گئی جیسا کہ
بظاہر دیگر تراجم سے وہم ہوتا ہے۔ اسی وجہ سے تفسیر کبیر میں ہے: و نفخ
فیہ من روحہ ای الروح التي هي ملكة كما يقول القائل داری و عبدی۔
یعنی یہاں روح سے مراد یہ ہے کہ وہ اللہ کی ملک میں ہے جس طرح کوئی کہے میرا
گھر اور میرا غلام۔ اسی طرح یہاں بھی مراد ہے۔ اعلیٰ حضرت نے اسی وجہ سے یہ ترجمہ
فرمایا اپنی طرف کی روح پھونکی۔ مدارک میں ہے: الاضافة للاختصاص کانت

قال ونفخ فيه من الشئ الذي اختم من هوبه ويعلم - یعنی یہاں روح کی نسبت جو اللہ تعالیٰ نے اپنی طرف کی ہے وہ اختصاص پر دل ہے مطلب یہ ہے کہ انسان میں رب نے اس چیز کو چھوٹا کیا جو اس کے ساتھ خاص ہے اور اس کے علم میں ہے۔ اس سے بھی پتا چلا کہ رب نے اپنی طرف سے انسان کو روح عطا فرمائی روح کو اپنی جانب صرف شرافت و تخصیص کے لیے منسوب کیا ہے۔ یہ مراد نہیں کہ اس کی اپنی جان اور روح مراد ہے۔ اردو محاورہ میں اس طرح کہا جاتے کہ میں تو اپنی جان کا ذمہ دار ہوں تو اس کا یہ مطلب ہے کہ میں اس کام کے کرنے میں فقط اپنا ذمہ دار ہوں کسی اور کا نہیں۔ اسی طرح یہ کہا جائے کہ جب تک میرے جسم میں میری روح موجود ہے میں انشاء اللہ اسی عقیدہ پر قائم رہوں گا۔ اس سے مراد بھی اس کی اپنی روح ہے اس لیے اعلیٰ حضرت کے ترجمہ میں یہ وہم نہیں ہوتا لیکن دیگر تراجم میں یہ وہم پایا جاتا ہے۔

وَلَنُذِيقَنَّ مِنَ الْعَذَابِ الْآدْنَىٰ ذُوقَ الْعَذَابِ الْأَكْبَرِ (پلہ ۱۱)

- اور البتہ چکھا دیں گے ہم ان کو تھوڑا سا عذاب ورے اس بڑے عذاب سے (شاہ عبدالقادر)۔
 - البتہ چکھائیں گے ہم ان کو تھوڑا عذاب ورے اس بڑے عذاب سے۔ (مولانا محمود الحسن)۔
 - البتہ چکھا دیں گے ہم ان کو عذاب چھوٹا سوائے عذاب بڑے کے۔ (شاہ رفیع الدین)۔
 - اور ضرور ہم انہیں چکھائیں گے کچھ نزدیک عذاب اس بڑے عذاب سے پہلے (اعلیٰ حضرت)۔
- اس مقام پر کفار کا ذکر ہوا ہے کہ ان کو آخرت کا عذاب یعنی عذابِ نار

دیا جائے گا اور اس سے پہلے دنیا کا عذاب دیا جائے گا۔ وہ دنیا کا عذاب کیا ہے؟ جلالین میں ہے: عذاب الدنيا بالقتل والاسر والجدب سنين والامراض - ان کو قتل کرنا، قید دلانا اور کئی سال محط سال میں مبتلا کرنا، امراض میں مبتلا کرنا۔

اب یہ سمجھا جائے کہ اس مقام پر اعلیٰ حضرت نے العذاب الادنیٰ کا ترجمہ "نزدیک کا عذاب" کیا ہے، تھوڑا عذاب نہیں کیا کیونکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ آدنای کا لغوی معنی نزدیک ہے جبکہ یہ دنو سے لیا جائے اور گھٹیا ہے جبکہ یہ دنیا یا دنیا سے لیا جائے۔ یہاں دنو سے لیا گیا ہے اس لحاظ پر نزدیک کا عذاب کرنا اس میں حسن اور کمال ہے کیونکہ اس میں احتیاط ہے دو متقابلوں میں سے ایک کو ذکر کرنا دوسرے کو چھوڑنا احتیاط ہے۔ یہاں بھی ایسے ہی ہے۔

تفسیر کبیر میں اس طرح بیان کیا گیا ہے: وَلَنُذِيقَنَّ مِنَ الْعَذَابِ الْآدْنَىٰ ذُوقَ الْعَذَابِ الْأَكْبَرِ

فَنَقُولُ حَصَلَ فِي عَذَابِ الدُّنْيَا امْرَانُ أَحَدُهُمَا أَنَّهُ قَرِيبٌ وَالْآخَرُ أَنَّهُ قَلِيلٌ صَغِيرٌ وَحَصَلَ فِي عَذَابِ الْآخِرَةِ أَيْضًا امْرَانُ أَحَدُهُمَا أَنَّهُ بَعِيدٌ وَالْآخَرُ أَنَّهُ عَظِيمٌ كَثِيرٌ لَكِنَّ الْقَرِيبَ فِي عَذَابِ الدُّنْيَا هُوَ الَّذِي يَصْلَحُ لِلتَّخْوِيفِ فَإِنَّ الْعَذَابَ الْعَاجِلَ وَأَنَّ كَانَتْ قَلِيلًا قَدْ يَحْتَرِضُ مِنْهُ بَعْضُ النَّاسِ أَكْثَرُ مَا يَحْتَرِضُ مِنَ الْعَذَابِ الشَّدِيدِ إِذَا كَانَ أَجَلًا وَكَذَا الشَّرَابُ الْعَاجِلُ قَدْ يَرْتَغِبُ فِيهِ بَعْضُ النَّاسِ وَيَسْتَعْبِدُ الشَّرَابَ الْعَظِيمَ الْآجِلَ وَأَمَّا فِي عَذَابِ الْآخِرَةِ فَالَّذِي يَصْلَحُ لِلتَّخْوِيفِ بِهِ هُوَ الْعَظِيمُ وَالْكَسْبُ لَا السَّعِيدُ لِأَمَّا بَيْنَا فَقَالَ فِي عَذَابِ الدُّنْيَا الْعَذَابُ الْآدْنَىٰ لِيَحْتَرِضُ الْعَاقِلُ عَنْهُ وَقَالَ لَنُذِيقَنَّ مِنَ الْعَذَابِ الْأَصْغَرِ مَا كَانَ يَحْتَرِضُ عَنْهُ

لصغره وعدم فهم كونه عاجلا وقال في عذاب الاخرة الاكبر لذلك المعنى
ولو قال دون العذاب الا بعد الاقصى لما حصل التخويف به مثل
ما يحصل بوصفه بالكبر وبالجملة فقد اختار الله تعالى في العذابين
الوصف الذي هو اصح للتخويف من الوصفين الاخرين فيهما الحكمة بالغة

یہاں بیان یہ کیا جا رہا ہے ولینقیضهم من العذاب اللاحق
بمقابلت العذاب الاقصى کے ہے یعنی دنیا کا عذاب قریب ہے اور آخرت کا عذاب
دور ہے۔ اسی طرح العذاب الاکبر، العذاب الاصغر کے مقابلہ میں ہے مقصد یہ
ہے کہ آخرت کا عذاب بڑا ہو گا جب کہ دنیا کا عذاب چھوٹا اور محض آباء فرماتے ہیں
کہ دنیا کے عذاب کو ادنیٰ یعنی نزدیک سے تعبیر کیا گیا ہے اور آخرت کے عذاب کو
بڑا کہا گیا ہے۔ اس میں یعنی نزدیک کا عذاب بمقابلہ بڑے عذاب کے ذکر کرنے میں
کیا فائدہ ہے۔ علامہ رازی اس کی حکمت بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ عذاب
دنیا میں بھی دو وجہ کا مل ہیں۔ ایک قریب ہونا اور دوسرا محض اور صغیر ہونا (شدید
نہ ہونا) اسی طرح عذاب آخرت میں بھی دو صورتیں ہیں، ایک بعید ہونا اور دوسرا بہت
زیادہ شدید ہونا لیکن عذاب دنیا کو ادنیٰ بمعنی قریب (نزدیک) کے ذکر اس لیے
کیا گیا ہے کہ مقصود تو خوف دلانا ہے۔ اس میں زیادہ خوف حاصل ہو سکتا ہے۔

اس لیے کہ بعض لوگ جلدی عذاب سے زیادہ ڈرتے ہیں بے شک وہ محض اور ہی ہو بہ
نسبت اس عذاب کے جو دیر سے آنے والا ہو بیشک وہ زیادہ بھی کیوں نہ ہو۔ یعنی
دیر والے عذاب سے اتنا نہیں ڈرتے جتنا جلدی والے سے ڈرتے ہیں۔ اسی طرح
آخرت والے عذاب میں اس کا شدید ہونا اور زیادہ ہونا ڈرانے کا سبب بننے کی زیادہ
صلاحیت رکھتا ہے اس کا دور ہونا ڈرانے کی صلاحیت اس طرح نہیں رکھتا جس
طرح اس کا زیادہ شدید ہونا۔ اسی وجہ سے دنیا کے عذاب کو نزدیک کا عذاب کہا
ہے تاکہ عقلمند آدمی اس سے بچے۔ اگر یہ کہا جاتا کہ ہم چکھائیں گے محض اور عذاب
تو اس سے اس عذاب کا جلدی ہونا تو سمجھ نہ آتا اور اس کے محض اور ہونے کی

وجہ سے اس سے احتراز نہ ہوتا (بچا نہ جاتا)۔

اسی وجہ سے آخرت کے عذاب کو اکبر کہا ہے (بڑا عذاب) اقصیٰ نہیں کہا
(دور کا عذاب) کیونکہ آخرت کے عذاب کو جو بڑا عذاب کہنے کی وجہ سے خوف دلانے
والا مقصد حاصل ہو سکتا ہے وہ دور کا عذاب کہنے سے نہیں حاصل ہوتا۔

حاصل کلام یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی حکمت کا ملکہ کا یہ تقاضا ہے اس نے دونوں
عذابوں کے ان وصفوں کو ذکر کیا ہے جس میں خوف دلانے کی زیادہ صلاحیت
موجود ہے۔ ان وصفوں کو نہیں ذکر کیا جن میں یہ صلاحیت نہیں۔

اب علامہ رازی رحمۃ اللہ علیہ کی اس تقریر و پذیر کے بعد بھی کوئی شخص
اعلیٰ حضرت کے ترجمہ کی خوبی کا منکر ہے اور آپ کی علمی بصیرت کو نہ تسلیم کرے تو یہی
دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس شخص کے عذاب کو دور کرے ورنہ کسی منصف شخص سے یہ امید
کرنا ممکن نہیں کہ وہ اعلیٰ حضرت کے ترجمہ کو کامل ترین نہ ملنے۔ توجہ فرمائیں کہ اعلیٰ حضرت نے
العذاب الادنیٰ کا ترجمہ نزدیک کا عذاب اور دونوں کا ترجمہ پہلے کیا ہے اور دیگر مترجمین
نے العذاب الادنیٰ کا ترجمہ محض اور عذاب اور دونوں کا "وسا" کیا ہے کون سا
ترجمہ حکمت باری تعالیٰ کے مطابق ہے اور کون سا مخالف۔

فَاخْوَانُكُمْ فِي الدِّينِ وَ مَوَالِيكُمْ (پہلے)

• تو دین میں تمہارے بھائی اور دوست ہیں (فتح محمد)۔

• پس بھائی تمہارے ہیں بیچ دین کے اور چلے تمہارے ہیں (شاہ رفیع الدین)۔

• تو تمہارے بھائی ہیں دین میں اور رفیق ہیں (مولانا محمود الحسن)۔

• تو تمہارے بھائی ہیں دین میں اور رفیق (شاہ عبد القادر)۔

• وہ تمہارے دین میں بھائی ہیں اور دوست (اشرف علی)۔

• وہ تمہارے دینی بھائی اور رفیق ہیں (مودودی)۔

• وہ تمہارے دین کے نو بھائی ہیں اور تمہارے دوست (عبد المجید ریاضی)۔

تو دین تمہارے بھائی ہیں اور بشریت میں تمہارے چچا زاد (علیٰ حضرت)
حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے متبیتی (لے پالک
بیٹے) تھے اور لوگ ان کو ابن محمد کہنے لگے۔ اسی وجہ سے جب نبی کریم نے حضرت زینب
بنت جحش سے نکاح کیا تو یہود و منافقین نے یہ کہا کہ دیکھو محمد صلی اللہ علیہ وسلم
نے اپنے بیٹے کی مطلقہ بیوی سے نکاح کر لیا۔ رب تعالیٰ نے فرمایا کہ کسی کو بیٹا کہنے سے
وہ حقیقتاً بیٹا نہیں بنتا اور جمیع احکام بیٹے والے اس پر جاری نہیں ہوتے کہ جس طرح
حقیقی بیٹے کی مطلقہ یا بیوہ زوجہ سے نکاح نہیں ہو سکتا اسی طرح اس سے بھی نہ ہو۔
اس آیت کریمہ میں یہ ذکر فرمایا کہ تم ان کو اپنے بالوں کے ناموں سے ہی پکارو۔ یہ ہی اللہ
تعالیٰ کو پسند ہے۔

یعنی جس طرح تم زید ابن محمد کہتے ہو ایسے نہ کہو بلکہ زید بن حارثہ کہو۔ اسی طرح
اور کسی کو پکارنا ہو تو اس کے باپ کے نام سے پکارو اگر تم ان کے باپوں کو نہیں جانتے
تو وہ تمہارے دین میں بھائی ہیں اور بشریت میں چچا زاد۔ و مولیکم بنو عمکم
(جلالین) ”اور تمہارے چچا زاد ہیں۔“ اس پر حمل میں اس طرح ذکر کیا
گیا ہے :- و قوله بنو عمکم تفسیر للموالی فان الموالی یطلق علی
معایب من جملتہما بنی العم ای فاذا لم تحرفوا ایما شخص
تنسبونہ الیہ واسم دم خطاب فقوله یا ابن عمی یعنی بنو عمکم سے
مفسر رحمۃ اللہ علیہ نے موالی کی تفسیر کی ہے کیونکہ موالی کئی معنوں میں استعمال ہوتا ہے
یہاں چچا زاد کے معنی میں استعمال ہے کیونکہ اس کے معانی میں سے یہ بھی ہے۔
مقصد بیان یہ ہے کہ اگر تم کسی شخص کے باپ کو نہیں پہچانتے جس کی طرف اے
منسوب کر سکو اور اس کا بیٹا کہہ کر اسے پکارو اور تم اسے پکارنا چاہتے ہو، اس سے
کوئی خطاب کرنا چاہتے ہو تو اے چچا زاد کہہ کر پکارو یعنی اے میرے چچا کے بیٹے
اے میرے چچا زاد کہو۔ یا پہلے جو ذکر ہو چکا ہے فاخو انکم فی الدین کہ وہ تمہارے
دین میں بھائی ہیں، تو ان کو اے میرے بھائی کہہ کر پکارو۔

اس پر کمالین کی عبارت یہ ہے : بنو عسکرفان آدم علیہ السلام
جد کی نبی آدم والمرئی يطلق علی بنی الحم ومن قول ذکر ریا
والفی خفت الموالی من وراثتی یعنی موالیکم کا معنی تمہارے چچا زاد کیوں ہے
اس لیے کہ حضرت آدم علیہ السلام تمام انسانوں کے جدِ امجد ہیں اور موالی کا معنی چچا
آتا رہتا ہے جس طرح حضرت زکریا علیہ السلام نے بارگاہِ انبوی میں عرض کیا والی
خفت الموالی من وراثتی ۔ یہاں بھی موالی چچا زاد کے معنی میں ہی ہے ۔
اعلیٰ حضرت کے ترجمہ پر تفاہمیر کی تائید موجود ہے اور آپ کا ترجمہ آپ
کے کمالِ علمیّت پر دل ہے ۔

النَّبِيِّ أَوْلىٰ بِالْمُؤْمِنِينَ مِنْ أَنْفُسِهِمْ (٢١/٤٨)

- [illegible]

حضرت ابن مسعود کی قرأت میں ہے النبی اولى بالمؤمنین
من انفسهم وحوالہ لہم۔ تہی مومنوں پر حیران ہیں اور ان کے مالک ہیں

ان کی جان سے زیادہ کیونکہ وہ ان کے باپ ہیں۔

حضرت مجاہد نے کہا کہ ہر نبی اپنی امت کا باپ ہوتا ہے اسی وجہ سے سب لوگ ایک دوسرے کے بھائی ہیں کیونکہ ان کے نبی کریم دینی لحاظ سے ان کے باپ ہیں۔
روح المعانی میں اس طرح ہے جو اختصاراً ذکر کیا جا رہا ہے :-

المبني اولى بالمؤمنين اولى الحق واذا باب اليريم من النفس
او اشد ولايته ونصرة لهم منها خان عليه الصلوة والسلام
لا يامسهم ولا يرضى منه الا بما فيه صلاحهم ونجاحهم عن
ابن هزيمة عنه صلى الله عليه وسلم انه قال وما من مؤمن الا انا اولى
الناس به في الدنيا والاخرة - نبی کریم مومنوں پر ان کی جان سے زیادہ
حق رکھتے ہیں اور ان کے قریب ہیں۔ یا ان پر آپ کو ولایت حاصل ہے یعنی آپ ان
کی جان سے زیادہ مالک ہیں اور ان کے ناصر ہیں اس لیے کہ نبی کریم نے جو حکم
بھی فرمایا اس میں مومنوں کی بہتری اور کامیابی کو مد نظر رکھا۔

حضرت ابو ہریرہ نبی کریم سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا کہ کوئی مومن نہیں
مگر یہ کہ میں تمام لوگوں سے زیادہ اس پر ولایت مالکیت رکھتا ہوں۔
اعلیٰ حضرت کے ترجمہ پر مذکورہ تفاسیر کی تائید ہے اور یہ زیادہ قریب الفہم بھی
ہے۔ اگرچہ دیگر تراجم پر بھی تفسیر کبیر سے تائید ملتی ہے تاہم ذکر کرنے کی وجہ یہ
ہے کہ کوئی اعلیٰ حضرت کے ترجمہ کو اس مقام پر مورد طعن نہ بنا سکے۔

مَنْ يَأْتِ مِنْكُمْ بِفَاحِشَةٍ مُّبَيَّنَةٍ (پاکہ آخری آیت)

- جو کوئی آئے تم میں سے ساتھ بے حیائی ظاہر کے (شاہ رفیع الدین)
- جو کوئی کر لائے تم میں کام بے حیائی کا صریح (مولانا محمود الحسن)
- (شاہ عبدالقادر)
- جو کوئی تم میں کھلی ہوئی بے ہودگی کرے گی (مولانا اشرف علی)

• تم میں سے جو کوئی کھلی ہوئی بے ہودگی کرے گی (عبدالماجد دریا آبادی)

• جو تم میں صریح خیال کے خلاف کوئی جرات کرے (اعلیٰ حضرت)

اس آیت میں خطاب نبی کریم کی ازواج مطہرات کو ہے جو امہات المؤمنین ہیں۔
ایک ہی مضمون کو ترجمہ کرتے وقت مختلف الفاظ سے تعبیر کیا گیا ہے لیکن اعلیٰ حضرت
کے ترجمہ اور دوسرے تراجم میں کتنا فرق نمایاں ہے۔ آپ نے ایسے الفاظ ترجمہ میں لائے
ہیں جو ادب احترام پر دل ہیں جب کہ دیگر حضرات ازواج مطہرات کی شان میں الفاظ
ادب کو پیش نہ کر سکے جس کو اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے نواز دے وہی بزرگ مستویوں کی
شان کا پاس کرتا ہے۔

وَتَخْشَى النَّاسَ وَاللَّهَ أَحَقُّ أَنْ تَخْشَاهُ (پاکہ ۲۳)

• اور ڈرنا تمھارے لوگوں سے اور اللہ بہت لائق ہے اس کا کہ ڈرے تو اس
سے (شاہ رفیع الدین)

• اور ڈرنا تمھارے لوگوں سے اور اللہ سے زیادہ چاہیے ڈرنا (محمود الحسن)

• اور تو ڈرنا تمھارے لوگوں سے اور اللہ سے زیادہ چاہیے ڈرنا تجھ کو۔

(شاہ عبدالقادر)

• اور آپ لوگوں سے اندیشہ کرنے سے بچے اور ڈرنا تو آپ کو خدا ہی سے
زیادہ سزاوار ہے۔ (مولانا اشرف علی تھانوی)

• اور تم لوگوں سے ڈرتے تھے حالانکہ خدا اس کا زیادہ مستحق ہے کہ اس
سے ڈرو (فتح محمد)

• اور تمھیں لوگوں کے طعنہ کا زیادہ اندیشہ تھا اور اللہ زیادہ سزاوار ہے کہ
اس کا خوف رکھو۔ (اعلیٰ حضرت)

اللہ تعالیٰ نے نبی کریم کو علم عطا فرمادیا تھا کہ آپ کے نکاح میں حضرت
زینب آئیں گی۔ آپ نے اس کو مخفی رکھا اور لوگوں کے طعنہ کا اندیشہ ہوا کہ لوگ

کہیں گے اپنے نے پاک بیٹے کی زوجہ (مطلقہ) سے نکاح کر لیا ہے۔ نبی کریم کو اس کا پہلے ہی علم تھا کہ حضرت زینب میرے نکاح میں آئیں گی۔ اس پر روح البیان کی عبات ملاحظہ ہو: وهو علم بان شریک سبطتھا و سبطکھا یعنی انت تعلم بما اعلنتک انہا مستکون زوجتک و انت تخفی فی نفسك هذا المعنی و انتہ یرید ان یخزلک وعدہ و یرید انہا زوجتک بقولہ زوجناکما یعنی نبی کریم جانتے تھے کہ حضرت زینب کو طلاق دیدیں گے اور وہ آپ کے نکاح میں آئیں گی یعنی اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ میں نے تمہیں علم عطا فرمایا کہ وہ آپ کی زوجیت میں آئیں گی لیکن آپ نے اسے مخفی رکھا لیکن اللہ تعالیٰ نے اپنا وعدہ پورا کرنے کا ارادہ فرمایا۔ وہ آپ کی زوجیت میں آگئیں اور اللہ تعالیٰ نے زوجناکما کہہ کر اس کو ظاہر فرما دیا

یہاں تک تو صرف سمجھانے کے لیے آیت کریمہ کا مفہوم پیش کیا۔ اب تراجم میں فرق کی طرف توجہ کی جائے۔ باقی تراجم میں ذکر کو عام رکھا گیا، تو ڈرتا تھا، یا تجھے لوگوں کا اندیشہ تھا۔ اس قسم کے تراجم اوہام باطلہ کا سبب بنتے ہیں جن سے یہ بتا چلتا ہے کہ نبی کریم لوگوں سے ڈرتے تھے حالانکہ آپ نے اکیلے ہوتے ہوئے قوم کو اللہ کی وحدانیت کا پیغام دیا۔ شعب ابی طالب میں قوم کی قطع تعلقی کے سبب سے رہے لیکن پائے استقامت میں پکڑنے آئی۔ ایک مرتبہ اپنے سر پرست حجاج ابوطالب کو بھی کہہ دیا کہ آپ میری سرپرستی بیشک چھوڑ دیں میں اللہ کی وحدانیت بیان کرنے سے نہیں مرگ سکتا۔

مطلقاً یہ کہہ دیا جائے تو ڈرتا تھا تو نبی کریم کی شان کے خلاف ہے لیکن حضرت نے ایک خاص صوت میں ڈر اور اندیشہ کا ذکر کیا ہے یعنی آپ لوگوں کے طعنہ سے اندیشہ کرتے تھے کہ لوگ کہیں گے کہ اپنے نے پاک بیٹے کی زوجہ سے نکاح کر لیا۔ ذکر کا تعلق فقط اسی صورت میں ہے۔

جلالین میں اس طرح ذکر کیا گیا ہے: وتخشی الناس ان یقولوا تزوج

محمد بن وجہ ابنہ۔ آپ لوگوں کے اس طعنہ کی فکر کرتے ہیں کہ لوگ کہیں گے کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اپنے بیٹے کی زوجہ سے نکاح کر لیا۔

روح المعانی میں ہے: وتخشی الناس تخاف من اعتراضہم وقیل ای تستحی من قولہم ان محمد اصر علیہ وسلم تنزع زوجہ ابنہ والمراد بالناس الجنس والمنافقون۔ آپ کو لوگوں کے اعتراض کی فکر تھی اور کہا گیا ہے کہ آپ انکی باتوں سے شرم محسوس فرماتے کہ یہ کہیں گے کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اپنے بیٹے کی زوجہ سے نکاح کر لیا۔ لوگوں سے مراد بھی منافقین ہیں یعنی یہ فکر منافقوں کی کلام کی تھی۔

الحضرت کے ترجمہ کی یہی خصوصیت ہے کہ آپ نے ہر پہلو کو مد نظر رکھا اور متوقع خدشات کو پہلے ہی دور فرما دیا۔

إِنَّا أَرْسَلْنَاكَ شَاهِدًا (پ ۳۱)

- ہم نے تجھے کو بھیجا بتانے والا (مولانا محمود الحسن)۔
- " " " " (شاہ عبدالقادر)۔
- ہم نے آپ کو اس شان کا رسول بنا کر بھیجا کہ آپ گواہ ہوں گے (اثر علی)۔
- ہم نے تجھے بھیجا گواہ بنا کر (مولانا مودودی)۔
- بے شک ہم نے آپ کو بھیجا ہے بطور گواہ (عبد الماجد دریا آبادی)۔
- بے شک ہم نے تجھے بھیجا حاضر و ناظر (اعلیٰ حضرت)۔

اعلیٰ حضرت کے اس ترجمہ پر معترضین نے بڑے غصہ میں کہا کہ حاضر و ناظر کسی لفظ کا ترجمہ نہیں، حاضر و ناظر معنی غلط ہے۔ قرآن پاک کے مفہوم سے نا بلند ہونے کی علامت ہے۔ لیکن متوسل یہ ہے کہ معترضین تفاسیر سے نا بلند ہونے کی وجہ سے حضرت کے ترجمہ کو مورد الزام ٹھہراتے ہیں۔ حالانکہ عقل کا تقاضا یہ ہے کہ تفاسیر کو دیکھ کر جو بات نہ ملے پھر اعتراض کرے۔ تفسیر روح المعانی میں دیکھا جائے

اس طرح ذکر ہوتا ہے :-

اما ارسلناک شاهد اعلیٰ من بعثت الیہم شراکب احوالہم
و تشاہد اعمالہم - ہم نے آپ کو شاہد بنا کر بھیجا یعنی آپ جن کی طرف مبعوث
ہیں ان کے احوال کے محافظ اور ان کے اعمال کے ناظر ہیں۔ روح المعانی میں اور اسی
طرح ذکر کیا گیا ہے : انہ صلی اللہ علیہ وسلم حی بروحہ وجسدہ لیس فی
حیث شاء فی اقطار الارض وال ملکوت یعنی نبی کریم اپنے روح اور جسم کے ساتھ زندہ
ہیں اور آپ جہاں بھی چاہیں زمین و آسمان کے اطراف میں جاسکتے ہیں :- و انشاد
بعض السادة الصوفیة لی ان الله تعالى قد اطلع صلی اللہ علیہ وسلم
على اعمال العباد فنظر الیہما و لذلك اطلق علیہ علیہ الصلوٰۃ والسلام
شاهد قال مولانا جلال الدین الرومی قدس سرہ العزیز فی مثنوی :-

در نظر بودش مقامات العباد زان سبب نامش خدا شاہ نہاد
فقال ولا تغفل لبعض سادات صوفیائے کرام نے یہ فرمایا کہ آپ بندوں کے
اعمال پر مطلع ہیں، ان پر نظر فرماتے ہیں۔ اسی وجہ سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو شاہد
کہا گیا ہے۔ علامہ رومی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی مثنوی میں فرمایا :
”بندوں کے مقامات آپ کی نظر میں ہیں اسی وجہ سے آپ کا نام اللہ تعالیٰ نے
شاہد رکھا۔“

آگے علامہ آکوستی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ سوچ اور غافل نہ ہو مطلب یہ
ہے کہ غافل کو یہ بات سمجھ نہیں آسکتی۔ اعلیٰ حضرت اپنے ترجمہ میں منفرد نہیں بلکہ تفسیر
میں بھی معنی پیش کیا گیا ہے اور فرمایا ہے کہ کرام بھی اسی معنی کے قائل ہیں۔ البتہ یہ
خیال رہے کہ اہلسنت و جماعت کا حضور کے حاضر و ناظر میں یہ عقیدہ نہیں کہ حضور
اپنے جسم ظہر کے ساتھ ہر جگہ موجود ہیں اور ہر ایک کے سامنے ظاہر ہیں بلکہ عقیدہ
یہ ہے کہ حقیقت محمدیہ صلی اللہ علیہ وسلم تمام عالم میں جاری و ساری ہے حضور صلی
اللہ علیہ وسلم اپنی روحانی طاقت سے بیک وقت کئی مقام پر موجود ہوتے ہیں۔ اسی

وجہ سے اولیائے عظام نبی محترم کو حالت بیداری میں دیکھتے ہیں اور آپ کی تجلیات کا
مشاہدہ کرتے ہیں حضور کا سامنے ہونا بمعنی حاضر کے ہیں اور آپ کا اپنی امت اور امت
کے احوال کو دیکھنا بمعنی ناظر کے ہے۔ علامہ عبدالحی لکھنوی نے شرح وقایہ کے حاشیہ
سعایت میں تحریر فرمایا : السری فی خطاب الشہدان الحقیقۃ المحمدیۃ
کانہا ساریۃ فی کل وجود و حاضرة فی باطن کل عبد و انکشاف
ہذہ الحالة علی الوجه الاتم فی حال الصلوٰۃ فحصل محل الخطاب یعنی علامہ عبدالحی
لکھنوی فرماتے ہیں کہ تشہد میں السلام علیک ایہا النبی میں نبی کریم کو خطاب میں یہ راز
ہے کہ حقیقت محمدیہ صلی اللہ علیہ وسلم پر وجود میں جاری ہے اور ہر بندے کے باطن
میں موجود ہے اور یہ حالت کامل طور پر نماز میں حاصل ہوتی ہے اور اسی وجہ سے
محل خطاب حاصل ہو گیا۔

اسی طرح اشعۃ اللمعات شیخ عبدالحق محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں :-

”بعضہ از عرفا کفتمہ اند کہ ایں خطاب کجہت سر بیان حقیقتہ محمدیہ

است در ذرات موجودات و افراد ممکنات پس آنحضرت در ذوات مصلیٰ

موجود و حاضر است پس مصلی را باید کہ ازیں بارگاہ باشد و ازیں شہود

غافل نبود تا بہ انوار قرب و اسرار معرفت متنور و فائز گردد“

بعض عارفین نے التجلیات میں نبی کریم کے خطاب میں یہ وجہ بیان کی ہے کہ حقیقتہ

محمدیہ تمام موجودات کے ذرات اور ممکنات کے افراد میں موجود ہے پس نبی کریم

کی حقیقت نمازیوں میں موجود ہوتی ہے۔ اس لیے نمازیوں کو اس سے باخبر ہونا چاہیے

تاکہ نبی کریم کی موجودگی سے بخیر نہ رہیں اور نبی کریم کی تجلیات کے انوار سے منور

ہو سکیں اور کامیابی حاصل کر سکیں۔

اب یہ واضح ہوا کہ اہلسنت و جماعت کا نبی کریم کے حاضر و ناظر ہونے کا

جو عقیدہ ہے اس کو منی لفین و مختصرین کے اپنے ہی ممدوح مولانا عبدالحی لکھنوی نے

بھی تحریر فرمایا ہے۔ امید ہے کہ ان کی وجہ سے ہمیں بھی کوئی نام کا توحیدی لینے

شرک کے فتویٰ سے بچائے گا یا پھر اپنے امام کو بھی اپنے فتویٰ کی لپیٹ میں لائے گا۔

يُجِبَالْ اَوْ بِ مَعَهُ (پ ۱۶)

- اے پہاڑو! خوش آوازی سے پڑھو اس کے ساتھ (مولانا محمود الحسن)
- اے پہاڑو! داؤد کے ساتھ بار بار تسبیح کرو (مولانا اشرف علی)
- اے پہاڑو! اس کے ساتھ ہم آہنگی کرو (مودودی)
- اے پہاڑو! ان کے ساتھ تسبیح کرو۔ اے پہاڑو! اس کے ساتھ اللہ کی طرف رجوع کرو (اعلیٰ حضرت)

حضرت داؤد علیہ السلام کا ذکر ہے کہ آپ جب اللہ کا ذکر فرماتے تسبیحات پڑھتے، آپ کے ساتھ پہاڑ بھی پڑھتے۔ اعلیٰ حضرت کے ترجمہ میں یہ خوبی ہے کہ مقصد بیان اور لغوی معنی دونوں کو شامل ہے کیونکہ اَوْ بِ کا لغوی معنی رجوع کرنا ہے آپ نے ترجمہ فرمایا اللہ کی طرف رجوع کرو یعنی اللہ کی طرف راجع ہو کر اس کا ذکر کرو۔

روح المعانی میں ہے: وَالظَّاهِرُ أَنَّهُ عَرَبِيٌّ مِنَ التَّوْبِ وَالْمُرَادُ رَجَعِي مَعَهُ تَسْبِيحٌ وَرَدَّ بِهِ وَقَالَ ابْنُ عَطِيَّةٍ إِنَّ أَوَّلَ مَا حُضِرَ آبُ وَضَعُفٌ لِّلْمَبَالِغَةِ وَتَعْقِبُهُ فِي الْبَحْرِ يَقُولُهُ وَيُظْهِرُ أَنَّ التَّضْعِيفَ لِلتَّعْدِيَةِ لِأَنَّ آبَ بِمَعْنَى رَجَعٍ لَّازِمٌ صَلَوةُ السَّلَامِ فَهَدَى بِالتَّضْعِيفِ إِذْ شَرَحُوهُ: بِقَوْلِهِمْ رَجَعِي مَعَهُ التَّسْبِيحُ - يَرَوْنَ أَنَّهُ عَلَيْهِ السَّلَامُ كَانَ إِذَا سَبَّحَ سَبَّحَتِ الْجِبَالُ مِثْلَ تَسْبِيحِهِ بِصَوْتٍ يَسْمَعُ مِنْهَا وَلَا يَعْزُزُ امْتِنَانُهُ عَزَّوَجَلَّ أَنْ يَجْعَلَهَا بِحَيْثُ تَسْبِيحُ بِصَوْتٍ يَسْمَعُ وَقَدْ سَبَّحَ الْحَصَى فِي كَفِّ نَبِيْنَا عَلَيْهِ الصَّلَاةُ وَالسَّلَامُ وَسَمِعَ تَسْبِيحَهُ وَكَذَا فِي كَفِّ ابْنِ بَكْرٍ رَضِيَ امْتِنَانُهُ عَنْهُ - يَعْنِي ظَاهِرٌ يَهْدِي بِهِ أَنَّ أَوْ بِ عَرَبِيٌّ لَفْظٌ هُوَ أَوْ اس سے مراد یہ ہے کہ پہاڑو! اللہ کی طرف رجوع کرو یعنی ذکر کرتے ہوئے تسبیحات پڑھتے ہوئے اللہ کی طرف رجوع کرو۔

ابن عطیہ نے کہا ہے کہ اصل ماضی آب تھی پھر عین کلمہ کو مشدّد کیا۔ باب تفعیل پر لے گئے مبالغہ کے لیے۔ اور بحر میں یہ کہا گیا ہے کہ تضعیف متعدي بنانے کے لیے ہے۔ آب لازم ہے رَجْع کے معنی میں ہے۔ اس کے بعد اس کا صلہ لازم آتا ہے جب متعدي کیا گیا تو معنی ہوا اللہ کی طرف رجوع کرو تسبیح کرتے ہوئے۔

روایت کیا گیا ہے کہ حضرت داؤد علیہ السلام کی تسبیحات کے ساتھ پہاڑ بھی تسبیح کرتے اور ان کی آواز سنائی دیتی تھی۔ حضرت داؤد علیہ السلام کی تسبیحات سے مراد تلاوت زبور ہے کیونکہ زبور میں صرف ذکر، اذکار اور تسبیحات تھیں، اور وہ وہی نہیں تھے (اللہ تعالیٰ کو مشکل نہیں کہ وہ پہاڑوں کو تسبیحات کی طاقت عطا فرمائے اور ان کی آواز سنائی دے جیسا کہ نبی کریم کے ہاتھ مبارک میں کنکریوں نے کلام کی۔ اعلیٰ حضرت کا ترجمہ رجوع مع تسبیحات کو مشکل ہے کیونکہ اللہ کی طرف رجوع اس کے ذکر اور تسبیحات کے بغیر نہیں۔ مدارک میں بھی اسی طرح اَوْ بِ مَعَهُ مِنَ التَّوْبِ اِی رَجَعِي مَعَهُ التَّسْبِيحُ - یعنی مع تسبیحات کے رجوع کرو مطلب یہ کہ اللہ کی طرف رجوع کرو۔

فَلَمَّا خَرَّ (پ ۱۷)

- پھر جب وہ گر پڑا (مولانا محمود الحسن، شاہ عبد القادر)
 - اسی طرح جب سلیمان گر پڑا (مودودی) • سو وہ جب گر پڑے (عبد المجید)
 - پس جب گر پڑا (شاہ فیع الدین)
 - پھر جب سلیمان زمین پر آیا۔ (اعلیٰ حضرت)
- حضرت سلیمان علیہ السلام جنوں سے بیت المقدس کی تعمیر کرا رہے تھے۔ آپ پر تو کا وقت آگیا۔ ابھی تک بیت المقدس کا کام ختم نہیں ہوا تھا۔ آپ کی خواہش پر اللہ تعالیٰ نے آپ کو اسی طرح عصا پر سہارا لے کر جس طرح کھڑے تھے ثابت رکھا جب عصا کو دیکھنے لگا اور آپ زمین پر تشریف لے آئے تو بیت المقدس کا کام بھی مکمل ہو

چکا تھا۔

یہاں تراجم میں فرق یہ ہے کہ ایک ہی مفہوم کو مختلف انداز میں پیش کیا گیا ہے لیکن اعلیٰ حضرت کے ترجمہ میں ادب کا لحاظ ہے غور فرمائیں جب وہ گریڈ پڑا یا زمین پر آیا۔ ان دونوں میں کتنا نمایاں فرق ہے۔

إِنَّ أَصْحَابَ الْجَنَّةِ الْيَوْمَ فِي شُغْلٍ فَاكِهِونَ (پ ۲۴۸)

تحقیق بہشت کے لوگ آج ایک دھندے میں ہیں باتیں کرتے دشاہ عجلہ قادرا۔
تحقیق بہشت کے لوگ آج ایک مشغلہ میں ہیں باتیں کرتے (مولانا محمود الحسن)
اہل جنت بے شک اس روز اپنے مشغلہ میں خوش دل ہوں گے (عجلہ ماجد)
بے شک جنت والے آج دل کے بہلاؤوں میں چین کرتے ہیں (اعلیٰ حضرت)
اعلیٰ حضرت نے فاکہون کا ترجمہ کیا ہے "چین کرتے ہیں" اس کی تائید میں تفسیر مدارک کی عبارت اس طرح ہے :- وَالْفَاكِهَةُ وَالْفَاكَةُ الْمَتْنَعُ الْمَتْلُذُ وَمِنْهُ الْفَاكَةُ مِمَّا يَتْلُذُ بِهِ
یعنی فاکہہ اور فکہ کا معنی چین میں رہنا اور لذت دینا۔ اسی وجہ سے پھلوں کو جولذت دینے والے ہوتے ہیں فاکہہ کہا جاتا ہے۔

جلالین میں ہے : فَاكِهونَ نَاعَمونَ وہ چین میں ہونگے۔

اعلیٰ حضرت کے ترجمہ کی فوقیت پر تفاسیر دال ہیں کیونکہ مقصود وہی ہے کہ وہ اپنے دل کے بہلاؤوں میں چین کرتے ہوں گے۔ آپ کا ترجمہ مقصد بیان سے مطابقت رکھتا ہے جو اس کے درجہ کمال پر صراحتہ دال ہیں۔

بَلْ هُمُ الْيَوْمَ مُسْتَسْلِمونَ (پ ۲۴۸)

بلکہ وہ آج کے دن فرماں بردار ہیں (شاہ رفیع الدین)

کوئی نہیں وہ آج آپ کو کپڑے داتے ہیں۔ (شاہ عجلہ قادرا)۔

اے آج تو یہ اپنے آپ کو (اور ایک دوسرے کو) حوالے کئے دے رہے ہیں۔

بلکہ آج تو وہ فرمانبردار ہیں (فتح محمد)

بلکہ وہ آج گردن ڈالے ہیں۔ (اعلیٰ حضرت)

اس مقام پر ہتھیوں کا ذکر ہے کہ جب ان کو جہنم کی طرف بھیجا جائے گا، رب تعالیٰ فرمائے گا ان کو ٹھہراؤ۔ ان سے پوچھنا ہے کہ آج تم ایک دوسرے کی مدد کیوں نہیں کرتے؟ تو وہ کوئی جواب دینے کی طاقت میں تو نہیں ہوں گے، ندامت و مذلت سے سر جھکا لیں گے۔ گردن ڈالے ہوئے ہوں گے۔

اعلیٰ حضرت نے مستسلمون کا ترجمہ کیا ہے "گردن ڈالے ہیں" جبکہ دیگر تراجم میں "کوئی نہیں" کسی عربی لفظ کا ترجمہ نہیں۔ ان کے نزدیک تو جو عربی لفظ مذکور ہیں ان کے بغیر ترجمہ میں کوئی لفظ آجائے تو قرآن پاک کی معاذ اللہ تحریف لازم آتی ہے۔ کیا وہ اپنے بزرگوں کو بھی محرف کہنا پسند کریں گے یا کہ دوسروں کو ہی اپنے فتوؤں کا لٹا نہ بتایا جاتا ہے۔ پھر مستسلمون کا ترجمہ اپنے آپ کو کپڑے داتے ہیں یا آپ کو کپڑے داتے کس لخت کا ترجمہ ہے؟ اور فرماں بردار ترجمہ کرنا بھی مقصد کے خلاف ہے۔

آئیے اعلیٰ حضرت کے ترجمہ کو تفاسیر کی روشنی میں انصاف کی نظر سے دیکھیں تو بلاشبہ اس کی افادیت کا انکار نہیں ہو سکے گا۔ مدارک میں ہے :-

مُسْتَسْلِمونَ مُنْقَادونَ اَوَاسِلٌ بَعْضُهُمْ بَعْضًا

وَحَزْلُهُ عَنْ عِزِّ فَاكِهِمْ مُسْتَسْلِمونَ مُنْقَادونَ

یعنی وہ گردن ڈالے سر جھکائے ہوں گے ایک دوسرے سے بھی ندامت اٹھائے ہوں گے۔ سب اپنے عجز کی وجہ سے رُسا ہوئیں گے۔ تمام کے تمام سر جھکائے ہوں گے۔ کوئی کسی کی امداد نہیں کر سکے گا۔

جلالین میں ہے : مُنْقَادونَ اِذْلاؤُ ذُلَّتْ سَے گردن ڈالے ہوں گے۔

خطیب میں ہے : مُنْقَادونَ اِذْلاؤُ لَمْ يَحِثُّ لَهُمْ فِي ذِفْعَتِهِ الْمَضَارِ

ذُلَّتْ سَے گردن ڈالے ہوں گے اس عذاب سے بچنے کے لیے کوئی حیلہ نہیں ہوگا۔

روح المعانی میں ہے: مستسلمون منقادون لعجزهم
وانداد الحیل علیہم واصل الامم تسلیم طلب السلام
والانقیاد لازم لذلك عرفا فلذا استعمال فيه وہ اپنے عجز اور کوئی حیلہ نہ چلنے کی وجہ
سے گردن ڈالے ہوں گے۔

اصل میں استسلام کا مطلب سلامتی کی طلب ہے۔ اور سر جھکانا، گردن ڈالنا یا
اطاعت کرنا اسی کے عرف میں لازمی معانی ہیں۔ اسی وجہ سے اس میں استعمال ہے۔
تفسیر کبیر میں ہے: يقال استسلم للشيء اذا انقاد له وخضع ومعهناه
في الاصل طلب السلامة بترك النادرة والمقصود انهم صاروا
منقادين لاهيولتهم في دفع تلك المضار لا العابد والمعبود۔
استسلم للشيء کہا جاتا ہے جب کہ کوئی اس کے سامنے سر جھکائے اور عاجزی
کرے۔ اصل میں اس کا معنی جھگڑا کو چھوڑنا اور مسالمت طلب کرنا۔ اور مقصود یہ ہے
گردن ڈالے ہوں گے۔ عابد اور معبود میں سے کسی کو بھی اس عذاب کے مندرجہ کئے
میں جیلہ کرنے کی طاقت نہیں ہوگی۔

تفاسیر کی عبارات دیکھنے کے بعد اعلیٰ حضرت کے ترجمہ پر نظر ڈالیں تو یقیناً
عظیم الشان ترجمہ نظر آئے گا۔ اور مودودی صاحب کا ترجمہ مقصد سے بہت ہی
دور ہے۔

فَاِخْرَاجُهُمْ ضَرْبًا بِالْيَمِينِ (پ ۲۱)

- پھر ان پر قوت کے ساتھ جا پڑے اور مارنے لگے (عبدالماجد دریا آبادی)
- پھر ان کو دباہنے ہاتھ سے مارنا (اور توڑنا) شروع کر دیا (فتح محمد)۔
- پھر گھسا ان پر مارتا دباہنے ہاتھ سے (شاہ عبدالقادر)۔
- پھر گھسا ان پر مارتا ہوا دباہنے ہاتھ سے (محمود الحسن)۔
- پھر ان پر قوت کے ساتھ جا پڑے اور مارنے لگے۔ (مولانا اشرف علی)

- اس کے بعد وہ ان پر نل پڑا اور سیدھے ہاتھ سے خوب ضربیں لگائیں (مودودی)
- تو لوگوں کی نظر بچا کر انہیں دباہنے ہاتھ سے مارنے لگا (اعلیٰ حضرت)۔
- حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بتوں کو توڑنے کا ذکر ہے۔ آپ نے اپنی قوم
کی نظر بچا کر بتوں کو توڑ دیا۔ اعلیٰ حضرت نے فرائض علیہم کا ترجمہ کیا ہے "لوگوں کی نظر
بچا کر" جب کہ دیگر مترجمین نے "پھر گھسا ان پر" یا "پھر ان پر قوت سے جا پڑے"
اور "ان پر نل پڑا" ترجمہ کیا ہے۔ اعلیٰ حضرت کے ترجمہ کو تفاسیر کی نایبہ حاصل ہے۔
مدارک کا حوالہ ذکر کر رہا ہوں ملاحظہ ہو۔ فاقبل علیہم ضرباً فاقبل
علیہم مستخفياً کأنہ قال فضر بهم ضرباً لا منہ سماخ
علیہم۔ آپ ان کی طرف مخفی طور پر متوجہ ہوئے، گویا کہ یہ کہا گیا ہے
ان کی نظر بچا کر (قوم کی) ان کو مارا۔

تفسیر کبیر میں ہے: فرائض الی الہتم یقلل داغ الیہ اذا مال الیہ فی السور
علی سبیل الخفیۃ ومنہ دوغان الثعلب خیال رہے کہ تفسیر کبیر یہ عبارت اس
لیے پیش کی جا رہی ہے کہ دونوں جگہ لفظ رائغ استعمال ہے جو دونوں مقاموں پر
ایک ہی معنی میں استعمال ہے۔ آپ فرماتے ہیں کہ رائغ الیہ کہا جاتا ہے جب وہ
کسی چیز کی طرف پوشیدہ مخفی طور پر مال ہو۔ اسی معنی میں دوغان الثعلب بھی
ہے "لومڑی کا آہستہ طور پر مخفی ہو جانا" کبیر میں ہی ہے: فرائض علیہم ضرباً
فاقبل علیہم مستخفياً۔ ان کی طرف مخفی طور پر متوجہ ہوئے۔

واضح ہوا کہ اعلیٰ حضرت کا ترجمہ تفاسیر کے مطابق ہے مقصود بھی یہی ہے کہ
حضرت ابراہیم علیہ السلام نے لوگوں کی نظر بچا کر بتوں کو مارا۔ اعلیٰ حضرت کا ترجمہ
بھی یہی ہے جو مقصود پر دال ہے۔ اعلیٰ حضرت کے ترجمہ کی فوقیت ظاہر ہر باہر
ہو گئی۔

فَلَمَّا بَلَغَ مَعَهُ السَّعْيُ قَالَ يُبْنِيَ لِيْ اَرَى فِي الْمَنَامِ الْاٰيَةَ

(پیش)

• پھر جب پہنچا اس کے ساتھ دوڑنے کو کہا اے بیٹے میں دیکھتا ہوں خواب میں تجھے کو ذبح کرتا ہوں پھر دیکھ تو، تو کیا دیکھتا ہے۔ شاہ عبدالقادر • سو جب وہ لڑکا ایسی عمر کو پہنچا ابراہیم کے ساتھ چلنے پھرنے لگا تو ابراہیم نے فرمایا کہ بر خور دار میں خواب میں دیکھتا ہوں کہ میں تم کو ذبح کر رہا ہوں، سو تم بھی سوچ لو تمہاری کیا رائے ہے۔ (مولانا اشرف علی)۔

• پس جب پہنچا اس کے ساتھ دوڑنے کو کہا اے بیٹے میں دیکھتا ہوں خواب میں تم کو ذبح کرتا ہوں پھر دیکھ تو تو کیا دیکھتا ہے (مولانا محمود الحسن) • جب وہ ان کے ساتھ دوڑنے کی عمر کو پہنچا۔ (فتح محمد) • پس جس وقت پہنچا دوڑنے کو کہا اے چھوٹے بیٹے میرے تحقیق میں دیکھتا ہوں سچ خواب کے تحقیق میں ذبح کرتا ہوں تجھ کو پس دیکھ کیا دیکھتا ہے تو (شاہ ریح الدین)۔

• پھر جب وہ اس کے ساتھ کام کے قابل ہو گیا کہ اے میرے بیٹے! میں نے خواب دیکھا میں تجھے ذبح کرتا ہوں۔ اب تو دیکھ تیری کیا رائے ہے؟ (اعلیٰ حضرت)

یہاں حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ذکر کیا جا رہا ہے جب کہ آپ نے خواب میں اپنے بیٹے کو ذبح کرتے ہوئے دیکھا تو بیٹے سے مشورہ کیا کہ اس معاملہ میں تمہاری رائے کیا ہے۔ آپ نے خواب آٹھ ذراچ کو دیکھا اور دس ذراچ کو ذبح پر عمل کر دیا۔

اب تراجم میں فرق دیکھیں۔ اعلیٰ حضرت نے ”سعٰی“ کا معنی کام کرنے کے قابل کیا ہے۔ باقی حضرات نے دوڑنا یا چلنا پھرنا کیا ہے۔ تفسیر کے حوالے سے

پہلے یہ بات ذہن نشین کر لیں کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے خواب میں ایک دن دیکھا اسی دن تردد میں رہے کہ کیا واقعی اس پر عمل کرنا ہے۔ دوسرے دن یقین آنے پر تیسرے دن اس پر عمل کیا۔ اور حضرت اسماعیل علیہ السلام کے ذبح کا واقعہ جب درپیش آیا تو آپ کی عمر اس وقت تیرہ سال تھی۔ مقصد یہ ہے کہ جب خواب دیکھی تو اسی وقت ذبح کا واقعہ درپیش آیا۔ یہ نہیں کہ خواب پانچ چھ سال پہلے دیکھی ہو اور عمل بعد میں کیا ہو۔

اب اس بات کے سمجھنے کے بعد یہ واضح ہوا کہ یہ خواب والا معاملہ اس وقت درپیش آیا جب کہ حضرت اسماعیل علیہ السلام کی عمر تیرہ سال تھی اور تیرہ سال کا لڑکا باپ کے ساتھ کام کرنے کے قابل ہوتا ہے۔ اس کا ہاتھ بٹاتا ہے۔ اگر معنی چلنے پھرنے والا کیا جائے تو تین سال میں بھی اس پر عمل کرنا ممکن ہے کیونکہ تین سال میں عمر میں لڑکا اچھی طرح چل پھر سکتا ہے اور اگر دوڑنے والا معنی کیا جائے تو پانچ سال کی عمر میں بھی اس پر عمل ہو سکتا ہے کیونکہ پانچ سال کی عمر میں لڑکا اچھی طرح دوڑ سکتا ہے۔ اگر معنی کام کے کیا جائے قابل تو اسی وقت تیرہ سال کی عمر درست ہو سکتی ہے کیونکہ کام کے قابل اس عمر میں ممکن ہے اس سے پہلے صحیح طور پر نہیں ہو سکتا۔ اب اس پر تفسیر کی عبارات پیش کرتا ہوں تاکہ بیان کردہ مضمون کی توثیق ہو سکے :-

فَلَمَّا بَلَغَ مَعَهُ السَّعْيُ بَلَغَ اَنْ يَّسْعِيَ مَعَ اَبِيْهِ فِيْ اَشْغَالِهِ وَحَاجَتِهِ

وَكَانَ اِذَا ذَاكَ ابْنُ ثَلَاثِ عَشْرَةَ سَنَةً (المختصر من المدارك) یہ جب وہ اپنے باپ کے ساتھ ان کے کاموں اور حاجتوں میں کام کرنے کے قابل ہوتے۔ یہ اس وقت ہوا جبکہ آپ کی عمر تیرہ سال تھی۔ فلما بلغ معه السعي (جلالین) جب وہ آپ کے ساتھ

کوشش کرنے لگے اور ان کی امداد کرنے لگے یعنی ان کے ساتھ کام کرنے کے قابل ہوئے۔ فلما بلغ معه السعي الذي يسعي مع ابيه في اموره واسبابه معيناً

علیٰ اعمالہ (جمل) یعنی جب وہ امور دنیا اور محاملات میں اپنے باپ کے ساتھ کام کرنے کے قابل ہوئے۔

تراجم میں دوسرا فرق یہ ہے کہ ماذاتری کا علیٰ حضرت نے ترجمہ کیا ہے "تیری کیا رائے ہے؟" جبکہ دوسرے بعض حضرات نے ترجمہ کیا ہے "تو کیا دیکھتا ہے؟" مفسرین کرام نے دیکھنے والے معنی کو رد کیا ہے اور رائے والے معنی کو پسند کیا ہے۔ مدارک میں ہے: ماذاتری الراہی علی وجہ المشاوسۃ لامن رؤیت

العین ولم یشاوسہ لیرجع الی رأیہ ومشورۃ ولكن لیعمل۔ ایجنع ام یحسب مشورہ کے طور پر ان سے رائے لی کہ تمھاری کیا رائے ہے؟ تری کو الراہی سے لیا ہوا ہے رویت العین سے نہیں یعنی دیکھنے والا معنی نہیں کہ تم کیا دیکھتے ہو بلکہ معنی یہ ہے کہ تمھاری رائے کیا ہے؟ باقی آپ کا رائے لینا اس وجہ سے نہیں تھا کہ ان کے مشورہ اور رائے پر عمل کریں گے بلکہ مشورہ اس لیے تھا تاکہ آپ کا صبر یا بے صبری ظاہر ہو جائے۔ جلالین میں ہے: ماذاتری من الراہی

مشاورہ لیا نفس بالذبح وینقاد لاسرب۔ یعنی تری ماخوذ ہے الراہی سے آپ نے مشورہ کیا حضرت اسماعیل علیہ السلام سے تاکہ ان کو ذبح سے انس ہو جائے اور اُمر کو ماننے کے لیے مطیع ہو جائیں کیونکہ اس پر عمل تو ضروری تھا اس لیے کہ امر متی تھا کیونکہ وحی خفی سے ثابت تھا۔ روح المعانی میں ہے: ماذاتری من الراہی وانما مشاورہ فی ذلک وهو حتم لیعلم ما عندہ۔ یعنی ماذاتری

میں تری کو راہی سے لیا ہوا ہے۔ اس کا مطلب ہو کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے حضرت اسماعیل علیہ السلام سے رائے لی کہ تمھاری رائے کیا ہے اور آپ نے ان سے مشورہ صرف اس لیے لیا کہ ان کی رائے بھی ظاہر ہو جائے ورنہ آپ نے اس کام کو ضروری کرنا تھا۔

تفاسیر کی مذکورہ بالا عبارات سے ظاہر ہوا کہ اسٹی اور اسی طرح ماذاتری کا جو ترجمہ علیٰ حضرت نے کیا ہے اس کو تفاسیر کی تائید حاصل ہے اور مقصد بیان کے مطابق

ہونے کی وجہ سے اس کو ایک خاص اہمیت حاصل ہے جس کی وجہ سے علیٰ حضرت کے ترجمہ کو حسن و خوبی حاصل ہونا ایک قدرتی امر ہے۔
عطر آں باشد کہ خود بوی نہ کہ عطار بگوید

وَتَلَّ لِلجَبَّيْنِ (پ ۳۳)

• اور بچھاڑ اس کو ماتھے کے بل (مولانا محمود الحسن)۔

• ابراہیم نے بیٹے کو ماتھے کے بل گرادیا (مودودی)۔

• اور باپ نے بیٹے کو ماتھے کے بل لٹایا (اعلیٰ حضرت)۔

جب کہ اس سے پہلے قُلْنَا اَسْلَمْنَا اچھا ہے جس کا معنی ہے دونوں باپ اور بیٹے نے اللہ کے حکم کے سامنے گردن جھکا لی دونوں فرماں بردار ہو گئے تو باپ نے بیٹے کو ماتھے کے بل لٹایا مطلب یہ ہے کہ جب دونوں باپ اور بیٹا اللہ تعالیٰ کے حکم کو مانتے ہوئے اس کی فرمانبرداری میں اس کام کو مکمل کرنے لگے تو پھر گرانا یا بچھاڑنا کیسے؟ اس لیے کہ عرفی معنی بچھاڑنا یا گرانا کا یہ ہوتا ہے کہ کسی کو زبردستی گرادیا جائے لیکن کسی کے فرمانبردار ہوتے ہوئے اس کو زمین پر لٹانا ہی ہوتا ہے، بچھاڑنا یا گرانا مراد نہیں ہوتے۔ اس وجہ سے علیٰ حضرت نے لٹانا ترجمہ کیا ہے اور یہ معنی ہی حضرت اسماعیل علیہ السلام کی شان کے لائق ہے۔

اِذَا بَقِيَ إِلَى الْفُلِّ الْمَشْحُونِ (پ ۳۴)

• جب بھاگ کر پہنچا اس بھری کشتی پر (محمود الحسن)۔

• جس وقت بھاگ گیا طرف کشتی بھری ہوئی کے (شاہ رفیع الدین)۔

• جب بھاگ کر پہنچا اس بھری کشتی پر (شاہ عبدالقادر)۔

• جب کہ بھاگ کر کشتی کے پس پہنچے (مولانا اشرف علی)۔

• اور جب وہ ایک بھری کشتی کی طرف بھاگ نکلا۔ (مودودی)

• جب وہ بھاگ کر بھری ہوئی کشتی کے پاس پہنچے (عبدالماجد)۔

• جب کہ بھری کشتی کی طرف نکل گیا (علیٰ حضرت)۔

حضرت یونس علیہ السلام کا ذکر ہو رہا ہے۔ نبی کا بھاگ کر چلا جانا نبی کی شان کے لائق نہیں۔ اسی وجہ سے علیٰ حضرت نے یہ ترجمہ نہیں کیا کہ وہ بھاگ کر کشتی کی طرف چلے گئے۔ بلکہ آپ نے ترجمہ کیا ہے کہ وہ کشتی کی طرف نکل گئے، چلے گئے۔ یعنی گویا کہ علیٰ حضرت نے اُلق کا ترجمہ کیا ہے کہ وہ نکل گئے۔ باقی حضرات نے ترجمہ کیا ہے کہ وہ بھاگ گئے۔

حضرت یونس علیہ السلام کے جانے کا پہلے ذکر ہو چکا ہے۔ فظن ان بن نقد و علیہ کے ماتحت تفسیر کبیر کے حوالہ سے بحث گزر چکی ہے کہ آپ کے جانے میں آپ خطا کار نہیں تھے کیونکہ آپ نے اجتہاد سے کام لیا۔ آپ نے یہ خیال کیا کہ شاید مجھے جانے اور بنے میں ایک جیسا اختیار حاصل ہے۔ آپ رب تعالیٰ سے حکم طلب کرنے کے بغیر اور حکم کے آنے کے انتظار کے بغیر چلے گئے۔

اس مقام پر لوگوں نے حضرت یونس علیہ السلام کے بھاگنے والا معنی لے کر کچھ وجہ بیان کی تھیں لیکن صاحب کبیر نے اس کو رد کیا۔ بعض حضرات نے آپ کے بھاگنے کو اس سے تعبیر کیا کہ آپ اپنے میت، مالک یعنی اللہ تعالیٰ سے بھاگے۔ لیکن علامہ رازی نے فرمایا کہ یہ بعید بات ہے کہ اللہ کا نبی اللہ ہی سے دور بھاگے اور اس کی مخالفت کرے بعضوں نے کہا تھا کہ آپ کے بھاگنے کی وجہ یہ ہے کہ آپ کو حکم دیا گیا تھا کہ تم بنی اسرائیل کی طرف جاؤ لیکن آپ نے اس حکم کو نہ مانا، اس لیے آپ اللہ تعالیٰ کے غضب و غضب سے ڈر کر بھاگے۔

علامہ رازی نے اس کو بھی رد فرما دیا اور کہا کہ یہ بھی بعید ہے۔ اللہ کا نبی ایسا نہیں کر سکتا۔ بعض نے کہا تھا کہ آپ کے بھاگنے کا مطلب یہ ہے کہ آپ نے اپنی قوم کو تبلیغ کرنی چھوڑ دی تھی لہذا اس کو بھاگنے سے تعبیر کیا گیا ہے۔ لیکن اس کو بھی رد کیا گیا ہے اور کہا گیا ہے کہ جب انبیاء کے کرام کو بھیجا ہی

اسی مقصد کے لیے جاتا ہے تو ان کا تبلیغ کو چھوڑنا ممکن نہیں۔

اب مقصد یہی ثابت ہوا کہ آپ اپنے اجتہاد کی وجہ سے وہاں سے کشتی کی جانب نکل گئے تاکہ یہاں سے نکل سکیں۔ یہ معنی ہی اللہ کے نبی کے منصب کے مطابق ہے کہ آپ بھاگے نہیں، دُورے نہیں، اللہ کے حکم کو عمداً چھوڑا نہیں۔ ایسی باتیں اللہ کے نبی کی شان کے مناسب نہیں۔ اسی وجہ سے اعلیٰ حضرت کے ترجمہ کو فوقیت حاصل ہے کہ آپ نے نبی کی شان کے لحاظ سے ترجمہ کیا جب کہ باقی حضرات اس مقام کی گہرائیوں کو نہ پاسکے۔

وَ اٰكْبَتْنَا عَلَيْهِ شَجَرَةً مِّنْ يَّفْقِطِيْنَ (پ ۳۹)

• اور ہم نے ان پر ایک بیل دار درخت بھی لگا دیا (عبدالماجد دریا آبادی)۔
• اور اگایا ہم نے اس پر ایک درخت بیل کا (شاہ عبدالقادر)۔
• اور ہم نے ان پر ایک بیلدار درخت بھی اگایا تھا (مولانا اشرف علی)۔
• اور اس پر ایک بیلدار درخت اگادیا (مورودی)۔
• اور ہم نے اس پر کدو کا پٹر اگادیا (اعلیٰ حضرت)۔

حضرت یونس علیہ السلام جب مچھلی کے پیٹ سے باہر تشریف لائے تو آپ کا جسم نرم اور نحیف ہو گیا تھا۔ آپ پر سایہ کے لیے اللہ تعالیٰ نے ان پر کدو کا درخت اگایا جو آپ پر سایہ کرتا تھا۔ اگرچہ کدو کی بیل ہوتی ہے لیکن اللہ تعالیٰ کی قدرت اور آپ کے اعجاز کے سبب کدو کو ایک درخت کی حیثیت حاصل ہو گئی۔ اعلیٰ حضرت نے یفقطین کا ترجمہ کدو کا پٹر کیا ہے اگرچہ یفقطین کا معنی صرف

بیل ہے جیسا کہ فرج المعانی میں ہے کل شجرة لاساق لها فہو یفقطین۔ یعنی بیل جس میں تنہا نہیں اس کو یفقطین کہتے ہیں لیکن اس بیل سے مراد کدو ہی ہے۔ اس لیے علیٰ حضرت کے ترجمہ میں وضاحت کی گئی ہے کہ بیل سے مراد کدو کی بیل ہے اور وہ بھی اس وقت فقط بیل نہیں تھی بلکہ ایک درخت تھا۔

اب روح المعانی سے عبارت پیش کر رہا ہوں جس سے پتا چلتا ہے کہ وہ کدو کا درخت مُراد ہے یعنی قدرت الہی سے اسے درخت بنا دیا گیا تھا:

والمراد به على ما جاء عن الحسن البسيط وابن عباس في رواية
وابن مسعود والي هريرة وعمر بن ميمون وقتادة وعكرمة
وابن جبير ومجاهد في إحدى الروايتين عنهما الدباء وهو الغرم
المعروف وكانت النبي صلى الله عليه وسلم يحبها واستبها الله تعالى
مظلة عليه لأنها تجمع حصا لا برد الظل والملمس وعظم الورق
وان الدباب لا يقع عليها ما قيل وكان عليه السلام لرقعة جلده بمكة
في بطن العوت يوذىب الدباب ومما سته ما فيه خشونة ويؤلم
حوال الشمس ويستطيب بارح الظل فلفظ الله تعالى به بذلك
وذكر ان ورق الغرم اخضر شئ لمن يسلمه جلده واشتهر ان
الشجر ما كان على ساق من عود فيشكل تفسير الشجرة هنا بالدباء واجاب
ابو حيان بانه يحتمل ان الله تعالى انبت بها على ساق
لتظل غرق العادة - يعني اس جگہ لفظین سے مراد ان تمام
حضرات کے نزدیک جن کے اسمائے گرامی عربی عبارت میں موجود ہیں (دیا ہے
دباء سے مراد مشہور و معروف ہے وہ کدو ہے جس کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پسند
فرماتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت یونس علیہ السلام پر اس کو اس لیے اُگایا تاکہ
آپ پر سایہ کرے اور آپ کو ٹھنڈک پہنچائے اور آپ کو آتش کے پتے شمس کریں اور
اس کے بڑے پتے آپ پر رہیں تاکہ آپ پر ٹھنڈکیاں نہ بیٹھ سکیں کیونکہ بیان کیا جاتا ہے
کہ کدو کے پتوں پر ٹھنڈکیاں نہیں بیٹھتیں۔ حضرت یونس علیہ السلام کا مچھلی کے پیٹ
میں رہنے کی وجہ سے چڑا نرم ہو گیا تھا۔ آپ کے لیے ٹھنڈکیاں باعث تکلیف بن
سکتی تھیں اور سخت چیر کا مس کرنا اور سورج کی گرمی آپ کے لیے تکلیف کا باعث
بن سکتی۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے اپنی مہربانی سے آپ کو اس کے سایہ سے آرام

پہنچایا اور بیان کیا جاتا ہے کہ کدو کے پتے اترے ہوئے چمڑے کے لیے بھی مفید ہوتے
ہیں۔ تو گویا آپ کے لیے بھی مفید تھے۔

اب اس پر یہ اعتراض ہوتا ہے کہ شجرۃ اور لفظین دونوں کو جمع کیا گیا ہے اور مُراد
کدو لیا ہے حالانکہ کدو کو شجرہ نہیں کہا جاسکتا۔ اس لیے کہ شجرۃ تو اس درخت کو
کہتے ہیں جس میں لکڑی کا تنہا ہو حالانکہ کدو کی بیل میں لکڑی کا تنہا نہیں ہوتا۔ اس کا
جواب ابو حیان نے یہ دیا کہ اس میں یہ احتمال ہے کہ اللہ تعالیٰ نے خلافِ عادت
کدو کی بیل کو تنے والا درخت بنا دیا ہوتا کہ سایہ کرے۔ اس مقام پر یہ واضح ہوا کہ
مراد کدو کا درخت ہی ہے اور یہی قول مفید ہے اور وہ بھی فقط بیل نہیں رہی تھی
بلکہ اس کو تنے والا بنا دیا تھا۔

مدارک میں ہے: قيل لرسول الله صلى الله عليه وسلم انك
لغيب الغرم قال اجل هي شجرة اخي يونس نبی کریم سے عرض کیا گیا کہ آپ کدو
کو پسند کرتے ہیں؟ آپ نے فرمایا ہاں! اس لیے کہ یہ میرے بھائی یونس کا درخت
ہے۔

اعلیٰ حضرت کے ترجمہ سے مفصلاً زیادہ ظاہر ہے۔

لَئِنْ أَشْرَكَتَ لِيَحْبَطَنَّ عَمَلُكَ وَلَتَكُونَنَّ مِنَ الْخَاسِرِينَ (پہ ۲۲)

• کہ اگر تو نے شریک مان لیا تو اکارت جائیں گے تیرے عمل اور تو ہوگا ٹوٹے
میں ٹرا (محمود الحسن)۔

• اگر تو نے شریک مانا، اکارت جاویں گے تیرے کئے اور تو ہوگا ٹوٹے
میں آیا (شاہ عبدالقادر)

• اگر تم نے شریک کیا تو تمہارے عمل برباد ہو جائیں گے۔ (فتح محمد)

• اگر شریک لاؤ گے تو الیستہ ناپید ہو جاویں گے عمل تیرے (شامی الدین)

• کہ اے مسننے والے! اگر تو نے اللہ کا شریک کیا تو ضرور تیرا سب کیا دھرا

اکارت جائے گا اور ضرورتاً بار میں رہے گا (۱) علیٰ حضرت
 اس مقام پر اعلیٰ حضرت نے "اے سننے والے" الفاظ زیادہ کہے ہیں جب کہ دوسرے
 مترجمین نے ایسے الفاظ کی زیادتی نہیں کی۔ حالانکہ زیادتی ضروری تھی کیونکہ بظاہر مطلقاً
 یہ خطاب نبی کریم کو نظر آتا ہے اور نبی کریم سے شرک کا سرزد ہونا ممکن نہیں جب نبی
 کریم صغائر و کبار سے پاک ہیں تو شرک جیسا جرم عظیم سرزد ہونا محال ہے۔ اور
 مولوی فتح محمد کے ترجمہ میں شرک کی نسبت جمیع انبیائے کرام کی طرف کی گئی ہے لہٰذا
 یہ بھی درست نہیں۔ اسی وجہ سے اعلیٰ حضرت نے ترجمہ میں یہ واضح کر دیا کہ یہ خطاب
 نبی کریم کو نہیں بلکہ آپ کی امت کو ہے اگرچہ بظاہر خطاب نبی کریم کو بھی ہو پھر بھی
 مراد آپ کی امت ہے۔ اور اگر خطاب نبی کریم کو مانا جائے اور مراد بھی آپ ہی لیے
 جاتی ہیں تو بالفرض کے الفاظ نہ آئیں اور اے سننے والے" الفاظ بھی نہ آئیں تو کیسے
 نبی کریم کی طرف اس خطاب کو منسوب کرنا صحیح ہو سکتا ہے۔ اسی وجہ سے مفسرین
 کرام نے مذکورہ توضیحات کو بیان کیا ہے اور اعلیٰ حضرت کا ترجمہ بھی ان کے مطابق
 ہے۔ جلالین میں ہے :-

لئن اشركت يا محمد فرضاً

اس پر صاوی میں اس طرح ہے :-

فرضاً ای علی سبیل التقدير وفرضاً المحال
 وهو جواب عن سوال مقدر - كيف يقع الشرك من
 الانبياء مع عصمتهم وقيل المقصود بالخطاب

اممهم لعصمتهم من ذلك

یعنی اے نبی کریم اگر بالفرض محال آپ شریک ٹھہرائیں۔ صاوی نے بیان کیا
 کہ علی سبیل الفرض کیوں کہا ہے؟ اس لیے کہ ایک سوال کا جواب دینا مقصود ہے
 سوال یہ ہے کہ انبیائے کرام سے شرک کیسے واقع ہو سکتا ہے حالانکہ وہ معصوم
 ہوتے ہیں؟ تو اس کا ایک جواب علی سبیل الفرض سے دیا کہ یہ کلام بالفرض پر مبنی

ہے۔ دوسرا جواب اس کا یہ دیا کہ مقصود اس قسم کے خطاب سے انبیائے کرام نہیں
 ہوتے بلکہ ان کی امتیں ہوتی ہیں کیونکہ انبیائے کرام تو معصوم ہوتے ہیں۔ مدارک میں ہے :-
 وانما مع هذا الكلام مع علمه تعالى بان رسوله لا يشركون لان الخطاب
 للمبعي صلى الله عليه وسلم والمراد به غيره ولا منه على سبيل
 الفرض والمحال يصح فرضها -

یعنی یہ کلام صحیح ہے باوجود اس کے کہ اللہ تعالیٰ کو معلوم ہے کہ اس کے
 رسول شرک نہیں کرتے۔ اس لیے کہ یہ خطاب بظاہر نبی کریم کو ہے لیکن حقیقتاً آپ کی
 امت کو ہے۔ اور یا کلام علی سبیل الفرض ہے اور محالات کو فرض کرنا صحیح ہوتا ہے
 تفسیر مدارک میں اس طرح ہے :- کیف مع هذا الكلام مع علم الله تعالى
 انه رسوله لا يشركون ولا تحبط اعمالهم والجواب ان قول
 لئن اشركت ليحبطن عملك قضية شرطية والقضية الشرطية
 لا يلزم من صدقها صدق جزئياتها الا ترى ان قول
 لو كانت الخمسة زوجا لكانت منقسمة بمساويين قضية
 صادقة مع ان كل واحد من جزائرها غير صادق قال الله تعالى
 لو كانت فيهما الامة لفسدتا ولم يلزم من
 هذا صدق القول بان فيهما الامة وبانهما
 قد فسدتا -

یعنی یہاں سوال یہ ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی یہ کلام کس طرح صحیح ہے جبکہ
 اسے معلوم ہے کہ اس کے رسول نہ شرک کرتے ہیں اور نہ ہی ان کے اعمال ضائع ہوتے
 ہیں؟ اس کا جواب یہ دیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی لئن اشركت
 ليحبطن عملك قضية شرطية ہے اور قضیہ شرطیہ کے سچا ہونے کے لیے یہ
 ضروری نہیں کہ اس کی جزاء میں بھی سچی ہوں۔ کیا تم دیکھتے نہیں کہ تمہارا قول لو كانت
 الخمسة زوجا لكانت منقسمة بمساويين (اگر پانچ بھتی ہوئے

تو برابر برابر کی طرف منقسم ہوں گے) یہ قضیہ سچا ہے حالانکہ اس کی جزائیں سچی نہیں۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی لو کان فیہما الہمتہ الا ستہ لفسدتا قضیہ شرطیہ ہے اور سچا ہے لیکن اس کے سچا ہونے سے یہ لازم نہیں ہوتا کہ زمین و آسمان میں متعدد خدا واقع بھی ہوئے ہوں اور فساد لازم آیا بھی ہو یعنی نہ خدا متعدد ہوئے اور نہ فساد لازم آیا۔ اسی طرح یہ کلام بھی بالفرض پر مبنی ہے نہ شرک ہوا اور عمل کا ضیاع لازم آیا۔ یہ بات بخوبی واضح ہوئی۔ قرآن پاک میں خطاب نبی کریم کو بلا واسطہ ہے۔ امت کو بلا واسطہ یا خطاب امت کو ہوگا بلا واسطہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے۔ اور یا خطاب خود نبی کریم کو ہوگا جب تک کسی قید کا اضافہ نہ کیا جائے ظاہر ہی سمجھا جائے گا کہ خطاب نبی کریم کو ہے اور شاید نبی سے بھی شرک سرزد ہو سکتا ہے اور عمل ضائع ہو سکتے ہیں۔

عام ذہن رکھنے والے لوگ جو علمی مقام نہیں رکھتے، تفاسیر کو سمجھنے کی اہلیت نہیں ہوتی وہ اسی قسم کے تراجم کو دیکھ کر ایسی آیات کا سہارا لے کر خود تو بھٹک جاتے ہیں لیکن غیروں کو بھی بھٹکاتے رہتے ہیں اور یہی اردو تراجم کو دیکھ کر جہل مرکب کے مصداق علمیّت کے دعوے دار، علمائے کرام کے لیے بھی دردِ سر بن رہتے ہیں۔

لیکن بفضلہ تعالیٰ اعلیٰ حضرت کے ترجمہ کو دیکھ کر کسی شخص کو اس قسم کا وہم نہیں ہوتا۔ وہ راہِ راست سے بھٹکتا نہیں۔ اس سے بڑھ کر اور ترجمہ کی خوبی کیا ہو سکتی ہے!

وَجِئْنَا بِالنَّبِيِّينَ وَالشُّهَدَاءِ وَقُضِيَ بَيْنَهُم بِالْحَقِّ وَهُمْ لَا يُظْلَمُونَ (پہلے ۴۸)

• اور پیغمبر اور گواہ حاضر کئے جائیں گے اور سب میں ٹھیک ٹھیک فیصلہ کیا جائے گا اور ان پر ذرا بھی ظلم نہ ہوگا (عبدالماجد دریا آبادی)

• اور حاضر آئیں پیغمبر اور گواہ اور فیصلہ ہو ان میں انصاف سے اور ان پر ظلم نہ ہوگا۔ (مولانا محمود الحسن) (شاہ عبدالقادر)۔
• اور پیغمبر اور گواہ حاضر کئے جائیں گے اور سب میں ٹھیک ٹھیک فیصلہ کیا جائے گا اور ان پر ذرا بھی ظلم نہ ہوگا (اشرف علی)۔
• انبیاء اور تمام گواہ حاضر کر دیے جائیں گے لوگوں کے درمیان ٹھیک ٹھیک حق کے ساتھ فیصلہ کر دیا جائے گا ان پر کوئی ظلم نہ ہوگا (مودودی)۔
• اور لائے جائیں گے انبیاء اور یہ نبی اور اس کی امت ان پر گواہ ہوں گے۔ اور لوگوں میں سچا فیصلہ فرما دیا جائے گا اور ان پر ظلم نہ ہوگا (اعلیٰ حضرت)۔
اس مقام پر اعلیٰ حضرت کے ترجمہ میں یہ وضاحت کہ انبیائے کرام پر گواہی دے والے ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آپ کی امت ہوگی۔ اسی طرح اعلیٰ حضرت کے ترجمہ میں یہ وضاحت پائی جاتی ہے کہ وہ فیصلہ لوگوں میں ہوگا یعنی انبیائے کرام کی امتوں میں ہوگا، لیکن صرف اتنا کہنے سے کہ ان میں انصاف ہوگا بات واضح نہیں ہوتی کہ فیصلہ کن میں ہوگا۔

اعلیٰ حضرت کے ترجمہ میں جو وضاحت پائی گئی اس کی تائید میں جلالین کی عبارت ملاحظہ ہو: وجئنا بالنبيين والشهداء اي بمحمد صلى الله عليه وسلم وامت يشهدون المرسل بالبلاغ - يعني انبيائے کرام کی تبلیغ فرمانے پر کہ اے اللہ انبیائے کرام نے میرے پیغام اپنی اپنی امتوں تک پہنچا دیئے تھے (نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی امت گواہی دیں گے۔ اسی کو حاشیہ میں تفصیل سے بیان کیا گیا ہے :- وجئنا بالنبيين اي سيد عوا على اممهم انهم بلغوهم الرسلات وذاك لان الله يجمع الخلائق الاولين والآخرين في صعيد واحد ثم يقول كلفوا الامم المياتكم منذ يرثونكم ويقرولون ما جاءنا من بعد فليسأل الله الانبياء عن ذلك فيقولون كذبوا قد راسلناهم فيناهم البيوت وهو اعلم بهم اقامه

لِلْحُجَّةِ فَيَقُولُونَ اَمْتَهُ مُحَمَّدٌ نَشْهَدُ وَنَا فَيَقُولُ قِيَامَتُهُ مُحَمَّدٌ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَيَشْهَدُونَ
 اَمْتَهُمْ قَدْ بَلَغُوا فِتْنَتَهُ مِنَ اِيْنِ عِلْمِهِمْ وَانْعِمَانِ بَعْدَ نَافِيْسَالِ هَذِهِ
 الْاُمَّةِ فَيَقُولُونَ اَرْسَلْتَ الْيَسَارَ سَوَلاً وَانْزَلْتَ عَلَيْنَا كِتَاباً وَاخْبَرْتَنَا نَبِيّاً بِتَبْلِيغِ
 الرُّسُلِ وَانْتَ صَادِقٌ فَيَمَّا اخْبَرْتَ ثُمَّ يُوْتِي بِمُحَمَّدٍ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَيَقُولُ
 اللهُ عَزَّ وَجَلَّ فَيَكْفُرُ بِشَيْءٍ مِنْهُ (ج) انبيائے کرام کو دربار الہی میں اس لیے حاضر کیا جائیگا
 تاکہ وہ اپنی امتوں پر دعویٰ کریں کہ انھوں نے ان لوگوں کو احکام پہنچا دیے ہیں۔ یہ
 اس لیے کہ اللہ تعالیٰ تمام مخلوق لکھے اور پچھلے لوگوں کو ایک بلند جگہ پر جمع کرے گا
 اور کافروں کے گرد ہوں کو کھائے گا، کیا تمھارے پاس کوئی ڈرانے والے نہیں آئے
 تھے؟ اور وہ کہیں گے ہمارے پاس تو کوئی ڈرانے والا نہیں آیا، پھر اللہ تعالیٰ
 انبیائے کرام سے اس کے متعلق سوال کریگا۔ وہ کہیں گے اے اللہ! یہ لوگ جھوٹے
 ہیں۔ ہم نے تو ان کو تمام احکام پہنچا دیے تھے۔ پھر اللہ تعالیٰ انبیائے کرام
 سے گواہ پیش کرنے کا مطالبہ کرے گا حالانکہ اسے معلوم ہے کہ انبیائے کرام نے
 تو تبلیغ فرمادی لیکن اس مطالبہ سے کافروں پر حجت قائم کرنا مقصود ہوگا۔ پس
 انبیائے کرام نبی کریم کی امت کو بطور گواہ پیش کریں گے جو ان کے حق میں گواہی
 دے گی کہ اے اللہ! ان انبیائے کرام نے تو تبلیغ فرمادی تھی۔ تب وہ پہلی امتیں
 کہیں گی اے اللہ! ان کو کیا معلوم ہے۔ یہ لوگ تو ہمارے بعد آئے۔ تو اس وقت
 تو اللہ تعالیٰ نبی کریم کی امت سے پوچھے گا، تم نے کس طرح گواہی دی ہے؟ تو
 یہ لوگ عرض کریں گے اے اللہ! تو نے ہماری طرف رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو بھیجا
 اور ہماری طرف بواسطہ رسول اللہ کتاب کو نازل فرمایا اور اس کتاب میں تو نے
 ہمیں انبیائے کرام کی تبلیغ کی خبر دی کہ انبیائے کرام نے تبلیغ کی لیکن ان کی امتوں نے
 انکار کیا اور اے اللہ تیری خبر سچی ہے۔

پھر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو لایا جائے گا اور ان سے آپ کی امت کے
 متعلق سوال ہوگا تو آپ اپنی امت کی پاکیزگی کا ذکر فرمائیں گے اور امت کی سچائی

کی گواہی دیں گے۔

تو اس طرح کافروں کو جہنم میں بھیج دیا جائے گا۔ ان کو جہنم میں بھیجا ان سے انصاف
 ہوگا، ظلم نہیں ہوگا کیونکہ وہ اس کے اہل ہوں گے۔ اب واضح ہو کہ اللہ تعالیٰ نے
 اس آیت کریمہ میں جن گواہوں کا ذکر فرمایا ان سے مراد نبی کریم اور آپ کی امت ہے۔
 اس مقصد کو اعلیٰ حضرت کے فقہ حنفی میں واضح طور پر پیش کیا گیا ہے جبکہ
 دیگر تراجم وضاحت کرنے سے قاصر ہیں۔ آپ کے ترجمہ میں یہ خوبی کامل طور پر
 پائی جاتی ہے کہ مقصد کو واضح کیا جاتا ہے اور تفاسیر کے مطابق ہوتا ہے جس
 مقام پر مفسرین کرام مقصد کو سمجھانے کے لیے بعض الفاظ کو نکالتے ہیں۔ اعلیٰ
 حضرت کا ترجمہ اسی کے مطابق ہوتا ہے۔

ذِي الطَّوْلِ (پ ۶)

مقدور کا صاحب (شاہ عبدالقادر) • مقدّر والا (محمود الحسن)
 • قدرت والا (مولانا شرف علی) • قدرت والا (عبدالماجد ریابادی)
 • بڑے انعام والا (اعلیٰ حضرت)۔
 اللہ تعالیٰ نے اپنی صفات کا ذکر فرمایا، ان میں ایک یہ صفت بھی ہے۔
 اعلیٰ حضرت نے اس کا معنی کیا ہے ”بڑے انعام والا“۔ اعلیٰ حضرت کے ترجمہ پر تائید
 جلالین میں دیکھیں :-

ذِي الطَّوْلِ اِيْ الْاِنْعَامِ الْوَاسِعِ - يَعْنِيْ وَسِعَ الْاِنْعَامُ وَالْاِيْمَةُ الْاِنْعَامُ
 والا۔ حاشیہ میں ہے : ذِي الطَّوْلِ اَطْوَلَ بِالْفَتْحِ الْاِفْضَلُ يَقَالُ لِفُلَانٍ
 عَلَى فُلَانٍ طَوْلٌ اِيْ زِيَادَةٌ وَفَضْلٌ وَسَمِيَ الْغَنَى اَيْضاً طَوْلًا لِاَنَّهُ يَنَالُ
 بِهِ مِنَ الْمُرَوَّاتِ مَا لَا يَنَالُ عِنْدَ الْفَقْرِ (روح) وَفِي الصَّرَاحِ طَوْلٌ بِالْفَتْحِ
 مَنَّةٌ نِّهَاذٌ وَفَزْوَنٌ كَرْدٌ بَرَكْسِيٌّ وَغَالِبٌ آمَدٌ وَفَضْلٌ وَمَنَّةٌ فَالطَّوْلُ
 فِي الْمَغْنَةِ الزِّيَادَةُ وَالْفَضْلُ وَالظَّاهِرُ مِنْ امْتِنَانِهِ بِالْاِيْمَةِ

والانعام ویریدنا قال الشارح الانعام الواسع وفسر الامر وبيان
المراد ههنا الفضل بقوله العقاب المستحق يعني لفظ طول کے طا
پر زبر ہے اور اس کا معنی زیادتی فضیلت ہے جس طرح کہا جاتا ہے لندان
علیٰ فلاف طول - اس کا یہ معنی ہوتا ہے کہ فلاں کو فلاں پر برائی اور
فضیلت ہے۔ اسی وجہ سے غنی کو بھی ذو الطول کہا جاتا ہے کیونکہ جو مروت
اس سے حاصل ہو سکتی ہے وہ فقیر سے نہیں ہو سکتی۔ اور صراح میں ہے طول
ظاہر کی زبر کی صورت میں اس معنی میں آتا ہے، کسی پر احسان کرنا، کسی کا کسی پر
فضیلت حاصل کرنا، کسی کا کسی پر فضیلت میں غالب آنا۔ طول کا لغوی معنی
زیادتی اور فضیلت ہے۔ اللہ تعالیٰ کی طرف نسبت میں ظاہر یہی ہے کہ اس کا
معنی ثواب اور انعام عطا کرنا۔ اسی وجہ سے شارح نے بڑے انعام والا معنی کیا
ہے۔ اور حضرات نے یہ تفسیر بھی کی ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ
عذاب کے مستحقین سے عذاب کو ترک فرما کر ان پر اپنا فضل فرماتا ہے۔ کبیر میں ہے
ذی المول ای ذی التفصیل یقال طال علینا طولا ای
تفضل علینا تفضلا۔ یعنی ذو الطول کا معنی صاحب تفضل ہے کہا جاتا
ہے۔ طال علینا طولا اس کا معنی یہ ہے کہ اس کو ہم پر فضیلت حاصل ہے
اعلیٰ حضرت کا ترجمہ واضح ہے اور مقصد بھی یہی ہے۔

مَا لِلظَّالِمِينَ مِنْ حَمِيمٍ وَلَا شَفِيعٌ يُطَاعُ (پاکیزہ)

- کوئی نہیں گنہگاروں کا دوست اور نہ سفارش کرنے والی بات مانی جائے۔
- کوئی نہیں گنہگاروں کا دوست اور نہ کوئی سفارش (شامعہ القادر)
- اور ظالموں کا نہ کوئی دوست نہ کوئی سفارش جس کا کہا مانا جائے

(اعلیٰ حضرت)

اعلیٰ حضرت نے ظالمین کے ترجمہ میں بھی لفظ ظالموں کو ہی استعمال کیا ہے یعنی
ظالموں کا نہ کوئی دوست ہوگا نہ سفارش کیونکہ ظلم کا اطلاق شرک پر بھی ہے : ان
الشرك لظلم عظیم - بیشک شرک بہت بڑا ظلم ہے اور ترجمہ میں ظالم کو لانے
میں کوئی حرج نہیں کیونکہ ظالمین سے مراد مشرکین، کافرین ہیں۔ لیکن گنہگار کہنے
میں حرج ہے کہ شاید کسی گنہگار کا کوئی سفارشی، شفاعت کرنے والا نہیں ہوگا۔
حالانکہ یہ غلط ہے۔ پہلے دو مرتبہ مسئلہ شفاعت کو ذکر کیا جا چکا ہے اور اس
آیت کریمہ کی تفسیر میں بھی علامہ رازی رحمۃ اللہ علیہ نے ذکر فرمایا کہ گنہگاروں کے لیے
شفاعت کے منکر معتزلہ ہیں : احتج اکثر المعتزلۃ فی دفع الشفاعت
عن المذنبین بقوله تعالى ما للظالمين من حميم ولا شفيع
يطاع قالوا نفی حصول شفیع لهم بطاع فوجب ان لا يحصل لهم
هذا الشفیع - اجاب اصحابنا عنه من وجوه الاول انه تعالى نفی ان
يحصل لهم شفیع بطاع وهذا لا يدل علی نفی الشفیع الا ترى
انك اذا قلت ما عندی كتاب يباع فهذا يقتضي نفی كتاب
يباع ولا يقتضي نفی الكتاب یعنی اکثر معتزلہ نے اس آیت کریمہ ما للظالمين
من حميم ولا شفيع يطاع سے دلیل پکڑی ہے کہ گنہگاروں کے لیے شفا
نہیں ہے۔ اس لیے کہ جب ایسا شفع جس کی بات مانی جائے اس کی نفی ثابت ہوئی
تو اس سے پتا چلا کہ کوئی شفع نہیں ہوگا۔ اس کا جواب کئی وجہ سے دیا گیا ہے :
ایک یہ ہے کہ یہاں نفی اس شفع کی ہے جس کی بات کو مانا جائے۔ اس سے
مطلقا شفع کی نفی نہیں کیا تھی معلوم نہیں کہ اگر کوئی شخص یہ کہے کہ میرے پاس
کوئی کتاب نہیں جس کو بیچا جائے تو اس کلام سے کتاب کی نفی نہیں بلکہ کتاب کے
بیچنے کی نفی ہے۔

اس کا دوسرا جواب علامہ رازی نے اس طرح دیا ہے : ان المراد من
الظالمين ههنا الكفار والدليل عليه ان هذه الآية وسدت

فی نجر الکفار الذین یجادلون فی آیات اللہ فریب ان یکن من مختصا بهم وعذابنا انہ لا شفاعة
فی حق الکفار یعنی اس آیت میں ظالموں سے مراد کفار ہیں اور دلیل اس پر یہ ہے کہ یہ
آیت کفار کو جزو توحید کرنے کے لیے نازل ہوئی جن کفار کا ذکر اللہ تعالیٰ یجادلون
فی آیات اللہ (وہ جو اللہ کی آیات میں جھگڑا کرتے ہیں) میں ہے پس
واجب ہے کہ یہ آیت ان کے ساتھ ہی مختص ہے۔ ہمارے نزدیک یہ ہی ہے کہ شفاعت
کافروں کے لیے نہیں ہوگی۔

اس سے واضح ہوا کہ مطلقاً گناہ کرنے سے مقصد حاصل نہیں ہوتا، البتہ ظالم
کمنے سے مقصد حاصل ہے کیونکہ ظالم سے مراد خود اللہ تعالیٰ نے کافر ہی لیے ہیں۔

وَإِنْ يَكْذِبْ بَا فَعَلَيْهِ كَذِبُهُ (پ: ۲۶)

• اور اگر وہ جھوٹا ہے تو اس کا جھوٹ اس پر پڑے گا (عبدالماجد دریا آبادی)

• اگر وہ جھوٹا ہوگا تو اس کے جھوٹ کا ضرر اسی کو ہوگا (فتح محمد)

• اگر وہ جھوٹا ہوگا تو اس پر پڑے گا اس کا جھوٹ (محمود الحسن)

• (شاہ عبدالقادر)

• اگر وہ جھوٹا ہی ہو تو اس کا جھوٹ اس پر پڑے گا (اشرف علی)

• اگر وہ جھوٹا ہے تو اس کا جھوٹ خود اسی پر ملے گا (مودودی)

• اور اگر بالفرض وہ غلط کہتے ہیں تو ان کی غلط گوئی کا وبال ان پر (علی حضرت)

• علی حضرت کے ترجمہ پر خود قرآنی پاک شاہد ہے کیونکہ اس آیت کریمہ کا مکمل مفہوم

یہ ہے کہ آل فرعون سے ایک شخص جو ایمان کو چھپاتا تھا، اس نے کہا، کیا تم اس

شخص کو قتل کرتے ہو جو کہتا ہے میرا رب اللہ ہے۔ بے شک وہ تمہارے رب

کی طرف سے تمہارے پاس روشن دلیل لایا ہے۔ اگر وہ بالفرض جھوٹے ہیں تو ان کی

غلط گوئی کا وبال ان پر، اور اگر وہ سچ کہتے ہیں تو جس کا تمہیں وعدہ دیتے ہیں

تمہیں بھی ایضاً پہنچ جائے گا۔

اب قرآن پاک سے ہی واضح طور پر سمجھ میں آ گیا کہ یہ کلام اس شخص کی ہے
جو درپردہ ایمان رکھتا تھا اور کلام موسیٰ علیہ السلام کے متعلق ہے۔ لہذا یہ کہنا
تو ممکن نہیں کہ وہ شخص جو ایمان دار تھا وہ موسیٰ علیہ السلام کے متعلق حقیقتاً یہ
خیال کرتا تھا کہ اگر وہ جھوٹا ہے تو اس پر پڑے گا جھوٹ۔ بلکہ اس کا مطلب ہی تھا
کہ اگر وہ بالفرض غلط کہتے ہیں تو غلط کہنے کا وبال ان پر۔ علی حضرت کا ترجمہ
حقیقت اور ادبِ حرام پر مبنی ہے۔

وَمَا كُنْتَ تَدْرِي مَا الْكِتَابُ وَلَا الْإِيمَانُ (پ: ۲۷)

• تو نہ جانتا تھا کہ کیا ہے کتاب اور نہ ایمان (مولانا محمود الحسن)

• (شاہ عبدالقادر)

• آپ کو نہ یہ خبر تھی کہ کتاب کیا چیز ہے اور یہ خبر تھی کہ ایمان کیا چیز ہے۔

(مولانا اشرف علی)

• تمہیں کچھ پتا نہ تھا کہ کتاب کیا ہوتی ہے اور ایمان کیا ہوتا ہے (مودودی)

• (نزول وحی سے پہلے) آپ کو نہ یہ خبر تھی کہ کتاب کیا چیز ہے اور نہ یہ کہ

ایمان کیا چیز ہے۔ (عبدالماجد دریا آبادی)

• اس سے پہلے نہ تم کتاب جانتے تھے نہ احکام شرع کی تفصیل (علی حضرت)

اس مقام پر تمام مترجمین نے نزول وحی سے قبل ایمان کے علم کی بھی نفی کر دی

کہ نبی کریم وحی سے پہلے ایمان کو نہیں جانتے تھے۔ یعنی آپ کو پتا ہی نہیں تھا کہ

ایمان کیا چیز ہے۔ حالانکہ نبی کریم کو اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ آپ کہیں : وَاَنَا

أَوَّلُ الْمُسْلِمِينَ کہ میں سب سے پہلے اللہ تعالیٰ کی ذات کو ماننے والا ہوں۔

صاوہی میں ہے : وَأَنِ الْأَوَّلِينَ بِالنِّسْبَةِ لِعَالَمِ ذَهَبِ حَقِيقَةٍ۔ یعنی

آپ فی الواقع حقیقتاً سب سے پہلے اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کو ماننے والے

تھے۔ اس سے پتا چلا کہ آپ ایمان کو تو پہلے سے ہی جانتے تھے۔ یہ کہنا کہ

آپ وحی سے پہلے ایمان بھی نہیں جانتے تھے کہ وہ کیا چیز ہے، یہ غلط ہے۔
جلالین میں ہے : وَلَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ شَرِيعَةً وَمَعَالِمَهُ يَعْنِي إِيْمَانًا
سے مراد احکام شرع کی تفصیل ہے۔

انخطیب میں ہے : وَلَنْ كَانَ قَبْلَ الْبَشَرِ قَدْ كَانَ مَقَرًّا لِأَوَّلِ الْبَشَرِ
امثہ تعالیٰ وعظمتہ یعنی ایمان کا معنی احکام شرع کی تفصیل کیوں کیا ہے
اس لیے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نبوت سے قبل بھی اللہ تعالیٰ کی وحدانیت
وعظمت کا اقرار فرماتے تھے۔

وَمَا كَانَ لِبَشَرٍ أَنْ يُكَلِّمَهُ اللَّهُ إِلَّا وَحْيًا أَوْ مِنْ وَرَاءِ حِجَابٍ
(۲۵۶ ع)

- اور نہیں ہے کسی آدمی کو کہ بات کرے اس سے اللہ مگر وحی میں ڈال کر یا پیچھے پردے کے سے (شاہ رفیع الدین)۔
- یہ کسی بشر کا مرتبہ نہیں کہ اللہ اس سے کلام کرے مگر ملاں یا تو وحی سے یا کسی آڑ سے (عبد الماجد دریا آبادی)۔
- اور کسی آدمی کے لیے ممکن نہیں کہ خدا اس سے بات کرے مگر الہام کے ذریعے سے یا پردے کے پیچھے سے (فتح محمد)۔
- اور کسی آدمی کی طاقت نہیں کہ اس سے باتیں کرے اللہ مگر اشارہ سے یا پردہ کے پیچھے سے (مولانا محمود الحسن)۔
- اور کسی آدمی کی حد نہیں کہ اس سے باتیں کرے اللہ مگر اشارہ سے یا پردہ کے پیچھے سے (شاہ عبد القادر)۔
- کسی بشر کی یہ شان نہیں کہ اللہ تعالیٰ اس سے کلام فرمادے مگر یا تو الہام سے یا حجاب کے باہر سے (مولانا اشرف علی)۔
- کسی بشر کا یہ مقام نہیں ہے کہ اللہ اس سے رو برو بات کرے۔ اس

کی بات یا تو وحی (اشارے) کے طور پر ہوتی ہے یا پردے کے پیچھے سے (مودودی)

• اور کسی آدمی کو نہیں پہنچتا کہ اللہ اس سے کلام فرمائے مگر وحی کے طور پر یا یونکہ وہ بشر پردہ عظمت کے ادھر ہوا (علیٰ حضرت)۔

یہاں تراجم میں فرق یہ ہے کہ باقی حضرات نے ترجمہ یہ پیش کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ پردے کے پیچھے سے کلام کرتا ہے یا یہ کہا ہے کہ حجاب کے باہر سے لیکن اعلیٰ حضرت نے ترجمہ کیا ہے "یا یونکہ پردہ عظمت کے ادھر ہوا" اعلیٰ حضرت کا ترجمہ ایک اعتراض کو اٹھا رہا ہے جو علامہ رازی نے تفسیر کبیر میں ذکر کر کے پھر اس کا جواب دیا ہے تفسیر کبیر میں جو ذکر کیا گیا ہے اس کا حاصل یہ ہے :-

قوله تعالى او من وراء حجاب وانما يصح ذلك لو كان مكان مختصا
بمكان معين وجهة معينة والجواب ان ظاهر اللفظ وان اوهم
ما ذكرتم الا انه دللت الدلائل العقلية والنقلية على انه تعالى
يتمتع حصوله في المكان والجهة فوجب حمل هذا اللفظ على
التأويل والمعنى ان الرجل اذا سمع كلاما من الله لا يرى ذلك المتكلم
كان ذلك تشبيرا بما اذا تكلم من وراء حجاب العرشا بسبب الجواز المجاز
یہاں اعتراض یہ ہو گا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد او من وراء حجاب یہ اس
وقت صحیح ہو سکتا ہے جبکہ اللہ تعالیٰ ایک معین مکان سے اور ایک معین جہت سے مختص
ہو حالانکہ اللہ تعالیٰ مکان و جہت سے پاک ہے تو یہ کیسے صحیح ہے ؟
اس کا جواب یہ ہے کہ ظاہر الفاظ سے تو اگرچہ ایسا ہی وہم ہوتا ہے جیسا تم
نے ذکر کیا ہے لیکن عقلی اور نقلی دلائل اس پر دال ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے لیے مکان و
جہت ثابت کرنا منع ہے۔ اس لیے اس لفظ کی تاویل ضروری ہے۔ اب بعد از
تاویل معنی یہ ہو گا کہ جب کوئی شخص کلام کو سنے اور متکلم کو نہ دیکھتا ہو تو اس کو
مشابہت حاصل ہے۔ اس سے جو پردے کے پیچھے سے کلام کرے اور مشابہت

مجاز کے جواز کا سبب ہے۔

علامہ رازمی کی اس تقریر سے واضح ہوا کہ اللہ تعالیٰ پردے کے پیچھے سے
کلام نہیں فرماتا اور نہ اس کی شان کے لائق ہے کہ وہ پردے کے پیچھے ہو۔ البتہ
انسان جو اس کو نہ دیکھ سکے تو وہ سمجھتا ہے کہ گویا وہ پردے کے پیچھے ہے۔
اب اعلیٰ حضرت کے ترجمہ کو دیکھیں کہ وہ بشر پردہ عظمت کے ادھر پہنچنے
انسان خود اللہ تعالیٰ کے پردہ عظمت کے ایک طرف ہے۔ یہ نہیں کہ وہ اللہ
تعالیٰ انسان سے پردے میں کلام فرماتا ہے جب اس کا پردے میں ہونا جائز نہیں
تو یہ ترجمہ کرنا کہ وہ پردے سے پیچھے کلام کرتا ہے، یہ کیونکر صحیح ہو سکتا ہے۔

قُلْ إِنْ كَانَ لِلرَّحْمَنِ وَلَدٌ فَأَنَا أَوَّلُ الْعَابِدِينَ (٢٤٤)

• کہہ اگر ہوتی واسطے حرم کے اولاد، پس میں پہلا عبادت کرنے والا ہوں۔

(شاه رفیع الدین)

• ان سے کہو اگر واقعی رحمان کی کوئی اولاد ہوتی تو سب سے پہلے عبادت کرنے والے ہی ہوتا (مودودی)۔

• کہہ دو اگر خدا کے اولاد ہوتو میں سب سے پہلے اس کی عبادت کرنے والا ہوں (فتح محمد)

• تو کہہ اگر سورجمن کے واسطے اولاد تو نہیں سب سے پہلے یوں ہوں (محمود الحسن)

شاه محمد قاسم

• آپ کہیے کہ اگر خدا نے رحمن کی اولاد ہو تو سب سے اول اس کی عبادت کرنے والے ہیں ہوں۔ (مولانا اشرف علی)۔

• آپ کہہ دیجیے اگر خدائے رحمن کی اولاد ہوتا تو سب سے اوّل عبادت کرنے والے تو میں ہوں (عبدالماجد دریا آبادی)۔

• تم فرماؤ بغرض محال خمن کے کوئی بچہ ہوتا تو سب سے پہلے میں پوجتا (علی حضرت)

اعلیٰ حضرت کے ترجمہ میں بغرض محال کے الفاظ ہیں جب کہ دیگر تراجم میں نہیں۔
صحیح بھی یہی ہے کہ بغرض محال کی قید ہوتی چلے یہ کیونکہ اللہ تعالیٰ کا اپنا ارشاد
ہے کہ : مَا يَنْبَغِي لِلرَّحْمَنِ أَنْ يَتَّخِذَ وَلَدًا - سُبْحَانَ مَنْ يَكُونُ لَهُ وَلَدٌ -
اللہ تعالیٰ اولاد سے پاک ہے۔ جب اس کی اولاد کا ہونا ممکن ہی نہیں تو پھر یہی
صحیح ہے کہ یہ کلام بغرض محال یسرینی ہے۔

خیال ہے کہ عربی کے قواعد و ضوابط سے باخبر آدمی جو تقاسیر سے بھی باخبر ہے اسے اردو ترجمہ کے سہارا کی بھی ضرورت نہیں اور جو اردو تراجم کا محتاج ہے اس سے اس قسم کے مقامات پر جب صحیح راستہ کی نشاندہی نہ کی جائے تو اس کا راہِ راست سے بھٹک جانا عین ممکن ہے۔

اعلیٰ حضرت کے ترجمہ کی تائید میں تفسیر مدارک کی عبارت دیکھیں جو اس طرح ہے:

وهذا الكلام وارد على سبعين الغرض والمراد نفي الولد وذلك انه علق العبادة
بعدم عزة الولد وهي محال في نفسها فكان المعلق بها

محال مشابہا۔ یعنی یہ کلام بغیر ضی محال کے طریقہ پر وارد ہے اور مراد نفی ولد ہے کیونکہ عبادت کو اولاد کے ہونے پر معلق کیا ہے۔ اور اولاد کا ہونا فی ذاتہ محال ہے جو اس کے ساتھ معلق ہے وہ بھی اسی طرح محال ہو گا۔ جلالین

میں ہے: قل ان كان سر رحم من ولد ذرینا فانا اول العابدین
 للولد لکن ثبت ان لا ولد له تعالیٰ فان تفت عبادتہ یعنی آپ فرمادیں کہ اگر باطن
 رحمن کا کوئی بچہ ہوتا تو سب سے پہلے میں اس بچے کو پوخیا لیکن یہ تو یقیناً ثابت
 ہے کہ اس کی اولاد نہیں تو اس کی اولاد کی عبادت بھی خود بخود منتفی ہے۔

اعلیٰ حضرت کے ترجمہ کا حسن و کمال ظاہر ہے۔ اُنھنے بیٹھتے توحید، توحید کے
نعرے لگاتے والے شانِ اُلُوہیت کو بھی اس طرح نہ سمجھ سکے جس طرح ایک
محبِ مصطفیٰؐ۔ سمجھا۔ حبِ مصطفیٰؐ ہی تو باعثِ علم و فضل و کمال اور شرطِ
توحید ہے۔

ایمان والیوں کے (شاہ رفیع الدین)۔

• اور اپنے گناہوں کی معافی مانگو اور مومن مردوں اور مومن عورتوں کے لیے بھی (فتح محمد)

• اور معافی مانگو اپنے قصور کے لیے بھی اور مومن مردوں اور عورتوں کے لیے بھی (مولانا مودودی)۔

• اور معافی مانگ اپنے گناہ کے واسطے اور ایمان دار مردوں اور عورتوں کے لیے (محمد الحسن)۔

• اور معافی مانگ اپنے گناہ کو اور ایمان دار مردوں کو اور عورتوں کو (شاہ عبدالقادر)۔ اور آپ اپنی خطا کی معافی مانگتے رہیے اور سب مسلمان مردوں اور سب مسلمان عورتوں کے لیے (مولانا اشرف علی)۔

• اور اپنی خطا کی معافی مانگتے رہیے اور سارے ایمان والوں اور ایمان والیوں کے لیے بھی (عبدالماجد دریا آبادی)۔

• اور اے محبوب! اپنے خاصوں اور عام مسلمانوں مردوں اور عورتوں کے گناہوں کی معافی مانگو (اعلیٰ حضرت)

اس مقام پر مترجمین نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف گناہوں کی نسبت کی ہے کہ آپ اپنے گناہوں کی معافی مانگیں۔ معاذ اللہ ثم معاذ اللہ! یہ سراسر غلط ہے۔ نبی گنہگار نہیں ہوتا کہ وہ گناہ کرنے کے بعد گناہوں کی معافی مانگیں لیکن اعلیٰ حضرت کے ترجمہ میں گناہوں کی نسبت نبی کریم کے خصوصی اہل قرابت کی طرف ہے نبی کریم کی طرف نہیں جتنی تو یہ تھا کہ اعلیٰ حضرت کی علمیت اور آپ کے ترجمہ کی برتری کا اقرار کیا جاتا اور کہا جاتا کہ اگرچہ نظریات کا اختلاف ہے لیکن مولانا احمد رضا خاں بریلوی (رحمۃ اللہ علیہ) کا ترجمہ معنی بر حقیقت ہے۔ لیکن افسوس کا مقام یہ ہے کہ اپنی غلطیوں پر پروہ ڈالنے کے لیے اعلیٰ حضرت کے ترجمہ کو ان الفاظ سے طعن و تشنیع کا نشانہ بنایا گیا۔

”اے محبوب! اپنے خاصوں اور عام مردوں اور عورتوں کے گناہوں کی معافی مانگ“ ایسا بے بنیاد ترجمہ ہے جس سے کلام الہی کے روح کو مسخ کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ فاضل بریلوی نے الفاظ قرآنی سے بالکل ہٹ کر اس کا ترجمہ عام مردوں و عورتوں وغیرہ کر کے کتنا بڑا گناہ کیا ہے۔ اگر ایسے ہی اپنی مرضی سے جو شخص قرآنی مفہوم متعین کرنے لگے تو قرآن کی امتیازی حیثیت کس طرح برقرار رکھے گی؟

مترجمین کے اس اعتراض کا اندفاع اور اعلیٰ حضرت کے ترجمہ کی خوبی تفاسیر کے حوالے سے پیش کی جا رہی ہے کہ یہ ترجمہ اعلیٰ حضرت کی اپنی اختراع نہیں بلکہ تفاسیر سے منقول ہے۔ اگر کسی کی علمیت کا محور ہی اردو تراجم یا اردو تفسیر بیان القرآن ہو تو اس کا اعلیٰ حضرت کے ترجمہ کی خوبی سے بے خبر رہنا حقیقت ہے۔ اس کی علمی کمزوری کا ہم انکار نہیں کرتے۔ اب خیال یہ کیا جائے کہ ذنب کی نسبت نبی کریم کی طرف جو بظاہر نظر آتی ہے اس کی مفسرین کرام نے مختلف تاویلات پیش کی ہیں جس سے یہ واضح ہے کہ اس کا معنی اردو زبان میں گناہ کرنا غلط ہے کیونکہ عام آدمی اتنا ہی جانتا ہے کہ گناہ کی دو قسمیں ہیں، صغیرہ اور کبیرہ جبکہ انبیائے کرام صغائر اور کبائر سے پاک ہیں تو پھر گناہ کی نسبت کیسے ممکن ہو سکتی ہے۔

مرقاۃ باب الایمان بالقدر میں بیان کیا گیا کہ حضرت آدم علیہ السلام کی طرف نخواست اور معصیت کی نسبت صرف مجنی مخالفت کے ہے اپنے حقیقی معنی میں مستعمل نہیں۔ اس پر دلیل قائم کرتے ہوئے بیان کیا گیا ہے: لا صغیرۃ الاثام من اللہ بائز الصد خاسر قبل النبوة وبعدها۔ یعنی انبیائے کرام نبوت سے پہلے اور بعد میں بھی تمام صغیرہ اور کبیرہ گناہوں سے محصوم ہوتے ہیں۔

تفسیر کبیر میں علامہ رازی فرماتے ہیں :-

۱۔ لو صد الذنب عنهم لكانوا اقل درجة من عصاة الامة و ذللت غیر جائز و لا يجوز ان يكون النبي اقل حالاً من عدو الامة۔

۲۔ لو صد الذنب عن النبي فلا يكون مقبول الشهادۃ لقوله تعالیٰ ان

ان جاء كرفاسق بنيا فتميز الكنه مقبول الشهادة لقوله
تعالى ويكون الرسول عليك شهيدا -

۳۔ ان محمد صلى الله عليه وسلم لو اتي بالمعصية لوجب
عليه الاقتداء به فيها لقوله تعالى فاتبعوني فيفضي الى
الجمع بين الحرمة والوجوب وهو محال واذا ثبت ذلك في
حق محمد صلى الله عليه وسلم ثبت ايضا في سائر الانبياء -

۴۔ قوله تعالى انهم كانوا يسارعون في الغيرة ولفظ الخيرات للعلم
فيمتثل اول اكل ويدخل فيه فعن ما يستدعي وترك ما لا ينبغي فثبت
ان الانبياء كانوا قاعا لمواظبة على ما ينبغي فعله وتاركين كل ما
ينبغي تركه وذلك ينافي صدور الامتناع عنهم -

۵۔ انه تعالى قسم الخلق قسمين وقال اولئك حزب الشيطان الا ان
حزب الشيطان هم المفسدون وقال في المصنف الاخوان والذات
حزب الله الا ان حزب الله هم المفلحون ولا شك ان حزب
الشيطان - هو الذي يفعل ما يرضي الشيطان
والذي يرضي الشيطان هو الذي يصدر عنه فعل من عصي الله

تعالى كان من حزب الشيطان فلو صدرت المعصية
من الرسول لصدق عليه انه من حزب الشيطان ويصدق عليه
انه من المفسدون ويصدق على زهاد الامة انهم من حزب
الله وانهم من المفلحين فحينئذ يكون ذلك الواحد من
الامة افضل بكثير عند الله من ذلك الرسول وهذا لا يقول المسلم

۶۔ ان الرسول افضل من الامة بحكمه فوجب ان لا يصدر الذنب
عن الرسول لانه تعالى وصف الملائكة بترك الذنب فقال
لا يعصون الله ما امرهم ويفعلون ما يؤمرون فلو صدرت

المعصية عن الرسول لاستلزم كونه افضل من الملائكة لقوله تعالى
ام نجعل الدين امرا او عملوا الصلوات كما الحف بسدين في الارض ام نجعل الدين
كما الفجار - (المختار من الكبير - الجزء الاول في ذكر آدم)

تفسير كبير میں علامہ رازی رحمۃ اللہ علیہ نے عصمت انبیاء پر بہت سے دلائل
قائم کئے۔ ان میں سے چند بطور خاص نقل کئے گئے ہیں :-

۱۔ ایک دلیل یہ ہے : اگر نبی سے گناہ سرزد ہو تو نبی اپنی امت کے گناہگاروں
سے بھی کم درجہ ہوگا کیونکہ جتنا مقرب ہو اسی طرح اس کے گناہ بھی بہ نسبت عوام
کے بڑے سمجھے جائیں گے۔ اور یہ جانتے نہیں کیونکہ نبی تو اپنی امت کے برگزیدہ
آدمیوں سے بھی کم درجہ نہیں ہو سکتا۔

۲۔ اور یہ دلیل دی گئی ہے کہ اگر نبی سے گناہ سرزد ہو تو نبی کی شہادت قبول
نہیں ہو سکے گی کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اگر قاتل تمھارے پاس کوئی خبر لاتے تو اس
کی تقتیش کر لیا کرو حالانکہ نبی کریم تو مقبول شہادت ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد
گرامی ہے : ويكون الرسول عليكم شهيدا - اور نبی کریم آخرت میں تم پر گواہ
ہوں گے۔

۳۔ اور یہ دلیل دی گئی کہ اگر نبی کریم سے گناہ سرزد ہو تو ہم بھی اس گناہ میں
آپ کی اقتدار لازم ہوگی کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا "فاتبعوني" یعنی نبی کریم سے
امت کو کہلوایا کہ تم میری تابعداری کرو۔ اس طرح حرمت اور وجوب جمع ہو جائیں
گے اور یہ تو محال ہے۔

۴۔ اور دلیل اس طرح ذکر کی گئی کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے انبیائے کرام کی تعریف اس
طرح کی ہے کہ وہ خیرات میں جلدی کرتے ہیں خیرات کا لفظ عام ہے۔ کل کو شامل
ہے جس کام کا کرنا اچھا ہے اس کو کرنا یا جس کام کا کرنا اچھا نہیں اس کو چھوڑنا۔
اس سے پتا چلا کہ انبیائے کرام بھلائی کے کام کرتے ہیں اور بُرے کاموں کو
چھوڑتے ہیں جب اللہ تعالیٰ ان کے اس عمل کی تعریف فرماتا ہے تو ان سے گناہ کا

سرزد ہونا منع ہے ۔

۵۔ اسی طرح اور دلیل پیش کی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی مخلوق کو دوسروں پر منقسم فرمایا۔ ایک گروہ کو شیطان کی جماعت کہا ہے کہ شیطان کی جماعت خسائے ہیں اور دوسری جماعت کو اللہ کی جماعت کہا ہے کہ اللہ کی جماعت ہی کامیاب ہے۔ شیطان کی جماعت تو یقیناً وہ ہوگی جو وہ کام کرے گی جس کو شیطان پسند کرتا ہو اور شیطان تو گناہوں کو پسند کرتا ہے جو شخص گناہ کرے گا، اللہ کی نافرمانی کرے گا وہی شیطان گروہ میں داخل ہوگا۔ اگر انبیائے کرام سے بھی گناہ سرزد ہو تو محاذ اللہ ان پر شیطان گروہ میں داخل ہونا سچا آئے گا اور ان کا خصلے میں ہونا لازم آئے گا اور یقیناً امت کے نیک لوگ اللہ کے گروہ میں ہونگے۔ تو اتمتی کا نبی سے اللہ کے نزدیک زیادہ مرتبہ ہونا لازم آئے گا۔ اس کا کوئی مسلمان قائل نہیں ہو سکتا۔

اب اس بیان کے بعد واضح ہوا کہ انبیائے کرام تمام صغائر و کبائر گناہوں سے پاک ہیں۔ لہذا ایسا ترجمہ کہ معافی مانگنے کے واسطے کتنا ہی حقیقت سے دور ہے۔ انبیائے کرام کی شان کا لحاظ نہیں کیا گیا۔ اردو ترجمہ بھی وہی صحیح ہو سکتا ہے جس سے مفسرین کرام کی پیش کردہ تاویلات واضح سمجھ آئیں۔ اپنے غلط تراجم کو صحیح کرنے کی کوشش میں گمراہ کن الزامات اور حد سے تجاوز اور یہ کہنا کہ اعلیٰ حضرت نے غلط ترجمہ کیا ہے اور اس ترجمہ میں گناہ کیا ہے۔ یہ بہت بڑا الزام ہے۔ اپنی بے علمی کا واضح اعلان کر دیا۔ گویا دوسرے لفظوں میں یوں کہا گیا ہے کہ ہمیں صرف مخالفت کے پیش نظر اعتراض کرنا آتا ہے اور الزام تراشی ہمارا وطیرہ ہے۔ تفاسیر کا مطالعہ کرنا اور ان کو سمجھنا، کتب کی ورق گردانی، عرق ریزی یہ کام ہم سے مشکل ہے۔ کیونکہ ہم سمجھنے کی اہلیت سے عاری ہیں۔

آئیے! اعلیٰ حضرت کے ترجمہ کو تفسیر کبیر کے آئینہ میں دیکھیں۔ علامہ رازی اس آیت کریمہ کی توجہات میں بیان فرماتے ہیں :-

لَا تُدْعَىٰ إِلَى الدِّينِ إِلَّا بِذِلَّةٍ وَإِلَى الدِّينِ لَا تُدْعَىٰ إِلَّا بِإِذْنِهِ

ای الذین یسئلونک باہل بیتک ۔ یعنی اس میں ایک وجہ یہ بیان کی گئی ہے کہ لذتیک سے مراد اہل بیت کے گناہ ہیں اگرچہ اس سے مراد بھی خلاف اہل بیت کا ارتکاب آپ اپنے اہل بیت اور مومن مردوں اور عورتوں کے گناہوں کی مغفرت طلب کریں ۔

اب علامہ رازی کے اس بیان کے بعد کسی کو ہوش نہ آئے اور عناد کی کدورت کو دل سے نہ نکالے اور اعلیٰ حضرت کے ترجمہ کو غلط کہے تو اس پر کیا اعتراض کیا جاسکتا ہے؟ جب کہ انبیائے کرام کو بھی لوگوں نے جادو کر اور جھوٹے کہہ دیا ہے۔ اب تفسیر کبیر کی بھی عبارت کو سامنے رکھ کر اعلیٰ حضرت کے ترجمہ کو دیکھیں اور اے محبوب! اپنے خاص اور عام مسلمانوں مردوں اور عورتوں کے گناہوں کی معافی مانگو۔ تو کتنا صحیح ترجمہ نظر آئے گا اور نبی کریم کی شان کے عین مطابق سمجھ آئے گا۔ اگرچہ اس کی اور توجہات بھی پیش کی گئی ہیں لیکن اردو میں انکا ترجمہ بھی یہ نہیں کہ آپ اپنے گناہوں کی معافی مانگیں۔

مفسرین کرام کی پیش کردہ توجہات کو دیکھ کر خود اندازہ کریں کہ ترجمہ کیا ہونا چاہیے :- وجعل الاستغفار ذللاً علی الذین یسئلونک باہل بیتک ۔ علامہ رازی نے معصوم و مغفوت (روح المعانی) نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم معصوم و مغفوت ہونے کے باوجود مجزا نہ طور پر استغفار کرتے رہتے تھے کیونکہ خود نبی کریم کا ارشاد ہے :-

مَا أَصْحَابُ غَدَاةٍ قَطُّ إِلَّا اسْتَغْفَرُوا لِنَفْسِهِمْ يَوْمَئِذٍ

”کوئی ایسی صبح ہرگز نہیں آئی کہ جس میں میں نے اللہ تعالیٰ سے ایک سو مرتبہ استغفار نہ کیا ہو۔“

اب اس تاویل کے مطابق اردو ترجمہ یہ ہوگا کہ اے نبی کریم آپ استغفر اللہ پڑھتے رہا کیجیے (یہ آپ کے مدارج کی بلندی کا سبب ہے)۔ دوسری توجہات بھی یہ پیش کی گئی ہیں :-

وقد ذكروا ان نسبنا في
كل لحظة عروجنا الى مقام اعلى ما كان
فيه فيكون ماعرج من في نظره الشرح
ذنب بالنسبة الى ما عرج اليه فيستغفر
منه وحملا على ذلك قوله عليه السلام انه
ليغان على قلبي - (الحديث)
(ان ليغان على قلبي وان لا يستغفر الله كل يوم مائة
مرة)

یعنی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے مدارج میں لخط یہ لخط عروج تھا اور آپ
جن مدارج سے دوسرے مدارج کی طرف ترقی فرماتے تو آپ کے دل میں ایک
خلش سی پیدا ہوتی۔ اسی وجہ سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ میرے
دل میں ایک پیکس اور ٹرپ سی ہوتی ہے تو میں ہر دن ایک سو مرتبہ استغفار
کرتا ہوں۔

اب اس تاویل کے مطابق اردو ترجمہ یہ مناسب ہوگا کہ اے محبوب! آپ اپنے مدارج کی مبتدی کے لیے استغفار (دعا) کرتے رہیں۔
تفاسیر کے اس بیان ذی شان سے اعلیٰ حضرت کے ترجمہ کا ذی شان ہوتا
اظہار من الشمس ہوا۔ اور ایسا ترجمہ کرنا جس میں نبی کریم کو معاذ اللہ گنگار ٹھہرایا
جائے۔ ہزار عیبوں سے یہی ایک عیب بڑا ہے۔

اللهم شبتنا على حب رسول الله
صلوات الله عليه وسلم -

لِيَغْفِرَ لَكَ اللَّهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِكَ وَمَا تَأَخَّرَ (پ ۹)

تاکہ خدا تمہارے اگلے اور پچھلے گناہ بخش دے
تو کہ بخشے واسطے تیرے خدا جو کچھ ہوا تھا پہلے گناہوں تیرے سے
اور جو کچھ پیچھے ہوا۔ (شاہ رفیع الدین)
تاکہ معاف کرے تجھ کو اللہ جو آگے ہو چکے تیرے گناہ اور جو پیچھے رہے
(مولانا محمود الحسن)

تاکہ معاف کرے تجھ کو اللہ جو آگے ہوئے تیرے گناہ اور جو پیچھے رہے
(شاہ عبدالقادر)
تاکہ اللہ تعالیٰ آپ کی سب اگلی پچھلی خطائیں معاف کر دے (مولانا اشرف علی)
تاکہ اللہ تمہاری اگلی پچھلی ہر کوتاہی سے درگزر فرمائے (موردی)
تاکہ اللہ آپ کی (سب) اگلی پچھلی خطائیں معاف کر دے (عبدالماجد دریا آبادی)
تاکہ اللہ تمہارے سبب سے گناہ بخشے تمہارے اگلوں کے اور تمہارے
پچھلوں کے۔ (اعلیٰ حضرت)

اس مقام پر بھی اعلیٰ حضرت نے گناہوں کی نسبت نبی کریم کی طرف
نہیں کی۔ یہ ترجمہ نہیں کیا کہ تمہارے اگلے پچھلے گناہ بخش دے۔ لیکن دوسرے
حضرات نے نبی کریم کو معاذ اللہ گنگار ٹھہراتے ہوئے ترجمہ کیا تاکہ تمہارے
اگلے پچھلے گناہ، خطائیں، کوتاہی معاف کر دے۔ پھر اپنے غلط تراجم پر اتراتے
ہوئے اعلیٰ حضرت کے ترجمہ کو ان الفاظ سے مورد طعن و تشنیع بنایا گیا "اس آیت
میں تمہارے اگلے پچھلے کالفظ مولانا بریلوی کی ذاتی اختراع ہے" سبحان اللہ
کیسا سارق اور شاطر کہ اپنے غلط تراجم کے عیوب پر پردہ ڈالنے کیلئے اعلیٰ حضرت کے
ترجمہ کو مورد الزام ٹھہرایا لیکن ایسی فریب کاریوں سے مسلمانوں کو دھوکا میں نہیں ڈالنا

جاسکتا۔ کیونکہ سب مسلمان عصمت انبیاء کو جانتے ہیں کہ انبیاء کرام سے گناہ سرزد نہیں ہوتے۔ اعلیٰ حضرت کے ترجمہ کو ذاتی اختراع کہنے والے اگر تفاسیر کو دیکھنے کی تکلیف کرتے تو یہ بہتان زباندھتے اور جرم عظیم کا ارتکاب نہ کرتے۔ آئیے اگر تفاسیر کو سمجھنے کی اہلیت نہیں تو میں اعلیٰ حضرت کے ترجمہ کی تائید پر تفاسیر کی عبارات پیش کر کے مطلب سمجھا دیتا ہوں اور دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ ضد اور عناد کی کدورت کو دل سے نکالے اور رب قدوس تمہیں سمجھنے کی توفیق دے۔

جلالین میں ہے وهو مؤول لعصمة الانبياء عليهم الصلوة والسلام کہ یہ آیت کریمہ اپنے ظاہر پر نہیں کہ نبی کریم کے اگلے اور پچھلے گناہ معاف کر دیے گئے بلکہ اس آیت کریمہ کی ضروری طور پر تاویل کی جائے گی۔ اس لئے کہ انبیاء کرام معصوم ہیں ان سے گناہ نہیں ہوتے جب وہ گناہ نہیں کرتے تو اگلے پچھلے گناہوں کے معاف کرنے کا کوئی مقصد نہیں جبکہ جلالین کے مطابق آیت کریمہ کی تاویل ضروری ہے تو وہ تاویل کیا ہوگی وهو مؤول ای اسناد الذنب الی صلی اللہ علیہ وسلم مؤول امابان الصلوة ذنوب امتك (صاوی) یعنی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف ذنوب نسبت مؤول ہے اس کی تاویل ضروری ہے وہ تاویل کئی ہیں لیکن ان میں سے ایک ہے کہ ذنوب سے مراد نبی کریم کے تقاضے ذنوب نہیں بلکہ امت کے ذنوب ہیں۔ اب اعلیٰ حضرت کے ترجمہ پر غور فرمائیں کہ اللہ تمہارے سبب سے گناہ بخشے تمہارے اگلوں اور پچھلوں کے۔ صاوی کی اس تاویل کے کتنا ہی مطابق ہے یعنی آپ کی امت کے بعد میں آئیوالے لوگ اور تمہارے زمانے کے لوگ جو نسبت بعد میں آئیوالوں کے اگلے ہیں تمہاری وجہ سے اللہ تعالیٰ ان تمام کے گناہ بخشے اسی طرح تفسیر کبیر میں ہے لم یکن للنبي ذنب فماذا ليخطر له قلنا الجواب من وجوه احدها المراد ذنوب المؤمنين یعنی تفسیر کبیر میں ذکر کیا گیا ہے کہ نبی کریم کے گناہ جب نہیں ہیں تو گناہوں کے معاف کرنے کا کیا مطلب اور یہ کہنا کیونکر صحیح ہو سکتا کہ تاکہ تمہارے اگلے اور پچھلے گناہ معاف کر دے۔ تو فرماتے ہیں اس کا جواب

کئی وجہ سے دیا گیا ہے اور ان میں سے ایک یہ ہے کہ گناہوں سے مراد مومنوں کے گناہ ہیں جس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کے سبب سے تمہارے اگلوں اور پچھلوں کے گناہ معاف فرما دے۔ کمالین میں اسی طرح پیش کیا گیا ہے وعن بعض ما تقدم هو ذنب ابويك آدم وحواء ما اخرج ذنوب امتك یعنی بعض حضرات نے یہ کیا ہے کہ ما تقدم سے مراد ذنوب آدم وحواء ہے اور ما اخرج سے مراد آپ کی امت کے ذنوب ہیں اگرچہ یہاں بھی یہ ترجمہ کرنا صحیح ہوگا کہ اللہ تعالیٰ آپ کے سبب سے آپ کے اگلوں اور پچھلوں کے ذنوب معاف فرمائے لیکن خیال رہے کہ اعلیٰ حضرت کا ترجمہ اس تاویل کے مطابق جو تفسیر کبیر اور صاوی سے پیش کی جا چکی ہے کمالین کی اس تاویل کے مطابق نہیں کیونکہ جمیع انبیاء کرام معصوم ہیں اس لئے اس تاویل کے مطابق بھی اردو زبان میں آپ کے اگلوں اور پچھلوں کے گناہ معاف فرما دے درست نہیں۔ کیونکہ آدم علیہ السلام کی یہ بھول تھی گناہ نہیں تھا البتہ اس تاویل کو اس لئے پیش کیا گیا ہے کہ اعلیٰ حضرت کے ترجمہ پر جو اعتراض اس طرح کیا ہے کہ اگلے اور پچھلے مولانا بریلوی کی ذاتی اختراع ہے ان کو سمجھایا جاسکے کہ یہ اختراع نہیں بلکہ تفاسیر کا بیان ہے سمجھنے کے لئے علمیت ضروری ہے مذکورہ بالا تفاسیر کے بیان کی روشنی میں صاحب ایمان کو یہ سمجھنے میں کوئی استحالة درپیش نہیں کہ انبیاء کرام معصوم ہیں لہذا یہ کہنا غلط ہے کہ نبی کریم کے اگلے اور پچھلے گناہ معاف کرنے کا ذکر ہے بلکہ آپ کی امت کے اگلے اور پچھلے لوگوں کے گناہ معاف کرنے کا ذکر ہے۔ مدارج النبوة میں شیخ عبدالحق محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے تصریح فرمائی ہے کہ انبیاء کرام معصوم ہیں صفائے کبار گناہوں سے پاک ہیں آپ فرماتے ہیں لیختر لك الله ما تقدم من ذنبك وما تاخر اقرار درینجا بسیار است یعنی گفتہ اند مراد چیز نیست کہ واقع شد در حیات پیش از نبوت و امام سبکی گفتہ این مردود است زیرا کہ نبوہ و غیر خدا را صلی اللہ علیہ وسلم جاہلیت و دوی صلی اللہ علیہ وسلم است پیش از نبوت و بعد از دوی زنجشیری در کفر اف گفتہ و بیضادی نیز درینجا تبہیت و می کردہ کہ مراد جمیع انچہ گذشتہ از فرطات کہ تواند کہ

وَالنَّجْمُ إِذَا هَوَىٰ

(فتح محمد)

(شاہ رفیع الدین)

(محمود الحسن)

(شاہ عبدالقادر)

(مولانا اشرف علی)

(مردودی)

(عبدالمجید دیریا آبادی)

(علی حضرت)

(علی حضرت کے ترجمہ سے پتہ چلتا ہے کہ النجم سے مراد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہیں اور ہوی سے مراد آپ کے معراج سے واپس نزول فرمانا

(علی حضرت کے ترجمہ کی تائید روح المعانی سے ملتی ہے وخال جعفر الصادق

رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہوالنبی صلی اللہ علیہ وسلم وھو یہ نزولہ من السماء لیلۃ المعراج وجوز

علیٰ ہذا ان یولد بھویہ صمدہ و عروجہ علیہ الصلوٰۃ والسلام الی منقطع الایں

حضرت امام جعفر صادق رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ النجم سے مراد نبی کریم صلی اللہ

علیہ وسلم ہیں اور ہوی سے مراد آپ کا شب معراج آسمانوں سے نزول فرمانا

ہے اور فرماتے ہیں اور یہ بھی جائز ہے کہ ہوی سے مراد آپ کا آسمانوں پر

وہاں تک عروج فرمانا جہاں مکان کی حدود ختم ہو جاتی ہے۔ اسی طرح تفسیر

سراج المنیر میں ہے وخال جعفر الصادق یقنیٰ لحدیثی اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اذا نزل

من السماء لیلۃ المعراج والھوی النزول ہوت یہوی ہویا

حضرت امام جعفر الصادق رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ النجم سے مراد محمد مصطفیٰ

صلی اللہ علیہ وسلم ہیں جبکہ آپ نے آسمانوں سے شب معراج کو نزول فرمایا

الھوی کا معنی اترنا ہے اس سے ہوی بھوی ہویا ہے البحر المحیط میں

ہے وخال ابن جبیر الصادق ہوالنبی صلی اللہ علیہ وسلم وہ یہ نزولہ لیلۃ المعراج

حضرت ابن جبیر صادق رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ النجم سے مراد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہیں اور ہوی سے مراد آپ کا شب معراج کو اترنا ہے۔ الجامع لا حکام البیان للقرطبی میں اسی طرح ہے والنجم یعنی محمد صلی اللہ علیہ وسلم اذا ہوی اذا نزل من السماء لیلۃ المعراج النجم سے مراد محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں جب آپ نے شب معراج کو آسمانوں سے نزول فرمایا۔

ان مذکورہ بالا تفاسیر کی عبارات سے یہ واضح ہوا کہ النجم سے مراد

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہیں آپ کو تارے سے تعبیر فرمایا گیا ہے۔ لیکن فہم

کہ تفاسیر کو دیکھنے کی تکلیف کے بغیر ہی اعلیٰ حضرت کے ترجمہ کو طعن و تشنیع

کا نشانہ ان الفاظ میں بنایا گیا ہے۔ والنجم اذا ہوی اس آیت میں نجم

کا معنی اسے پیارے چمکتے تارے سراسر غلط اور من گھڑت ہے۔ معترض کے

اعتراض سے اس کا یہ مطلب ہوا کہ جتنی تفاسیر کا اوپر ذکر کیا ہے وہ سب غلط

اور من گھڑت ہیں۔ خدا سمجھنے کی توفیق دے۔ حالانکہ اس سورۃ طیبہ میں نبی کریم

کے معراج کو ہی بیان کیا گیا ہے آپ کا قریب ہونا اور دیدار باری تعالیٰ

سے مشرف ہونا۔ گویا کہ آئیوا لا بیان بھی اس پر دلیل ہے کہ النجم سے مراد

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہیں اور آپ ہی پیارے چمکتے تارے ہیں۔ معترض

صاحب کی علمیت کا اندازہ تو یہاں سے ہی ہو جاتا ہے کہ اعتراض کرتے

ہوئے نجم بغیر الف لام کے ذکر کیا ہے حالانکہ الف لام اس پر لازم ہے

بغیر الف لام کے نجم تارے کے معنی میں نہیں آتا بلکہ تھوڑا حصہ عام تارے کے معنی

دیتا ہے اس کے بعد آئیوا لی آیات کا ترجمہ اعلیٰ حضرت نے اس طرح فرمایا

جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ معراج کی رات نبی کریم کو رب قدوس کا

بہت زیادہ قرب حاصل ہوا جو بلا کیف صورت تھی۔ اسی طرح رب تعالیٰ کو

بلا کیف آپ نے دیکھا، مشاہدہ فرمایا۔ پہلے تو آپ چند آیات کے تراجم کا فرق

دیکھیں پھر ان پر تفاسیر کی رائے۔

عَلَمَهُ شَدِيدُ الْقُوَى ذُو مِرَّةٍ فَاسْتَوَى

اس کو سکھایا سخت قوتوں والے نے زور آورنے پھر سیدھا بیٹھا۔
(مولانا محمود الحسن)
ان کو نہایت قوت والے نے سکھایا یعنی جبرائیل طاقتور نے پھر وہ پورے
نظر آئے۔ (فتح محمد)

اس کو سکھایا سخت قوتوں والے نے زور آورنے پھر سیدھا بیٹھا۔
(شاہ عبدالقادر)
ان کو ایک فرشتہ تعلیم کرتا ہے جو بڑا طاقتور ہے پیدائشی طاقت ور
ہے وہ فرشتہ اصلی صورت میں نمودار ہوا۔ (مولانا اشرف علی)
انہیں بڑی قوت والا (فرشتہ) سکھاتا ہے پیدائشی طاقتور پھر وہ اصلی
صورت پر ظاہر ہوا۔ (عبداللہ ماجد دریا آبادی)

انہیں سکھایا سخت قوتوں والے طاقتور نے پھر اس جلوہ نے قصد فرمایا
(اعلیٰ حضرت)

ثُمَّ دَنَا فَتَدَلَّى

پھر نزدیک ہوا اور لٹک آیا۔
پھر نزدیک ہوا اور لٹک آیا۔
پھر وہ فرشتہ نزدیک آیا۔
پھر قریب آیا اور اوپر معلق ہو گیا۔
پھر وہ نزدیک ہوا اور زیادہ نزدیک ہوا۔
پھر قریب ہوا اور آگے بڑھے۔
پھر وہ جلوہ نزدیک ہوا اور خوب اتر آیا۔
(مولانا محمود الحسن)
(شاہ عبدالقادر)
(مولانا اشرف علی)
(مورودی)
(عبداللہ ماجد دریا آبادی)
(فتح محمد)
(اعلیٰ حضرت)

فَكَانَ قَابَ قَوْسَيْنِ أَوْ أَدْنَىٰ (پ ۶)

پھر وہ گیا فرق دو کمان کی برابر یا اس سے بھی نزدیک۔ (محمود الحسن)
تو دو کمان کے فاصلے پر یا اس سے بھی کم۔ (فتح محمد)
پھر وہ گیا فرق دو کمان کا مابین یا اس سے بھی نزدیک۔ (شاہ عبدالقادر)
پھر اور نزدیک آیا سو دو کمانوں کے برابر فاصلہ رہ گیا بلکہ اور بھی کم۔ (اشرف علی)
یہاں تک کہ دو کمانوں کے برابر یا اس سے کچھ کم فاصلہ رہ گیا (مورودی)
سو دو کمانوں کا فاصلہ رہ گیا بلکہ اور بھی کم۔ (عبداللہ ماجد دریا آبادی)
تو اس جلوے اور اس محبوب میں دو ہاتھ کا فاصلہ رہا بلکہ اس سے بھی کم
(اعلیٰ حضرت)

وَلَقَدْ رَآهُ نَزْلَةً أُخْرَىٰ (پ ۶)

اور اس نے اس کو دیکھا اترتے ہوئے ایک بار اور بھی۔ (مولانا محمود الحسن)
انہوں نے اسی کو ایک بار بار بھی دیکھا۔ (فتح محمد)
اور اسی کو اس نے دیکھا ہے ایک دوسرے تارے میں (شاہ عبدالقادر)
اور انہوں نے اس فرشتہ کو ایک اور دفعہ بھی دیکھا ہے (مولانا اشرف علی)
اور ایک دفعہ پھر اس نے سدرۃ المنتہی کے پاس اس کو اترتے دیکھا (مورودی)
اور انہوں نے اس (فرشتہ) کو ایک بار بار بھی دیکھا ہے۔ (عبداللہ ماجد دریا آبادی)
انہوں نے تو وہ جلوہ دوبار دیکھا۔ (اعلیٰ حضرت)

ان مذکورہ بالا آیات مبارکہ کے ترجمہ سے یہ واضح ہوتا ہے کہ
اعلیٰ حضرت نے واقعہ معراج مراد لیا ہے اور رب تعالیٰ کے قریب ہونا
اور اللہ تعالیٰ کا دیدار کرنا مراد لیا ہے جبکہ دیگر مترجمین نے جبرائیل کی ملاقات

مراد لی ہے۔ اگرچہ تفاسیر میں اس کا ذکر بھی ہے لیکن راجح قول وہی ہے جو اعلیٰ حضرت کے ترجمہ سے ظاہر ہے۔ دوسرا قول مرجوح ہے۔ تفسیر طبری میں ہے ثم دنا فتدلی وقال اخرون بل معنى ذلك ثم دنا الرب من محمد صلى الله عليه وسلم فتدلی حدثنا يحيى بن سعيد الاموي قال حدثنا محمد بن عمرو عن ابي سلمة عن ابن عباس ثم دنا فتدلی قال دنی ربہ فتدلی حدثنا الربيع قال حدثنا ابن وهب عن سليمان بن بلال عن شريك بن ابی نمر قال سمعت انس بن مالك يحدثنا عن ليلة المسرى برسول الله صلى الله عليه وسلم انه عرج جبرائيل برسول الله صلى الله عليه وسلم الى السماء السابق ثم علا به بما لا يعلم الى الله حتى جاء سدرة المنتهى ودنا الجبار رب العزة فتدلی حتى كان منه قاب قوسين او ادنى فاوحى الله اليه فيها وحي خمسين صلوة على امته كل يوم وليلة وذكر الحديث

تفسیر طبری نے اس طرح بیان کیا کہ ثم دنا فتدلی سے مراد یہ ہے کہ رب تعالیٰ نبی کریم کے قریب ہوا اور زیادہ قریب ہوا (چونکہ رب تعالیٰ کا قرب بلا کیف تھا اسی وجہ سے اعلیٰ حضرت نے ترجمہ کیا پھر وہ جلو نزدیک ہوا پھر وہ خوب اتر آیا) حضرت ابن عباس سے بھی اسی طرح مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو رب تعالیٰ کا قرب حاصل ہوا۔ اسی طرح حضرت انس رضی اللہ عنہ نے نبی کریم کے معراج کی رات کا ذکر فرمایا کہ جبرائیل امین نبی کریم کو ساتویں آسمان تک اوپر لے گئے پھر آپ کو اور اتنی بلندی حاصل ہوئی جس کو فقط اللہ ہی جانتا ہے۔ یہاں تک کہ آپ کو سدرة المنتهى پر رب قدوس کے جلوے کا قرب حاصل ہوا وہ اتنا زیادہ قرب حاصل ہوا کہ مجرب اور اس کے جلوے میں دو ہاتھ کا

فاصلہ رکھ گیا یا اس سے بھی کم تو اللہ تعالیٰ نے آپ کی امت کے لئے ہر رات اور دن میں پچاس نمازوں کا حکم فرمایا آپ کو وحی فرمائی تفسیر طبری میں ہے قال البغوي روي في قصة المعراج عن شريك بن عبد الله بن انس وروى الجبار رب العزة فتدلی حتى كان منه صلى الله عليه وسلم قاب قوسين او ادنى

یعنی حضرت عبد اللہ بن انس نے نبی کریم کے واقعہ معراج میں یہ بیان کیا کہ نبی کریم کو رب کے جلوے کا اتنا زیادہ قرب حاصل ہوا یہاں تک کہ نبی کریم اور اس جلوے میں دو ہاتھ کا فاصلہ رکھا یا اس سے بھی کم۔

تفسیر القطرانی میں ہے وعن ابن عباس ايضا في قوله تعالى ثم دنا فتدلی ان معناه ان الله تبارك وتعالى دنا من محمد صلى الله عليه وسلم فتدلی یعنی حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ ثم دنا فتدلی کا معنی یہ ہے کہ رب تعالیٰ کا جلوہ نبی کریم کے قریب ہوا۔ پھر اور زیادہ قریب ہوا۔ اسی موضوع (کہ نبی کریم کو رب کا قرب حاصل ہوا اور اللہ کا بلا کیف دیدار کیا) کو مفسر قرآن مفکر اسلام حضرت پیر محمد کرم شاہ صاحب مدظلہ العالی نے اپنی تفسیر ضیاء القرآن میں بڑی بساطت سے بیان فرمایا۔ مکمل تفسیر کوئی دیکھنا چاہے تو تفسیر ضیاء القرآن کا مطالعہ کرے انشاء اللہ منصف مزاج کے دل کو تسکین ہوگی نسبت اس میں سے کچھ حصہ من وعن پیش کر رہا ہوں تاکہ اس موضوع کو سمجھنا آسان ہو جائے عن ابن عباس ما كذب الغوادر وما رأى ولقد سمأه نزلت اخذى قال سمأه بغوادره مرتين رواه مسلم

ترجمہ حضرت ابن عباس نے ان آیات کے بارے میں فرمایا کہ حضور نے اپنے رب کا دیدار اپنے دل کی آنکھوں سے دو مرتبہ کیا۔ امام ترمذی روایت کرتے ہیں قال ابن عباس راى محمد صلى الله عليه وسلم

ربہ قال عکرمۃ قلت ایس اللہ یقول لا تدسکۃ الابصار
وهو یدرک الابصار قال ویجک ذاک اذا تجلی بنورہ
الذی ہونورہ وقد رأی ربہ مرتین ترجمہ
حضرت ابن عباس نے فرمایا کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے
رب کا دیدار کیا۔ عکرمہ (آپ کے شاگرد) کہتے ہیں کہ میں نے عرض کیا کہ کیا
اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد نہیں لا تدسکۃ الابصار وهو یدرک
الابصار کہ آنکھیں اس کا ادراک نہیں کر سکتیں آپ نے فرمایا افسوس
تم سمجھے نہیں یہ اس وقت ہے جبکہ وہ اس نور کے ساتھ تجلی فرماتے جو اس
کا نور ہے حضور نے اپنے رب کو دو مرتبہ دیکھا حضرت شیخ عبدالحق محدث
دہلوی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں۔

ابن عمر دریں مسئلہ راجعت ہوئے کردہ پر سید کہ ہل رائی
محمد ربہ پس گفت راہ پس ابن عمر تسلیم نمودہ و قطعاً براہ
تردد انکار نرفتہ۔ (اشعۃ اللمعات چہارم ص ۳۳)

ترجمہ حضرت ابن عمر نے حضرت ابن عباس سے اس مسئلہ کے
بارے میں رجوع کیا اور پوچھا کیا حضور نے اپنے رب کا دیدار کیا تو آپ نے دیکھا پھر
ابن عمر نے ان کے اس قول کو تسلیم کیا اور تردد و انکار کا راستہ اختیار
نہیں کیا۔ علامہ بدرالدین عینی شرح بخاری میں مندرجہ ذیل روایات
نقل کرتے ہیں رومی ابن خزیمہ باسناد قوی عن
النس قال سمعی محمد ربہ وبہ قال سائر اصحاب
ابن عباس و کعب الاخبار والزہری وصاحبہ
معمر۔ ترجمہ ابن خزیمہ نے قوی سند سے حضرت انس رضی
اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ آپ نے کہا حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام
نے اپنے رب کو دیکھا اسی طرح ابن عباس کے شاگرد کذب اخبار زہری

اور محمد کہا کرتے تھے۔ اخرج النسائی باسناد صحیح وصحیحہ الحاکم ایضاً من طریق
عکرمۃ عن ابن عباس ان تجبسون ان تكون الخلة لابن اہیم والكلام لموسی
والروایۃ لمحمد صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم۔ یہ روایت نسائی نے سند
صحیح کے ساتھ اور حاکم نے بھی صحیح کے ساتھ عکرمہ کے واسطے سے حضرت ابن عباس
سے نقل کی ہے۔ آپ کہا کرتے کہ کیا تم لوگ اس پر تعجب کرتے ہو کہ خلعت کا
مقام ابراہیم علیہ السلام کے لئے اور کلام کا شرف موسیٰ علیہ السلام کے لئے اور
دیدار کی سعادت محمد رسول اللہ کیلئے ہو۔ امام مسلم حضرت ابوذر سے روایت کرتے
ہیں۔ قال سألت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم هل رأیت ربک قال نونی
اراه اس لفظ کو دو طرح سے پڑھا گیا ہے نورانی اراہ اور دوسرا نورانی اراہ
پہلی صورت میں اس کا معنی یہ ہوگا۔ ابوذر کہتے ہیں میں نے رسول اللہ صلی اللہ
علیہ وسلم سے پوچھا کیا حضور نے اپنے رب کا دیدار کیا ہے آپ نے فرمایا وہ نور
ہے میں اسے کیونکر دیکھ سکتا ہوں۔ دوسری صورت میں معنی یہ ہوگا کہ وہ سراپا نور
ہے میں نے اسے دیکھا۔ مسلم کے اسی صفحہ پر ایک روایت ہے۔ عن
عبد اللہ بن شقیق قال قلت لابی ذر لو رأیت رسول اللہ صلی اللہ
علیہ وسلم فسألتہ فقال عن ای شیئ کنت تسأله قال کنت
اسأله هل رأیت ربک قال ابوذر قد سألتہ فقال رأیت نوراً
کہ میں نے نور دیکھا ہے یہ روایت بھی دوسری توجیہ کی تائید کرتی ہے۔

حکى عبد الزقاق عن معمر عن الحسن انه حلف ان محمد
رأى ربہ (عمدة القاسمی ص ۱۹ جلد ۱۹)

حسن بصری اس بات پر قسم کھاتے تھے کہ حضور نے اپنے رب کا دیدار کیا
واخرج ابن خزیمہ عن عروہ بن زبیر اشبانا عروہ بن زبیر
سے ابن خزیمہ نے نقل کیا ہے کہ وہ بھی روایت کے قائل تھے۔ علامہ
ابن حجر نے امام احمد کے بارے میں لکھا۔ فروی الخلال فی کتاب السنۃ

عن المروزی قال قلت لأحمد بن محمد بن یساقولون ان عائشة قالت
من ثم ان محمد بن ربه وقد اعظم على الله الفرية فبای
شیء یرفع قولها قال بقول النبی صلی الله تعالی علیه وسلم
رأیت ربی - قول النبی صلی الله تعالی علیه وسلم اکبر من
قولها - (فتح الباری ص ۴۹۴ جلد ۸) ترجمہ

مروزی کہتے ہیں کہ میں نے امام احمد سے کہا کہ لوگ کہتے ہیں ام المومنین یہ کہا
کرتیں کہ جس نے یہ کہا کہ حضور نے اپنے رب کو دیکھا ہے تو اس نے اللہ تعالیٰ
پر بڑا بہتان باندھا ہے تو حضرت عائشہؓ کے لکایا جواب دیا جائے گا آپ نے
فرمایا حضور کے اس ارشاد کے ساتھ رایت ربی کہ میں نے اپنے رب کو دیکھا
حضرت عائشہ کے قول کا جواب دیں گے۔ اور حضور کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا
ارشاد حضرت عائشہ کے قول سے بہت بڑا ہے یہ مختلف اقوال ہیں جو قائلین روایت
کی طرف سے بطور استدلال پیش کئے جاتے ہیں ان میں فحول صحابہ مثلاً ابن عباس
کعب - اجبار - انس - ابی ذر کے علاوہ کبار تابعین عروہ، بن زبیر، حسن بصری، عکرمہ
جیسے اکابر تابعین بھی موجود ہیں حضرت امام احمد کا قول بھی آپ پڑھ چکے ہیں ان اقوال
کے علاوہ متعدد احادیث بھی ذکر کی گئی ہیں ان تمام دلائل کو بالتفصیل پیش
کر نیچے بعد علامہ نووی لکھتے ہیں اذا صحت الروایات عن ابن عباس

فی اثبات الرؤیہ وجب المصیر علی اثباتها فانها لیست مما یدرك
بالعقل ویؤخذ بالظن فانما یتلقى بالسماع ولا یتجیز احد
ان یظن باین عباس انه متکلم بهذه المسئلة بالظن
والاجتهاد ثم ان ابن عباس اثبت شیئاً نقاه غیره والمثبت
مقدم علی النافی - ترجمہ - حضرت ابن عباس سے جب صحیح روایات ثبوت
کو پہنچ گئیں کہ انہوں نے ایسا کہا ہے تو اب ہم یہ خیال نہیں کر سکتے کہ آپ نے
اتنی بڑی بات محض اپنے قیاس اور ظن کے بنا پر کہی ہو لہذا انہوں نے کسی

مرفوع حدیث کی بنا پر ایسا کہا ہو گا نیز ابن عباس اس ایک چیز کو ثابت کر رہے ہیں دوسرے
حضرات نفی کر رہے ہیں اور یہ قاعدہ ہے کہ مثبت کا قول نافی پر مقدم ہوتا ہے خلاصہ
کلام کو علامہ نووی اس طرح بیان کرتے ہیں - الحاصل ان الراحم
عند اکثر العلماء ان رسول الله صلی الله تعالیٰ علیہ وسلم
رأی ربہ بعینی راسہ لیلۃ الاسراء و هذا مما لا ینبغی
ان یتشکک فیہ - کہ حاصل بحث یہ ہے کہ اکثر علماء کے نزدیک صحیح قول
یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے شب معراج اللہ تعالیٰ کو اپنے
سر کی انگلیوں سے دیکھا اور اس میں کوئی شک کی گنجائش نہیں علامہ نووی نے
یہ بھی کہا ہے کہ حضرت ابن مسعود اور حضرت صدیق نے اپنے موقف کی تائید میں
کوئی حدیث مرفوع پیش نہیں کی لیکن بعض نے اپنے قیاس اور اجتہاد سے کام لیا
اس پر علامہ ابن حجر نے کہا کہ صحیح مسلم جس کی شرح علامہ نووی کر رہے ہیں
اسی کے لگے صفحہ پر حدیث مرفوع موجود ہے ام المومنین نے فرمایا کہ میں ولقد راہ
بالافق المبین اور ولقد راہ نزلة الخمری کے بارے میں حضور سے پوچھا تو حضور
نے فرمایا وہ جبرائیل امین تھے جب مسلم میں یہ حدیث موجود ہے تو حیرت ہے
کہ شارح مسلم علامہ نووی نے کیسے انکار کیا

علامہ ابن حجر کے اس اعتراض کا جواب یہ ہے کہ حضرت صدیق نے و
لقد راہ بالافق المبین کے بارے میں حضور سے استفسار کیا اور
حضور نے فرمایا کہ وہ جبرائیل ہیں اور یہ بلاشبہ درست ہے کیونکہ یہ آیت مژدہ تکریر
کی ہے اور وہاں حضرت جبرائیل کا ہی ذکر ہے - ارشاد ہے وانه لقول
رسول کریم ذی قوۃ عند ذی العرش مکین مطاع
ثم امین وما صا - بکم بمجنون ولقد راہ بالافق
المبین - یہ سارا ذکر جبرائیل امین کا ہے ہم پہلے بتا آئے ہیں (ضیاء القرآن
میں دیکھیں) کہ حضور کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جب انہیں ان کی اصلی صورت

دیکھنے کی خواہش کی تو آپ آسمان کے افق پر نمودار ہوئے۔ وہ افق جہاں جبرائیل نمودار ہوئے اسے افق مبین کہا گیا ہے لیکن یہاں جس افق کا ذکر ہو رہا وہ ہوا بالا فوق الاعلیٰ ہے۔ آسمان اور زمین کے افق کو افق مبین تو کہہ سکتے ہیں لیکن افق اعلیٰ وہ ہوگا جو تمام آفاق سے بلند تر ہو یعنی فلک الافلاک کا کنارہ۔ اس لئے امام نووی کا قول ہی درست ہے کہ شب معراج نفی رکوعیت کے بارے میں کوئی حدیث مرفوعہ نہیں ہے علامہ سید محمد آلو سی بغدادی رحمۃ اللہ علیہ ان آیات کی تشریح و تفسیر سے فارغ ہونے کے بعد دیدار الہی کے بارے میں اپنی ذاتی رائے کو یوں پیش کرتے ہیں وانا اقول بروایت صلی اللہ علیہ وسلم ربہ سبحانہ و بدنوہ منہ سبحان علی الوجہ اللائق (روح المعانی) اور میں یہ کہتا ہوں کہ سرور عالم اپنے رب کریم کے دیدار سے مشرف ہوئے اور حضور کو قرب الہی نصیب ہوا لیکن اس طرح جیسے اس کی شان کبریائی کے لائق ہے حضرت امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ سے جب دریافت کیا جاتا کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اپنے رب کا دیدار کیا تو آپ جواب میں فرماتے رہ راہ حتیٰ ینقطع نفسہ (روح المعانی) ہاں حضور نے اللہ تعالیٰ کو دیکھا ہاں حضور نے اللہ تعالیٰ کو دیکھا۔ یہ جملہ اتنی بار دہراتے کہ آپ کا سانس ٹوٹ جاتا مولانا سید النور شاہ کشمیری صاحب اس مسئلے پر مکمل بحث کر چکے بعد رقمطراز ہیں و لکنہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ والہ وسلم تشریف بروایت تعالیٰ و من علیہ ربہ بہا و کرمہ و تفضل علیہ بنوالہ و افاض علیہ من افضالہ فراہ فراہ کما قال احمد رحمۃ اللہ مرتین الا انہ راہ کما یرى الحبيب الى الحبيب والعبد الى مولاه لاهو يملك ان يكف عنه نظره ولا هو يستطيع ان يشخص اليه بصره وهو قوله تعالى ما زاغ البصر وما طغى (فیض الباری) شرح البخاری

حضور صلی اللہ علیہ وسلم دیدار الہی سے مشرف ہوئے اللہ تعالیٰ نے اس دولت سرمدی سے آپ کو نوازا اور اپنے فضل و احسان سے عزت افزائی پس حضور نے اللہ تعالیٰ کو دیکھا جس طرح امام احمد نے فرمایا ہے مگر یہ دیدار الہی تھا جیسے حبیب اپنے حبیب کا دیدار کرتا ہے نہ وہ آنکھیں بند کرنے کی قدرت رکھتا ہے اور نہ ہی اس میں یہ طاقت ہوتی ہے کہ کٹنگی باندھ کر دے دلا کر کو دیکھتا رہے اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کا یہی مفہوم ہے۔ ما زاغ البصر وما طغى (اشتہی) مندرجہ بالا مضمون کی وضاحت سے یہ سمجھنا مشکل نہ رہا کہ النعم سے مراد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہیں آپ کو تارا کہا گیا ہے لہذا پیارا چمکتا ہوا تارا کہلاتا صحیح ہے اسی طرح آپ کو رب کا قرب حاصل ہوا اسی وجہ سے شہد فی فتدتی کا ترجمہ عمودہ جلوہ نزدیک ہوا پھر خوب اتر آیا یہی ترجمہ صحیح ہے ایسے ہی ولقد راہ منزلة اخرى کا ترجمہ اور انہوں نے تو وہ جلوہ دو مرتبہ دیکھا یہ ترجمہ ہی تفسیر اور حدیث کے مطابق ہے اور اسی میں نبی کریم کی شان کا لحاظ کیا گیا ہے۔

فَيَا أَيُّهَا النَّاسُ بَلِّغُوا رُسُلَكُمْ (پتا ع)

اب تو کیا کیا نعمتیں اپنے رب کی جھٹلائے گا۔ (مولانا محمد الحسن)
اب تو کیا کیا نعمتیں اپنے رب کی جھٹلاوے گا۔ (شاہ عبدالقادر)
سو تو اپنے پروردگار کی کن کن نعمتوں میں شک کرتا رہیگا (عبدالماجد دریا آبادی)
سو تو اپنے رب کی کون کونسی نعمت میں شک کرتا رہیگا (مولانا اشرف علی)
تو اسے سننے والے اپنے رب کی کون سی نعمتوں میں شک کر ہیگا (اعلیٰ حضرت)

اس مقام پر اعلیٰ حضرت نے اسے سننے والے الفاظ کا اضافہ کیا لیکن دیگر ترجمین نے ان الفاظ کا اضافہ نہیں کیا دیگر مترجمین کے تراجم سے شک کر نیکی نسبت نبی کریم کی طرف نظر آتی ہے کیونکہ قرآن پاک کے براہ راست

مخاطب نبی کریم میں حالانکہ نبی کریم کی طرف نسبت غلط ہے۔ اعلیٰ حضرت کے ترجمہ
پر تائید تفسیر میں موجود ہے۔ کیونکہ ان الفاظ کی زیادتی کے بغیر ترجمہ ادب و احترام
کے منافی ہے تفسیر جلالین میں ہے۔ فبای الاعداء بانعمہ الدالة
علی وحدانیته و قدرته تتماری تشک ایھا الانسان۔ اے انسان
تو اللہ تعالیٰ کی کون کون سی نعمتوں میں شک کریگا جو نعمتیں اللہ تعالیٰ کی وحدانیت
اور قدرت پر وال ہیں۔ تفسیر مدارک میں ہے فبای الاعداء ایھا الخطاب
تتماری تشک بما اولک من النعماء سننے والے مخاطب
تو اللہ تعالیٰ کی کون کون سی نعمتوں میں شک کریگا۔ روح المعانی میں ہے
وقیل الانسان علی الاطلاق وهو اظهر یہاں مطلق خطاب عام
انسان کو ہے اور یہی قول زیادہ مناسب ہے تفسیر کے ان بیانات سے
یہ واضح ہوا کہ اعلیٰ حضرت کا ترجمہ ہی شان بنی الانبیاء کا پاسدار ہے جبکہ دیگر
تراجم اس منصب جلیل سے خالی ہیں۔

الرَّحْمَنُ عَلَّمَ الْقُرْآنَ خَلَقَ الْإِنْسَانَ عَلَّمَهُ الْبَيَانَ (۶۲)

رحمن نے سکھایا قرآن بنایا آدمی پھر سکھایا اس کو بات کرنا (مولانا محمد الحسن)
رحمن نے سکھایا قرآن پیدا کیا آدمی کو سکھایا اس کو بولنا
(شاہ رفیع الدین)
خدا جو نہایت مہربان اسی نے قرآن کی تعلیم فرمائی اسی نے
انسان کو پیدا کیا اسی نے اس کو بولنا سکھایا (مولانا فتح محمد)
رحمن نے سکھایا قرآن۔ بنایا آدمی پھر سکھائی اس کو بات (شاہ عبدالقادر)
رحمن نے قرآن کی تعلیم دی اس نے انسان کو پیدا کیا اس کو گویائی
سکھائی۔ (مولانا اشرف علی)
نہایت مہربان (خدا) نے اس قرآن کی تعلیم دی ہے اسی

نے انسان کو پیدا کیا اور اسے بولنا سکھایا (مولانا مودودی)
خدا نے رحمن ہی نے قرآن کی تعلیم دی اسی نے انسان کو پیدا کیا
اس کو گویائی سکھائی۔ (عبدالماجد دریا آبادی)
رحمن نے اپنے محبوب کو قرآن سکھایا انسانیت کی جان محمد کو پیدا کیا۔ مہر
کان و مایکون کا بیان انہیں سکھایا۔ (اعلیٰ حضرت)
اعلیٰ حضرت کے ترجمہ سے واضح ہو رہا ہے کہ علم کا ایک مفعول
محذوف ہے اس سے مراد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ یعنی رحمن نے
اپنے محبوب کو قرآن سکھایا۔ اسی طرح اعلیٰ حضرت کے ترجمہ سے یہ پتہ چلتا ہے
کہ خلق الانسان میں انسان سے مراد بھی نبی کریم ہیں جو انسانیت کی جان ہیں۔
نبی کریم انسانیت کی جان ہیں اس کا اردو محاورہ میں ایک مطلب یہ ہے کہ آپ
تمام انسانوں کے محبوب ہیں اس پر بحث پیش لفظ میں گزر چکی ہے کہ آپ
کو محبوب ماننا ہی ایمان ہے اور آپ کو اپنے والدین، اولاد سے اور تمام
لوگوں سے زیادہ محبوب ماننا ایمان سے دوری کی علامت ہے انسان کی
جان کا دوسرا مطلب یہ ہے کہ آپ باعث تخلیق انسان ہیں۔ بلکہ آپ
باعث تخلیق کائنات ہیں جیسا کہ حدیث قدسی ہے لولاک لما
خلقت الافلاك۔ اے محبوب اگر آپ نہ ہوتے تو یہ کائنات
کا معرض وجود میں آنے کا نظم و نسق قائم نہ ہوتا۔ لطف کی بات یہ ہے کہ
اس حدیث کو مولانا حسین احمد مدنی نے الشہاب الثاقب میں صحیح
قرار دیا ہے آپ کا اصل کائنات ہونا انسانیت کی جان ہونے میں
کوئی استحالہ نہیں۔ اسی طرح روح المعانی پک میں ہے العالَم
جسد و روح النبوة ولا قیام للجسد بدون روح
تمام جہان ایک جسم ہے اور نبی کریم اس کی روح ہیں جسم کا قیام بغیر
روح کے ممکن نہیں پتہ چلا کہ نبی کریم کائنات کی جان ہیں اسی طرح اعلیٰ حضرت

کے ترجمہ سے یہ واضح ہوا کہ علم البیان کا مطلب یہ ہے کہ حبیب پاک
علیہ النجۃ والثناء کو ماکان و مایکون کا علم عطا کیا گیا لیکن دیگر مترجمین اپنے تراجم
میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اس شان کو بیان کرنے سے قاصر رہے۔ اور
تین طرح کا جو فرق پیش کیا گیا ہے اس کو تفاسیر کی روشنی میں پیش کیا جا رہا
ہے تاکہ تفاسیر سے بے خبر لوگوں کے اس اعتراض کی حقیقت بے نقاب ہو جائے
جو اپنی کم علمی کی وجہ سے اعلیٰ حضرت کے ترجمہ پر ان الفاظ میں اعتراض کرتے ہیں
"اس بجز انسانیت کی جان ماکان و مایکون کسی قرآنی لفظ کا ترجمہ نہیں
فاضل بریلوی نے الفاظ اپنی تسکین طبع کیلئے ناجائز طور پر قرآنی ترجمہ میں سمویئے
آئیے ملاحظہ فرمائیں کہ اعلیٰ حضرت کے تائید میں تفاسیر کس طرح
ماکان و مایکون کے علم کو پیش کر رہی ہیں اور انسان سے بھی نبی محترم علیہ
الصلوة والسلام مراد ہیں۔ روح المعانی میں ہے۔ ونصبہ (ای القمان)
علیٰ انہ مفعول ثانٍ بعد مفعولہ الاول محذوف۔ آپ
فرماتے ہیں کہ لفظ القرآن پر نصب اس وجہ سے ہے کہ علم کا یہ مفعول ثانی ہے
اور پہلا مفعول محذوف ہے اس سے آگے اقوال بیان کرتے ہوئے ایک
قول نقل فرماتے ہیں۔ وقیل محمد صلی اللہ علیہ وسلم یعنی وہ
پہلا مفعول جس کو قرآن سکھایا وہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ اور ذکر کیا
وقال ابن کثیر الانسان محمد صلی اللہ علیہ وسلم کہ خلق الانسان
میں انسان سے مراد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہیں علم البیان میں بیان سے مراد
قرآن پاک ہے جس میں ماکان و مایکون کا علم انزل سے ابد تک موجود ہے جو
پہلے انبیاء کرام کے ذکر و بیان کے مطابق ان کے احوال پر مشتمل ہے لوگوں
کیلئے ہدایت اور آپ کی نبوت پر نشانی ہے۔ الجامع لاحکام البیان للبقرطبی
میں ہے۔ علم البیان وعن ابن عباس وایضا عن ابن کثیر
الانسان ہمنایراد بہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم۔ یعنی
علم البیان میں ضمیر منصوب کا مرجع نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ کہ بیان
سکھایا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو۔ والبیان بیان المحلل والمحرر

فی القرآن وقال ابن عباس لو ضاع لی عقل بعیر لوجدت
فی کتاب اللہ تعالیٰ وقال المرسی جمع القرآن علوم
الاولین والآخرین۔ یعنی قرآن پاک تمام چیزوں کے علوم پر مشتمل ہے
اور قرآن پاک ہمیں ہر چیز کا علم بتاتا ہے لیکن ہمارا اپنا علم قرآن پاک کو مکمل سمجھنے سے
قاصر ہے حضرت ابن عباس فرماتے ہیں کہ اگر میرے اونٹ کی رسی گم
ہو جائے تو میں اسے بھی کتاب اللہ کی راہنمائی میں تلاش کر لوں۔ اور
مرسی کہتے ہیں کہ قرآن پاک اولین و آخرین کے علوم کا حامل ہے اور علامہ ابوی
فرماتے ہیں۔ ولعل ابن کثیر یقدر مفعول علم الانسان
مراد ابیہ النبی صلی اللہ علیہ وسلم۔ یعنی ابن کثیر کی مراد شائد یہ
ہو کہ علم کا مفعول مقدر ہے وہ ہے الانسان اور اس سے مراد نبی کریم صلی
اللہ علیہ وسلم ہی ہیں۔ اسی طرح قاضی ثناء اللہ دہلوی پتی تفسیر مظہری میں بیان فرماتے
ہیں۔ وجاز ان یقال خلق الانسان یعنی محمد صلی اللہ علیہ
وسلم علم البیان یعنی القرآن فیہ بیان ماکان و مایکون
من الانزل الی الابد مطابقا لبيان من مضی من التورہ والفرقان
للناس وأیة علی نبوتہ۔ جائز ہے کہ یہ کہا جائے کہ خلق الانسان میں
انسان سے مراد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہیں علم البیان میں بیان سے مراد
قرآن پاک ہے جس میں ماکان و مایکون کا علم انزل سے ابد تک موجود ہے جو
پہلے انبیاء کرام کے ذکر و بیان کے مطابق ان کے احوال پر مشتمل ہے لوگوں
کیلئے ہدایت اور آپ کی نبوت پر نشانی ہے۔ الجامع لاحکام البیان للبقرطبی
میں ہے۔ علم البیان وعن ابن عباس وایضا عن ابن کثیر
الانسان ہمنایراد بہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم۔ یعنی
علم البیان میں ضمیر منصوب کا مرجع نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ کہ بیان
سکھایا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو۔ والبیان بیان المحلل والمحرر

والهدی من الضلال وقيل ما كان وما يكون لانه بين عن
 الاولين والآخرين ويوم الدين اور علم البيان میں بیان سے مراد
 یا تو حلال و حرام کا علم اور گمراہی سے ہدایت دینا اور یا بطرح بیان کیا گیا ہے
 کہ بیان سے مراد ماکان و ما یكون کا علم ہے کیونکہ حبیب پاک علیہ الخیرۃ و النشا
 نے اولین و آخرین اور قیامت کا ذکر فرمادیا ہے جب آپ جمع گزرے ہوئے
 اور آنیوالے اور واقعات قیامت سے مطلع فرمادیا تو آپ کو ماکان و ما یكون
 کا علم حاصل ہے الوجیز للواحدی میں ہے الرحمن علم القرآن ای علم
 نبی القرآن لیس کما یقول المشرکون انما یعلمہ بشر
 خلق الانسان یعنی النبی صلی اللہ علیہ وسلم علمہ البیان
 یعنی القرآن الذی فیہ بیان کل شیء - یعنی الرحمن علم القرآن کا
 مطلب یہ ہے کہ رحمن نے اپنے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو قرآن سکھایا
 ایسا نہیں جیسا مشرک کہا کرتے تھے کہ ان کو کوئی بشر قرآن سکھاتا ہے اور
 خلق الانسان میں انسان سے مراد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہیں علم البیان
 میں بیان سے مراد قرآن پاک ہے جس میں ہر چیز کا بیان موجود ہے یعنی
 ماکان و ما یكون کے بیان پر مشتمل ہے سراج المنیر میں اس طرح بیان کیا
 گیا ہے - وعن ابن عباس ایضا وابن کسیر السمراد
 بالانسان ههنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم
 والمراد من البیان الحلال والحرام والهدی من
 الضلال وقيل ما كان وما يكون لانه بین عن الاولین
 والآخرین وعن يوم الدين حضرت ابن عباس اور
 ابن کسیر سے اس طرح مروی ہے کہ الانسان سے مراد یہاں
 نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہیں اور بیان سے مراد حلال و حرام اور
 گمراہی سے ہدایت دینے کا بیان مراد ہے اور یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ

بیان سے مراد ماکان و ما یكون کا علم ہے اس لئے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم
 نے سب سے پہلے اور پچھلے لوگوں کا بیان فرمایا اور واقعات قیامت سے مطلع
 فرمایا لہذا یہ ماکان و ما یكون کا علم ہی ہے تفسیر حسینی میں اس طرح ذکر کیا گیا ہے
 علم القرآن بیا مختہ است قرآن مر حبیب خود را علمہ
 البیان بوجود آمد و محمد را دیا موزا پسند و پرا بیان آنچہ
 بود و بہت و باشد چنانچہ مضمون فحمت علم الاولین والاخرین ازین محنی خبر میدہد
 یعنی تفسیر حسینی میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ علم القرآن سے مراد یہ ہے کہ رحمن نے اپنے
 حبیب کو قرآن سکھایا - یہاں اس پریشانی کا حل بھی موجود ہے کہ اعلیٰ حضرت محبوب
 کیوں ذکر کرتے ہیں علم البیان نبی کریم کو معرض وجود میں لایا اور آپ کو بیان سکھایا
 یعنی جو ہو چکا موجود ہے اور ہو گا سب کا علم عطا کیا (ماکان نکات ترجمہ صاحب حسینی
 نے بود سے کیا اور ما یكون کا ترجمہ است اور باشد سے کیا) اس پر نبی کریم کا
 ارشاد دال ہے کہ مجھے تمام پہلوں اور پچھلوں کا علم عطا کیا گیا ہے تفسیر جمل میں ہے
 وقيل اراد بالانسان محمد صلی اللہ علیہ وسلم علمہ
 البیان یعنی بیان ما یكون و ما کان لانه صلی اللہ علیہ وسلم
 ینبئ عن خبر الاولین والاخرین وعن يوم الدين - بیان کیا
 گیا ہے کہ انسان سے مراد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہیں اور علم البیان کا مطلب
 یہ ہے کہ آپ کو ماکان و ما یكون کا علم دیا گیا ہے کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم
 نے تمام پہلے اور آنیوالے لوگوں کے حالات سے مطلع فرمایا اور واقعات
 قیامت کا تذکرہ فرمایا - اب ان مذکورہ تفاسیر کے بیان میں یہ سمجھنا آسان
 ہو گیا کہ اعلیٰ حضرت کا ترجمہ تفاسیر کے مطابق ہے - ذاتی رائے نہیں - ہاں
 البتہ آپ کے ترجمہ کو مورد الزام ٹھہرانے والوں کو پریشانی صرف اس بات
 کی ہے کہ نبی کریم کی شان کو آپ نے اردو خواں کے سامنے کیونکر واضح کر
 دیا - کیونکہ آپ کی یہ شان تو معتبر تفاسیر میں موجود ہے جو ضخیم ہونے کی وجہ سے

عام آدمی کی وسعت میں نہیں کہ خرید سکے اور ہر آدمی کا ان کو سمجھنا بھی مشکل ہے اس لئے اردو مترجمین کے اذہان میں جس شان مصطفیٰ علیہ التحیۃ والثناء کو پوشیدہ رکھنا مقصود تھا اسکو اعلیٰ حضرت نے مختصر مگر جامع انداز میں سمجھا دیا یہی پریشانی کا سبب بنا اور اعلیٰ حضرت کے ترجمہ کو ذاتی رائے اور بے ہودہ الفاظ سے ان کا ذکر کرنا شروع کیا۔ لیکن حقیقت آشکارا ہوئے بغیر نہیں رہ سکتی۔ اسی وجہ سے معتبر تفسیر سے اس مسئلہ کو واضح کر دیا۔ اب اگر نبی کریم کی شان کسی کو ناپسند آئے تو ہمیں اس سے کیا غرض یہ تو اپنے اپنے نصیب کی بات ہے

فَاتَاهُمُ اللَّهُ مِنْ حَيْثُ لَمْ يَحْتَسِبُوا (پہم)

پھر پہنچا ان پر اللہ جہاں سے ان کو خیال نہ تھا۔ (مولانا محمود الحسن)

پھر پہنچا ان پر اللہ جہاں سے ان کو خیال نہ تھا۔ (شاہ عبدالقادر)

سوان پر خدا ایسی جگہ سے پہنچا کہ انکو خیال بھی نہ تھا۔ (مولانا اشرف علی)

مگر اللہ ایسے رخ سے ان پر آیا جدھر انکا خیال بھی نہ تھا۔ (مردوری)

مگر خدا نے انکو وہاں سے آیا جہاں سے ان کا گمان بھی نہ تھا (فتح محمد)

تو اللہ کا حکم انکے پاس آیا جہاں سے انکا گمان بھی نہ تھا۔ (اعلیٰ حضرت)

اللہ تعالیٰ آنے جانے سے پاک ہے یہ الفاظ اللہ تعالیٰ آگیا یہ

اس کی شان کے لائق نہیں۔ اسی وجہ سے اعلیٰ حضرت نے مقصد کو اپنے ترجمہ سے واضح کر دیا اور وہ الفاظ استعمال فرمائے جو اللہ تعالیٰ کی شان کے لائق

ہیں اور مقصد بیان کے مطابق بھی اعلیٰ حضرت کے ترجمہ کی برتری تفسیر

سے بہت زیادہ روشن ہے۔ جلالین میں ہے۔ فاتھم اللہ امرہ وعذابہ

کہ اللہ کا حکم اور عذاب ان کے پاس آیا۔ مدارک میں ہے۔ فاتھم اللہ

ای امر اللہ و عقابہ۔ یعنی ان کے پاس اللہ تعالیٰ کا امر اور عذاب آیا تفسیر

کبیر میں ہے فی الایۃ وجہان الاول ان یکون الضمیر فی قولہ

فَاتَاهُمُ اللَّهُ مِنْ حَيْثُ لَمْ يَحْتَسِبُوا فَاتَاهُمُ اللَّهُ مِنْ حَيْثُ لَمْ يَحْتَسِبُوا
یعنی اس آیت کے ترجمہ میں دو احتمال ہیں ایک یہ کہ فاتھم میں ضمیر کا مرجع یہود و نصاریٰ تو اب
معنی یہ ہوگا کہ ان کے پاس اللہ کا عذاب اور اس کی گرفت آئی جہاں سے ان کو
گمان بھی نہ تھا۔ اور دوسری وجہ یہ ہے کہ ضمیر کا مرجع مومنین ہوں تو اس صورت
میں معنی یہ ہوگا کہ اللہ ان کو اور تقویت ان کے پاس آئی جہاں سے ان کو گمان
بھی نہ تھا اب ترجمہ فرمائیں کہ اعلیٰ حضرت کا ترجمہ کتنا شاندار ہے۔ کہ اللہ کا حکم انکے
پاس آیا۔ حکم کا لفظ علامہ رازی رحمۃ اللہ کی دونوں توجیہات کو شامل ہے
اس سے آگے علامہ رازی نے فیصد ہی فرما دیا کہ یہ کہنا غلط ہے کہ اللہ ان کے
پاس پہنچا۔ بیان کرتے ہیں۔ فاتھم اللہ لا یمکن احراہ علی ظاہرہ
باتفاق جمہور العقلاء فدل علی ان باب التاویل
مفتوح وان صرف الایات عن ظواہرہا بمقتضی الدلائل
العقلیۃ جائز۔ یعنی جمہور عقلاء کا اتفاق ہے کہ فاتھم اللہ
کا ظاہر ہی معنی لینا کہ اللہ ان کے پاس پہنچا یہ ممکن ہی نہیں۔ تاویلات کا دروازہ
کھلا ہوا ہے اس ضابطہ کے مطابق تاویل کرنی ضروری ہوتی اور آیات کو دلائل عقلیہ
کے پیش نظر ظاہر سے پھیرنا جائز ہے۔

الْبَارِئُ الْمُصَوِّرُ (پہم)

نکال کھڑا کر نیوالا، صورت کھینچنے والا۔ (محمود الحسن)

نکال کھڑا کرتا، صورت کھینچتا۔ (شاہ عبدالقادر)

پیدا کر نیوالا ہر ایک کو صورت دینے والا۔ (اعلیٰ حضرت)

اعلیٰ حضرت کا ترجمہ فصاحت و بلاغت میں یکتا اور مقصود کو سمجھانے میں اپنی مثال

آپ ہی ہے۔ کیونکہ نکال کھڑا کرنا۔ وضاحت سے خالی ہے اور ضروری نہیں کہ اس کو "پیدا کرنا والا" کے معنی میں استعمال کیا جائے کیونکہ نکال کھڑا کرنا کا معنی تو یہ بھی ہو سکتا ہے کہ کسی کو ایک علاقہ، ایک جگہ سے نکال کر دوسرے علاقہ اور دوسری جگہ میں بھیج دیا جائے۔ حالانکہ یہ مقصد ہی نہیں مقصد بیان تو پیدا کرنا والا ہی ہے اسی طرح المصوّر کے معنی صورت کھینچنے والا بھی کامل نہیں کیونکہ صورت کھینچنے والا تو فوٹو گرافر بھی ہوتا ہے بخلاف صورت دینے والا یہ کسی اور صورت میں استعمال نہیں صرف اسی صورت میں استعمال ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر ایک کو شکل و صورت عطا فرماتا ہے مدارک میں ہے الباری الموجد المصور فی الارحام یعنی الباری کا معنی معرض وجود میں لانیوالا اور المصور سے مراد ارحام میں یعنی شکم مادر میں صورت عطا فرمانے والا۔ یہ دونوں اللہ تعالیٰ کے صفاتی نام ہیں ان کا ترجمہ ایسا ہی کیا جائے جو رب قدوس کی شان کے لائق ہے۔

وَتَرْكُوكَ قَائِمًا (پ ۲۹)

اور تجھ کو چھوڑ جائیں کھڑا۔
 اور تجھ کو چھوڑ جاویں کھڑا۔
 اور آپ کو کھڑا ہوا چھوڑ جائیں۔
 اور تمہیں کھڑا ہوا چھوڑ دیا۔
 اور آپ کو کھڑا ہوا چھوڑ دیا۔
 اور تمہیں کھڑے کا کھڑا چھوڑ جاتے ہیں۔
 اور چھوڑ جاتے ہیں تجھ کو کھڑا۔
 اور تمہیں خطبے میں کھڑا چھوڑ گئے۔
 (مولانا محمود الحسن)
 (شاہ عبدالقادر)
 (اشرف علی)
 (مولانا مودودی)
 (عبدالماجد دریا آبادی)
 (فتح محمد)
 (شاہ رفیع الدین)
 (اعلیٰ حضرت)

اعلیٰ حضرت کا ترجمہ پوری تفصیل پر مشتمل ہے آیت کریمہ کے شان نزول اور اصلی صورت حال کی وضاحت کر رہا ہے جیسا کہ تفاسیر میں اس آیت کریمہ

کے شان نزول کو پیش کیا گیا ہے جلالین میں ہے۔ کان النبی صلی اللہ علیہ وسلم یخطب یوم الجمعة فنقدمت عیرو وضرب لحد ومھا الطبل علی العادة فخرج لها الناس من المسجد غیر اثنی عشر ساجدا فنزل۔ ایک مرتبہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جمعہ کے دن خطبہ دے رہے تھے کہ ایک قافلہ اونٹوں پر غلہ لایا اور اعلان کیلئے عادت کے مطابق دف بجائی گئی تو بارہ آدمیوں کے سوا باقی سب غلہ خریدنے کی غرض سے چلے گئے نبی کریم اسی طرح خطبہ کے حال میں کھڑے تھے و ترکو ک قائما فی الخطبة اور تمہیں خطبے میں چھوڑ کر چلے گئے۔ مدارک میں بھی اسی طرح ہے و ترکو ک علی المنبر قائما تخطب اور تمہیں منبر پر خطبے میں کھڑا چھوڑ کر چلے گئے۔ یہ مقصد اعلیٰ حضرت کے ترجمہ سے ہی واضح ہے جبکہ دیگر تراجم سے یہ نہیں پتہ چلتا کہ وہ کیسے حال میں نبی کریم کو چھوڑ گئے تھے

یَوْمَ یُكْشَفُ عَنْ سَاقٍ (پ ۲۹)

جس دن کہ کھولی جائے پنڈلی۔
 جس دن کھولی جاوے پنڈلی
 جس دن پنڈلی سے کپڑا اٹھا دیا جائیگا۔
 جس دن ایک ساق کھولی جائے گی۔ (جس کا معنی اللہ ہی جانتا ہے)
 (اعلیٰ حضرت)

اللہ تعالیٰ جسم اور اعضاء سے پاک ذات ہے اس لئے پنڈلی کھولنے کا کیا مقصد۔ اس پر مفسرین کرام نے بہت بحثیں کی ہیں جن کا لب لباب یہ ہے وان الایة من المعشابه (روح المعانی) کہ یہ آیت متشابہات سے ہے جس پر اتنا ہی ایمان کافی ہے کہ جو اللہ کی مراد ہے وہ حق ہے یعنی اس کا معنی اللہ ہی جانتا ہے۔ جلالین اور مدارک میں ہے کہ اس سے مراد شرکاء

ہے ہو عبارة عن شدة الامر يوم القيامة للحساب والجزاء
یعنی قیامت کے دن حساب و جزا کیلئے شدت امر ہے۔ اعلیٰ حضرت کا ترجمہ
جس دن ساق کھولی جائے گی (جس کا معنی اللہ ہی جانتا ہے) خوب تر ہے
کیونکہ ساق سے مراد کیا ہے اللہ ہی بہتر جانتا ہے مشابہات پر ایمان لانا
کہ ان کا معنی اللہ ہی جانتا ہے۔ مشابہات کے نزول میں یہی حکمت ہے
اس لئے ساق کا معنی پیٹ لگی کرنا اور اس کا کھولا جانا مقصود ہے اور نہ ہی اللہ تعالیٰ
کی شان کے لائق ہے۔

اِنَّ لَقَوْلِ رَسُولٍ كَرِيمٍ (پہلا)

یہ کہا ہے ایک پیغام لانیوالے سردار کا۔ (مولانا محمد الحسن)
یہ کہا ہے ایک پیغام لانیوالے سردار کا۔ (شاہ عبدالقادر)
یہ (قرآن) کلام الہی ہے فرشتہ کا لایا ہوا۔ (عبدالمجاہد دریا آبادی)
بے شک یہ قرآن ایک کرم والے رسول سے باتیں ہیں (اعلیٰ حضرت)
اعلیٰ حضرت کے ترجمہ میں یہ واضح ہے کہ ان کی ضمیر کا مرجع قرآن پاک
ہے اور رسول کریم سے مراد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جو سرا پاکرم ہیں لیکن دیگر
ترجمہ سے یہ مراد واضح نہیں کیونکہ یہ کہا "ترجمہ کرنا اس سے یہ نہیں پتہ چلتا
کہ مراد قرآن پاک ہے نہ ہی پیغام لانیوالے سردار سے پتہ چلتا ہے کہ اس سے
حبیب پاک علیہ التحیۃ والثناء میں جو کرم والے ہیں۔ جلالین میں ہے۔ اِنَّ اِيَّ
الْقُرْآنِ لَقَوْلِ رَسُولٍ كَرِيمٍ اِیْ قَالَ رِسَالَةً عَنْ اِلَهِ
سُبْحَانَهُ وَتَعَالٰی اِسْ پر جمل میں یہ بیان کیا گیا۔ کریم اِیْ
علی اللہ فہو فی غایۃ الکرم الذی ہو البعد عن
مساوی الاخلاق وھو محمد صلی اللہ علیہ وسلم
وقولہ قالہ رسالۃ اِیْ تبلیغ لاناہ وصف لہ کما انہ کذاک

اللہ تعالیٰ یعنی بے شک قرآن پاک کرم والے رسول پر اللہ نے نازل فرمایا اور
انہوں نے مخلوق پر پیش فرمایا۔ کریم سے مراد وہ بلند و بالا ذات جو بہت زیادہ کریم ہے
یعنی محمد صلی اللہ علیہ وسلم نبی کریم وہ قرآن اللہ کی طرف سے مخلوق پر پیش
فرمایا اصل میں ایک سوال کا جواب ہے کہ قرآن پاک تو اللہ کا کلام ہے اس
کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کلام کہنا کیسے صحیح ہے اس کا جواب یہ ہے
کہ قرآن پاک بلاشبہ اللہ کا کلام ہے لیکن اللہ نے نبی کریم پر پیش فرمایا یہ مراد
نہیں کہ آپ کا اپنا کلام ہے۔ توجہ فرمائیں کہ اعلیٰ حضرت کا ترجمہ کس طرح مقصد کے
مطابق اور واضح اور تفسیر سے کیسے مطابقت رکھتا ہے۔

لَا تَخْذُ نَامِنَهُ بِالْیَمِیْنِ ثُمَّ لَقَطَعْنَا مِنْهُ الْوَتِیْنِ (پہلا)

تو ہم پکڑ لیتے اس کا داہنا ہاتھ پھر کاٹ ڈالتے اس کی گردن۔ (مولانا محمد الحسن)
تو ہم پکڑتے اس کا داہنا ہاتھ پھر کاٹ ڈالتے اس کی ناک۔ (شاہ عبدالقادر)
تو ہم اس کا دایاں ہاتھ پکڑ لیتے اور رگ گردن کاٹ ڈالتے۔ (مورودی)
تو ہم اس کا داہنا ہاتھ پکڑ لیتے پھر ان کی رگ گردن کاٹ ڈالتے (فتح محمد)
البتہ پکڑتے ہم اس کا داہنا ہاتھ پھر کاٹ ڈالتے ہم اس سے
رگ گردن کی۔ (شاہ رفیع الدین)
ضرورت ہم ان سے بقوت بدلہ لیتے پھر ان کی رگ گردن کاٹ لیتے۔ (اعلیٰ حضرت)
اگرچہ دایمیں ہاتھ سے پکڑنا لغوی معنی درست ہے لیکن مراد یہی
ہے جو اعلیٰ حضرت نے ترجمہ کیا "قوت سے بدلہ لیتے" تفسیر کبیر میں ہے ان
الیمین بمعنی القوة والقدرة۔ یعنی یمین کا معنی قوت و قدرت
ہے۔ اعلیٰ حضرت نے وتین کا ترجمہ رگ گردن کیا ہے۔ اور باقی حضرات گردن ناٹ
رگ گردن۔ تفسیر کی رو سے اعلیٰ حضرت کا ترجمہ ہی اجماع ہے تفسیر کبیر میں ہے
الوتین هو العرق المتصل من القلب بالرأس الذی

اذا قطع مات الحيوان یعنی الوتین اس رگ کو کہتے ہیں جو دل سے سر تک جاتی ہے اس کو جو ب کاٹ دیا جائے تو حیوان مر جاتا ہے۔ مدارک میں ہے ہونیاط القلب اذا قطع مات صاحب وہ رگ دل ہے جس کی کاٹ دی جائے وہ مر جاتا ہے۔ جلالین میں ہے۔ الوتین نیاط القلب وهو عرق متصل به اذا انقطع مات صاحب رگ دل ہے جس کے کاٹنے سے موت واقع ہو جاتی ہے صراح میں نیاط القلب کا معنی رگ گردن کیا گیا ہے تفسیر کی مذکورہ عبارات سے اعلیٰ حضرت کے ترجمہ کی ہی برتری عیاں ہے۔

إِنَّا كُنَّا نَقْعُدُ مِنْهُ مَقَاعِدَ لِلسَّمْعِ (پ ۲۹ ع ۱)

اور یہ کہ ہم بیٹھا کرتے تھے ٹھکانوں میں سننے کے واسطے (مولانا محمد الحسن) اور جو کہ ہم پہلے آسمان میں سننے کیلئے کچھ موقعوں پر بیٹھا کرتے (اعلیٰ حضرت) اس جگہ منہا میں ضمیر کا مرجع السماء ہے جو انا لسمنا السماء میں پہلے آچکا ہے۔ مدارک میں بھی و انا کنا نقعد من السماء اعلیٰ حضرت کا ترجمہ اس مقصد کو واضح کر رہا ہے کہ جن پہلے آسمان میں سننے کیلئے کچھ موقعوں پر بیٹھا کرتے تھے۔ صرف ٹھکانوں میں سننا مقصد کو واضح نہیں کرتا

يَا أَيُّهَا الْمَرْءُ قُمْ اللَّيْلَ إِلَّا قَلِيلًا (پ ۲۹ ع ۱)

اے بھر مٹ ماننے والے کھڑا رہ رات کو مگر کسی رات (شاہ عبدالقادر) کھڑا رہ رات کو مگر کسی رات (مولانا محمد الحسن)

اے بھر مٹ مارنے والے رات میں قیام فرما سوا کچھ رات کے (اعلیٰ حضرت) اس جگہ آیت کریمہ کا مفہوم یہ ہے کہ نبی کریم کو اختیار دیا گیا کہ آپ رات کو عبادت فرمائیں اُدھی رات، یا اس سے کم یا اس سے زائد آپ کو اس میں

اختیار ہے۔ اعلیٰ حضرت کے ترجمہ سے یہ مقصد واضح ہے کہ آپ رات میں قیام فرمائیں سوا کچھ کے یعنی کچھ کے سوا سے کیا مراد ہے وہ اُدھی رات یا اس سے زائد یا اس سے کم۔ لیکن اگر یہ ترجمہ ہو کہ کھڑا رہ رات کو مگر کسی رات اس ترجمہ سے ہر وہ شخص جو اردو زبان سے واقف ہو گا وہ یہی سمجھے گا کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ کئی راتیں قیام کریں اور کئی راتیں قیام نہ کریں حالانکہ یہ مفہوم معتبر نہیں۔ اعلیٰ حضرت کا ترجمہ ہی مقصد کے مطابق ہے تمام تفاسیر اس مقصد کو ظاہر کر رہی ہیں جو اعلیٰ حضرت نے فرمایا۔ الاقلیلا استثناء من اللیل وقولہ تعالیٰ نصف بدل من قلیلا بدل الكل او النقص منه عطف علی امر السابق قلیلا ای نقصا قلیلا او مقدار اقلیلا بحیث لا یخط عن نصف النصف او زد علیہ عطف کما سبق وهو تخیرہ صلی اللہ علیہ وسلم بین ان یقوم نصف اللیل او اقل من النصف او اکثر (روح المعانی مختصراً) یعنی الاقلیلا، لیل سے مستثنیٰ ہے اور نصف قلیل سے بدل الكل ہے اور معطوف علیہ ہے او النقص اور اوزد علیہ اس کے معطوف ہیں یعنی وہ جو مستثنیٰ ہے وہ کیا ہے وہ نصف رات یا اس سے کم یا زائد ہے دوسرا جو لفظ قلیلا ہے اس سے مراد حقوڑ می مقدار ہے یعنی نصف سے کم تو ہو لیکن حقوڑ می مقدار تاکہ چوتھائی حصہ سے کم نہ ہو۔ اب اس تفصیل کے بعد اعلیٰ حضرت کے ترجمہ اور دیگر تراجم میں فرق کی طرف توجہ کریں خود بخود واضح ہو گا کہ اعلیٰ حضرت کا ترجمہ ہی مقصد کے مطابق ہے دیگر مذکورہ تراجم مقصد کی وضاحت سے قاصر ہیں

وَالْتَزَعْتَ غَرْقًا (پ ۲۹ ع ۱)

قسم ہے گھسیٹ لائے والوں کی ڈوب کر (شاہ عبدالقادر)

(مولانا محمد الحسن)

(موردی)

(فتح محمد جالندھری)

(اعلیٰ حضرت)

قسم ہے ٹھسٹ لاسنے والوں کی غوطہ لگا کر۔
 قسم ہے ان فرشتوں کی جو ڈوب کر کھینچتے ہیں۔
 ان فرشتوں کی قسم جو ڈوب کر کھینچ لیتے ہیں۔
 قسم ہے ان کی کہ سختی سے جان کھینچیں۔
 اس مقام پر ان ملائکہ کی قسم اٹھائی گئی ہے جو روح قبض کرتے ہیں
 یعنی عزرائیل اور اس کے ساتھ آئیوا لے۔ اعلیٰ حضرت کے ترجمہ سے مطلب آسانی
 سے اخذ کیا جاسکتا ہے لیکن دوسرے تراجم سے مطلب کو حاصل کرنا نہایت دشوار
 بلکہ یوں کہا جائے کہ ظاہر پر صرف ترجمہ سے مطلب حاصل کرنا ممکن ہی نہیں اور تفاسیر
 میں بھی اسی طرح بیان کیا گیا ہے۔ اعلیٰ حضرت کا ترجمہ ہے۔ جلالین میں ہے۔ والمنزعت
 المذمومة تنزع ارواح الکفار غرقاً منزعاً بشدة۔ اسی طرح کبیر میں ہے
 والمنزعات غرقاً۔ ہی المذمومة الذین یمنعون نفوس بنی آدم فاذا نزعوا
 نفوس الکفار منزعوا بشدة۔ نیز مولوی فتح محمد صاحب اور مولانا موردی کے تراجم
 فرشتوں کس عربی لفظ کا ترجمہ ہے؟

وَإِذَا النُّجُومُ انْكَدَرَتْ (پ ۱۱)

(مولانا محمد الحسن)

(شاہ عبدالقادر)

(فتح محمد)

(شاہ رفیع الدین)

(موردی)

(عبدالماجد)

(اعلیٰ حضرت)

اور جب تارے میل ہو جائیں۔
 اور جب تارے میل ہو جائیں۔
 اور جب تارے بے نور ہو جائیں۔
 اور جس وقت کہ تارے گدے ہو جائیں۔
 جب تارے بکھر جائیں گے۔
 اور جب ستارے بے نور رہ جائیں۔
 اور جب تارے جھڑپیں۔
 یہاں قیامت کے احوال کا ذکر کیا جا رہا ہے کہ ستارے ٹوٹ ٹوٹ کر گرے۔

یہ مفہوم جو مقصود ہے وہ اعلیٰ حضرت کے ترجمہ سے واضح ہے کیونکہ میل ہونے سے یہ پتہ
 نہیں چلتا کہ وہ اپنی جگہ ہوتے ہی بے نور ہو جائیں گے یا کہ گر پڑیں گے اور گرنے کی
 وجہ سے بے نور ہوں گے بیان کا مقصد بھی یہ کہ ستارے زمین پر ٹوٹ ٹوٹ کر گر
 پڑیں گے۔ اعلیٰ حضرت کا ترجمہ بھی اس کو ظاہر کرتا ہے کہ جب تارے جھڑپیں گے
 اور تفاسیر کی تائید بھی اعلیٰ حضرت کے ترجمہ کو حاصل ہے مدارک میں ہے واذ النجوم
 انکسرت تساقطت۔ جب تارے جھڑپیں گے جلالین میں ہے واذ النجوم
 انکسرت انقضت وتساقطت۔ تارے ٹوٹ کر زمین پر گر پڑیں گے تفسیر
 کبیر میں ہے واذ النجوم انکسرت ای تشارت وتساقطت۔ تارے بکھر جائیں
 گے گر پڑیں گے۔

إِنَّ رَبَّكَ لَبِالْمِرْصَادِ (پ ۱۲)

(مولانا محمد الحسن)

(شاہ عبدالقادر)

(مولانا اشرف علی)

(موردی)

(عبدالماجد دریا آبادی)

(فتح محمد)

(شاہ رفیع الدین)

(اعلیٰ حضرت)

بے شک تیرا رب لگا ہے گھات میں۔
 تیرا رب لگا ہے گھات میں۔
 بے شک آپ کا رب گھات میں ہے۔
 تمہارا رب گھات لگائے ہوئے ہے۔
 بے شک آپ کا پروردگار تاک میں ہے۔
 بے شک تمہارا پروردگار تاک میں ہے۔
 تحقیق تیرا رب بیچ گھات کے ہے۔
 بے شک تمہارے رب کی نظر سے کچھ غائب نہیں۔ (اعلیٰ حضرت)
 اس جگہ عام مترجمین نے یہ ترجمہ کیا ہے، رب گھات میں ہے حالانکہ
 بے اللہ تعالیٰ کی شان کے لائق نہیں اس لئے کہ کسی کی گھات میں ہونے کا مطلب یہ
 ہوتا ہے کہ وہ دوسرے سے نظر بچا کر چھپ بیٹھا ہو ہے اور چھپ کر دوسرے
 پر حملہ کرنا چاہتا ہے اللہ تعالیٰ کا چھپ کر بیٹھنا گھات میں دوسرے پر حملہ کرنا، سزا دینا

یہ اس کی شان سے کوسوں دور ہے۔ وہ بیٹھنے اور چھپنے سے پاک ہے اسی وجہ سے اعلیٰ حضرت کا ترجمہ شان الوہیت کے عین مطابق ہے آپ چونکہ زبانی کلامی توحیدی ہونے کے عویدار نہیں تھے کہ شان الوہیت بھی نہ سمجھ آئے بلکہ آپ حقیقت توحید و رسالت کے مراتب کا پاس کر نیوالے تھے۔ اسی وجہ سے آپ کا ترجمہ کہیں بھی اللہ تعالیٰ کی شان کے خلاف تفاسیر کی تائید بھی اعلیٰ حضرت کے ترجمہ کو حاصل ہے۔ جلالین میں ہے۔ یرصد اعمال العباد فلا یفوت منها شیء لیجازیہم علیہا اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کے اعمال کو نگاہ میں رکھتا ہے اس سے کچھ بھی مخفی نہیں وہ ان کو ان کے مال کی جزا دے گا۔ روح المعانی میں ہے۔ وفي الکلام استعارة تمثيلية شبه کونه تعالیٰ حافظا لعمال العصاة۔ یہ کلام استعارہ تمثیلی کے طور پر ہے مفہوم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ گنہگاروں کو عذاب دے گا کیونکہ وہ ان کے اعمال کو نظر میں رکھتا ہے۔

لَا أَقِيمُ بِهَذَا الْبَلَدِ وَأَنْتَ حِلٌّ بِهَذَا الْبَلَدِ وَالِدٍ وَمَا وَلَدَ بِہِمْ ۱

قسم کھاتا ہوں اس شہر کی اور تجھ کو قید نہ رہے گی اس شہر میں اور جننے کی اور جو جنا۔ (شاہ عبدالقادر ۱)

میں قسم کھاتا ہوں اس شہر کی اور تجھ پر قید نہیں رہے گی اس شہر میں اور قسم ہے جتنے کی اور جو اس نے جنا۔ (مولانا محمد الحسن ۱)

میں قسم کھاتا ہوں اس شہر کی اور آپ کو اس شہر میں لڑائی حلال ہو نیوالی ہے اور قسم ہے باپ کی اور اولاد کی (اشرف علی ۱)

میں قسم کھاتا ہوں اس شہر کی اور آپ کو اس شہر میں لڑائی حلال ہونے والی ہے اور قسم ہے باپ کی اور اولاد کی۔ (عبدالماجد دریا آبادی ۱)

مجھے اس شہر کی قسم کہ اے محبوب تم اس شہر میں تشریف فرما ہو اور تمہارے باپ ابراہیم کی قسم اور اس کی اولاد کی کہ تم ہو۔ (۱ علی حضرت ۱)

اعلیٰ حضرت نے وانت حل بهذا البلد کا ترجمہ کیا ہے کہ اے محبوب تم اس شہر میں تشریف فرما ہو اگر دیگر تراجم بھی تفاسیر سے ملتے ہیں تاہم اعلیٰ حضرت کا ترجمہ تفسیر کبیر کے اس قول سے مطابقت رکھتا ہے وانت مقیم بهذا البلد نازل فی حال بہ کانه تعالیٰ عظم مکة من جهة انه عليه الصلوة

والسلام مقیم بہا۔ یعنی اللہ تعالیٰ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے مکہ مکرمہ میں مقیم ہو چکی وجہ سے اس کو عظیم سمجھتے ہوئے قسم اٹھائی کہ مجھے اس شہر کی قسم اے محبوب تم اس شہر میں تشریف فرما ہو۔ اسی طرح باقی مترجمین نے والد اور ولد کو عام رکھا۔ باپ اور اولاد کی قسم، یا جتنے یا جو جتنا اس کی قسم۔ لیکن اعلیٰ حضرت نے والد سے مراد ابراہیم علیہ السلام اور اولاد سے مراد آپ کی نگر اولاد جس میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم بھی ہیں۔ اور حقیقت بھی یہی ہے کہ قسم اسی لئے اٹھائی گئی ہے کہ والد سے مراد بھی معظم ہستی اور اولاد سے مراد معظم ہے روح المعانی میں ہے وقیل ابن اہیم علیہ السلام وولده اسمعیل علیہ السلام والنبی صلی اللہ علیہ وسلم یعنی والد سے مراد ابراہیم علیہ السلام ہیں اور اولاد سے مراد حضرت اسمعیل علیہ السلام اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ مدارج النبوة میں شیخ فرماتے ہیں

معزز و مکرم است نزد حق تعالیٰ بوقت حلول و نزول وی در اں واریجا
گفتہ اند شرف المکان بالمکین۔

اللہ تعالیٰ کے نزدیک نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے تشریف فرما ہونے کی وجہ سے وہ شہر معزز و مکرم ہوا اسی وجہ سے کہا جاتا ہے کہ شرف المکان بالمکین۔ کہ مکان کو رہنے والے کی وجہ سے بزرگی حاصل ہے کے متعلق فرماتے ہیں

اگر مراد بوالد آدم است وما ولد ذریت است آنحضرت داخل است

در عموم ذریت و اگر ابراہیم علیہ السلام است مراد بذریت آنحضرت
خواہ بود صلی اللہ علیہ وسلم پس دریں صورت دو قسم است از پروردگار
عزوجل بحیب و صلی اللہ علیہ وسلم -

یعنی اگر والد سے مراد حضرت آدم علیہ السلام ہوں اور ذریت سے مراد آپ کی
اولاد تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم عام اولاد میں داخل ہیں اگر والد سے مراد حضرت
ابراہیم علیہ السلام ہوں تو ولد سے مراد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہوں گے - بہر حال
اسی پاک میں نبی کریم کی دو مرتبہ قسم اٹھائی گئی -

وَوَجَدَكَ ضَالًّا فَهَدَىٰ (پ ۳۱۸)

پایا تجھ کو بھٹکتا پھر راہ سمجھائی - (محمود الحسن)
پایا تجھ کو بھٹکتا پھر راہ دی - (شاہ عبدالقادر)
اور اللہ نے آپ کو بے خبر پایا سو رستہ بتلایا - (اشرف علی)
تمہیں نادان راہ پایا پھر ہدایت بخشی - (مودودی)
اور رستے سے ناواقف دیکھا تو سید ہارستہ دکھایا - (مولوی فتح محمد)
اس نے تجھ کو بھولا بھٹکا پایا پھر راہ پر لگایا - (وحید الزمان)
آپ کو بے خبر پایا سو رستہ بتا دیا - (عبدالماجد دریابادی)
پس پایا تجھ کو راہ بھولا ہوا پس راہ رکھائی - (شاہ رفیع الدین)
اور تمہیں اپنی محبت میں غور رفتہ پایا تو اپنی طرف راہ دی - (اعلیٰ حضرت)
اس مقام پر اعلیٰ حضرت کا ترجمہ ہی صحیح ہے اور اسی میں نبی کریم صلی
اللہ علیہ وسلم کی شان کا لحاظ کیا گیا ہے جبکہ دیگر تراجم میں نبی کریم بھٹکا ہوا بھولا
بھٹکا ہوا، بے خبر - ناواقف کہہ کر گستاخانہ انداز اختیار کیا گیا ہے اگر نبی کریم اعلان
نبوت سے پہلے محاذ اللہ بھولے بھٹکے ہوئے - شریعت سے بے خبر اور ہدایت
اور سید ہی راہ سے ناواقف تھے تو اس کفر کی سرزمین میں تو نیکی سے سجدہ ریز بھی ہو کر کفار کی

طرح محاذ اللہ عام برائیوں کا ارتکاب بھی کرتے - حالانکہ نبی کریم اور جمیع انبیاء کرام
نبوت سے پہلے اور بعد میں تمام صفات و کمالات سے پاک ہوتے ہیں اسی وجہ سے کہ وہ
اللہ تعالیٰ اور راہ حق سے باخبر ہوتے ہیں - اگر عیسیٰ علیہ السلام اپنے بچپن میں اپنی
عبودیت اللہ تعالیٰ کی الوہیت اور اپنی نبوت اور اپنے دیگر کمالات کا اعلان فرماتے ہیں
تو کیا وہ بے خبری، ناواقفی، بھولے بھٹکے ہوئے حالات میں کرتے ہیں یا کہ سب کچھ
جانتے ہوئے یہ اعلان فرماتے ہیں جب عیسیٰ علیہ السلام اپنے مہم میں اپنے عہد ہو کر
جاننے کا ذکر کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی الوہیت سے باخبر ہونے کو بیان کرتے ہیں -
اور اپنی نبوت اور اپنے کمالات اور کئی شرعی احکام سے علم رکھنے کا برملا اعلان
کرتے ہیں تو یقیناً نبی محترم جمیع انبیاء کرام سے افضل ہونے کی وجہ سے عیسیٰ
علیہ السلام سے زیادہ علم رکھتے ہیں - حق تو یہ تھا کہ ہر مخالفت بھی اعلیٰ حضرت کی تری
کو تسلیم کرتا لیکن خدا اور خدا نے اس مقام پر جا کھڑا کیا کہ صحیح غلط اور غلط صحیح نظر
سمجھ آنے لگا اور اعلیٰ حضرت کے ترجمہ پر ان الفاظ سے اعتراض کیا گیا - ووجدک
ضالاً اس جگہ اپنی محبت اور اپنی طرف سے جملے من گھڑت ہیں - انہوں نے اگر
تفسیر کا مطالعہ کیا ہوتا تو یہ کہنے کی جرأت نہ ہوتی - تفسیر کی عبارت ملاحظہ فرمائیں جن سے
اعلیٰ حضرت کے ترجمہ کی فوقیت واضح ہے تفسیر میں علامہ رازی نے اس آیت کریمہ
کی بیس توجیہات بیان کی ہیں لیکن ان میں سے وہ دو جس سے اعلیٰ حضرت کے ترجمہ کی برتری
سمجھ آتی ہے وہ یہ ہے - الضلال بمعنی المحبۃ کما فی قولہ اللہ
لنضی ضلالک القدیم ای محبتک و معناه انک محب فہدیتک
الی الشرائع النبی بہا تقترب الی خدمۃ محبوبک یعنی اس جگہ
ضلال بمعنی محبت ہے جس طرح انک لنضی ضلالک القدیم میں ضلال کا معنی محبت
ہے - یہاں معنی یہ ہو گا کہ بے شک آپ محب ہیں یعنی آپ کو اپنی محبت میں وارفتہ پایا
تو اپنی طرف ہدایت دی ان راستوں کی راہنمائی کی جنکی وجہ سے محبوب کی خدمت کا قرب
حاصل ہو گا نبی کریم کا محبوب اللہ تعالیٰ کی ذات ہی تو ہے - روح المعانی میں ہے -

من وجدك ضالا عن معنى معض المودة الا ول فسقاك كما سامن شراب القربة
والمودعة فهداك به الى معرفته عز وجل وقال جعفر الصادق رضي الله
عنه كنت ضالا عن محبتك في الاسمال فمنت عليك بمعرفتي - آپ حقیقتہ
محبت میں وارد تھے تو آپ کو شراب قرب و محبت کا جام پلایا اپنی معرفت کی راہ دی
حضرت امام جعفر صادق رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں اس کا مقصود یہ ہے کہ آپ کو ازل میں میری
جو محبت حاصل تھی آپ اس میں وارد تھے پھر میں نے آپ پر احسان کیا کہ اپنی
معرفت کی طرف راہ دی تفسیر مظہری میں اس طرح ہے وقال بعض الصوفية معناه
ووجدك محبا عاشقا مغرطا في الحب والعشق صوفيا كرام نے فرمایا کہ
اس کا معنی یہ ہے کہ آپ کو اپنی محبت و عشق میں وارد فرمایا اور محب پایا الجامع الکلام
البيان للقطري میں ہے وقيل وجدك محبا للهداية فهداك اليها
ويكون الضلال بمعنى المحبة ومنه قوله تعالى انك لفي
ضلالك القديم آپ کو اپنی محبت کی راہ تلاش کرنے میں وارد فرمایا تو اپنی طرف
راہ دی یہاں ضلال بمعنی محبت ہے جیسا کہ انک لفي ضلالك القديم
میں ضلال بمعنی محبت ہے اس مقام کے نازک ہونے کی وجہ سے مفسرین کو اہم توجہ دینا
کرتے نظر آئے ہیں ورنہ آسانی سے وہ بھی کہہ سکتے تھے تمہیں بھٹکا ہوا پایا تو ہدایت
دی - علامہ رازی کی پیش کردہ توجہات سے کچھ پیش کر رہا ہوں -

ار انه قد يخاطب السيد ويكون المراد قومه فقوله
ووجدك ضالا امي وجد قومي ضالا - فهداهم
بك وبشرعك - یہاں خطاب آقا کو اور مراد آپ کی امت ہے کہ
آپ کی قوم کو بھٹکا ہوا پایا اور ان کو راہ دی - اس صورت میں ترجمہ
بھٹکا ہوا گمراہ راست ہے لیکن نسبت قوم کی طرف کھجائے اور ترجمہ
بھی ایسا ہی ہونا چاہئے جس میں قوم کا ذکر نہ ہو -

۲ - وجدك ضالا عن الهدى متحيرا في يد قریش

متمنيا فراقهم وكان لا يمكنك الخس وجمدون
اذنه تعالى فلا اذن له ووافقه الصديق علي
آپ ہجرت کیلئے بیتاب تھے قریش کو چھوڑنے کی آپ تمنا رکھتے
تھے لیکن اللہ تعالیٰ کی اجازت کے بغیر آپ کو ہجرت کرنا ممکن نہیں تھا
پس اللہ تعالیٰ نے آپ کو اجازت دی اور حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ
کے ہمراہ ہوئے -

۳ - ضالا عن القبلة فانه كان يسمى ان تجعل الكعبة
قبلة له وما كان يعرف ان ذلك هل يحصل له
ام لا فهداه الله بقوله فلنولينك قبلة ترضاها
فكان ذلك التحيين بالاضلال - نبی کریم صلی اللہ علیہ
وسلم بیت المقدس سے کعبہ المکرمہ کے تبدیل ہونے کی بہت زیادہ تمنا رکھتے
تھے کہ کعبہ قبلہ بدلے گا تو اللہ تعالیٰ نے اس تحیر و بے قراری سے
راہ دی اور یہ ارشاد فرمایا فلنولينك قبلة ترضاها
آپ کی مرضی کے مطابق ہم قبلہ بدل رہے ہیں اسی تحیر و بے قراری کا
نام ضلال ہے -

اس طرح کئی توجہات پیش کی گئی ہیں - صرف اسی وجہ سے
تا کہ نبی کریم کو کوئی بھولا بھٹکا ہوا نہ کہے - لیکن افسوس کس کس نے پھر
بھی کہہ دیا - اسی طرح ہمارے رجحان میں شیخ نے کئی وجوہ بیان کی ہیں ایک
وجہ وہ ہے جس کے مطابق اعلیٰ حضرت کا ترجمہ ہے - آپ نے اس طرح ذکر فرمایا
انکہ مراد بضال محبت است یعنی یافت ترا محب وطالب معرفت من سبب
محب بضال بسیار آمدہ است کہ گم می گرد و انداختار و قرار خود بر نہج
معقول نمی تواند رفت چنانکہ انالترك في ضلال مبین وانك لفي ضلالك القديم

یعنی ضلال کا معنی محبت ہے مطلب یہ ہوا کہ میں نے آپ کو اپنی محبت میں وارد فرمایا (گم)

پہا پھر اپنی طرف راہ دی - ضال محب کے معنی میں بہت آتا رہتا ہے - کیونکہ محبت میں اختیار برقرار نہیں رہتا جیسے انا لئراک فی ضلال مبین اور انک لفی ضلالک القدیم میں ضلال بمعنی محب کا محبت میں گم ہونا ہے

وَالْعَصْرِ (پ ۶)

قسم ہے عصر کی -
قسم ہے زمانہ کی -
زمانے کی قسم -
عصر کی قسم -
اس زمانہ محبوب کی قسم -

اگرچہ اس مقام پر تمام اقوال ملتے ہیں لیکن اعلیٰ حضرت کے ترجمہ سے محبت حبیب کبریٰ علیہ التحیۃ والتنازع کا واضح ثبوت ملتا ہے اس پر تفاسیر کے اقوال بھی موجود ہیں - اسی قول کو شیخ عبدالحق محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی پسند کرتے ہوئے مدارج النبوة میں درج فرمایا - روح المعانی میں ہے وقیل المراد به عصر النبوة وکانہ عنی به وقت حیاته علیہ الصلوٰۃ والسلام فانما اشرف اعصار تشریف النبی صلی اللہ علیہ وسلم - یعنی عصر سے مراد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ نبوت کی قسم ہے - گویا کہ آپ کی زندگی مطہرہ کے زمانہ کی قسم اٹھائی گئی ہے کیونکہ وہی زمانہ سب زمانوں سے اعلیٰ و شرف ہے تفسیر کبیر میں ہے والعصر ای والعصر الذی انت فیہ فہو تعالیٰ اقسام بزمانہ فی هذه الایۃ وبمکانہ فی قولہ وانت حل بہذا البلد و بعمرہ فی قولہ لعمرک فکانہ قال وعصرک وبلدک و عسک - یعنی والعصر سے مراد وہ زمانہ ہے جس میں اے محبوب آپ

تشریف فرما ہیں - اس آیت میں نبی کریم کے زمانہ کی قسم ہے وانت حل بلہذا البلد میں نبی کریم کے شہر کی قسم - اور لعمرک میں نبی کریم کی عمر کی قسم ہے - گویا رب تعالیٰ نے یہ فرمایا کہ اے محبوب آپ کے زمانہ اور شہر اور آپ کی عمر کی قسم - مدارج میں ہے پس قسم یاد کردومی تعالیٰ درینخبنا بزمان رسول چنانکہ قسم خورد بمکان دمی صلی اللہ علیہ وسلم در لا اقسام بہذا البلد و بعمر دمی در قول خود لعمرک - اس جگہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ کی قسم اور لا اقسام بہذا البلد میں کہنا ہے آپ کے شہر کی قسم اسی طرح لعمرک میں ارشاد آپ کی عمر کی قسم - کلام مجید کی ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے اپنے محبوب کی قسمیں اٹھا کر اس کی شان کو بلند و بالا فرمایا اور اسی شان کو اعلیٰ حضرت فاضل بریلوی رحمۃ اللہ علیہ نے یوں جاہلہ سخن سے آراستہ فرمایا ہے

وہ خدا نے ہے مرتبہ تجھ کو دیا نہ کسی کو ملے نہ کسی کو ملا :
کہ کلام مجید نے کھائی شہا تھے شہر و کلام و بقا کی قسم (حدائق بخشش)

تمت بالخیر

وما علینا الذی لا یغنی

عبدالرزاق حطارومی بھٹنر الوہی

بروز بدھ - یکم جنوری ۱۹۸۶ء

۱۹ ربیع الثانی ۱۴۰۶ھ

فهرس

١	وَلَا تَدْفِي الْأَخِرَةَ لِمَنِ الصَّالِحِينَ	٢٦	ابتداء سخن
١٩	قُلْ بَلْ مِثْلَ مِلَّةِ إِبْرَاهِيمَ خَنِيفًا	٢٤	خطبه
٢٠	لَا تُفَرِّقُ بَيْنَ أَحَدٍ مِنْهُمْ	٢٨	بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ
٢٢	فَسَيَكْفِيكُمْ اللَّهُ	٢٩	الْحَمْدُ لِلَّهِ
٢٣	وَيَكُونَنَّ الرَّسُولُ عَلَيْكُمْ شَهِيدًا	٥٠	إِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ
٢٤	إِلَّا لِنَعْلَمَ	٥٢	الَّذِي ذَلِكَ الْكِتَابُ
٢٦	وَلَمَّا اتَّبَعْتَ أَهْوَاءَهُمْ	٥٣	يُخَدِّعُونَ اللَّهَ
٢٩	فَلَا تَكُونَنَّ مِنَ الْمُمْتَرِينَ	٥٥	اللَّهُ يَسْتَهْزِئُ بِهِمْ
٣٠	وَمَا أَهْلَ بِهِ لِغَيْرِ اللَّهِ	٥٤	وَمَا كَانُوا مُهْتَدِينَ
٣٢	فَالَّذِينَ بَارِئُوهُنَّ	٥٨	وَرِذْقًا قَالَ رَبُّكَ
٣٣	أَحِلَّ لَكُمْ لَيْلَةَ الصِّيَامِ الرَّفَثُ	٦٣	إِلَّا عَلَى الْخَشَعِينَ
٣٥	فَلَا رَفَثَ	٦٣	وَأَتُوا الزَّكَاةَ
٣٦	ثُمَّ أَفِضُوا مِنْ حَيْثُ أَفَاضَ النَّاسُ	٦٣	وَأَلِّى فَضَلْتُكُمْ عَلَى الْعَالَمِينَ
٣٨	أَنْ يَأْتِيَهُمُ اللَّهُ	٦٥	وَلَا يَقْبَلُ مِنْهَا شَفَاعَةً
٤٢	فَأَنُوحُوا حَتَّى تَأْتِي سَلَامٌ	٦٦	ثُمَّ اتَّخَذْتُمُ الْعِجْلَ
٤٣	وَلِلْمُطَلَّقَاتِ مَتَاعٌ بِمَا كَفَرُوا	٦٩	فَفَرِّقَا كَذِبُكُمْ
٤٤	وَلَا خُلَّةَ وَلَا شَفَاعَةً	٤٤	وَرِذْقًا جَعَلْنَا الْبَيْتَ مَثَابَةً

٤٤	فَبِمَتَ الَّذِي كَفَرَ	١٠٢	فَكُلُوا مِنْ ثَمَرِهِ إِذَا أَثْمَرَ
٤٩	الشَّيْطَانُ يَعِدُكُمُ الْفَقْرَ	١٠٦	إِذَا أَقْبَمْتُمْ إِلَى الصَّلَاةِ
٤٩	أَوْ نَذَرْتُمْ مِنْ نَذْرٍ	١٠٤	وَأَتَاكُمْ مَالٌ كَثِيرٌ أَحَدًا مِنَ الْعَالَمِينَ
٨٠	وَاصْطَفَاكِ عَلَى الْعَالَمِينَ	١٠٨	وَلَا تَتَّبِعْ أَهْوَاءَهُمْ
٨٢	نَحْنُ أَنْصَارُ اللَّهِ	١٠٩	هَلْ يَسْتَطِيعُ رَبُّكَ
٨٢	وَمَكْرُوا وَمَكْرَ اللَّهِ	١١١	وَالْمَوْتُ يَبْعَثُهُمُ اللَّهُ
٨٥	إِنِّي مُتَوَقِّعٌ	١١٣	وَلَا أَعْلَمُ الْغَيْبَ
٨٦	ثُمَّ جَاءَكُمْ رَسُولٌ	١١٥	فَتَكُونُ مِنَ الظَّالِمِينَ
٨٨	وَأَنْتُمْ آذِلَةٌ	١١٤	وَإِذَا رَأَيْتَ الَّذِينَ يَخُوضُونَ
٨٩	وَلِيَعْلَمِ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا	١١٨	قُلْ أَدْعُوا مِنْ دُونِ اللَّهِ
٩٠	وَلَمَّا يَعْلَمِ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا	١٢٠	فَلَتَأْجَنَّ عَلَيْهِمُ الْبُيُوتُ كَمَا
٩٢	أَفَارِنْ مَاتَ أَوْ قُتِلَ	١٢٣	وَكُلًّا فَضَّلْنَا عَلَى الْعَالَمِينَ
٩٢	بَعْضُ مَا كَسَبُوا	١٢٥	فَلَا تَكُونَنَّ مِنَ الْمُمْتَرِينَ
٩٣	وَلِيَعْلَمَ الْمُؤْمِنِينَ	١٢٦	وَإِنْ تَطِعُوا أَكْثَرَ مَنْ فِي الْأَرْضِ
٩٣	لَا يَغْفِرُكَ تَقَلُّبُ الَّذِينَ كَفَرُوا	١٢٨	وَلَا تَتَّبِعْ أَهْوَاءَ الَّذِينَ
٩٦	إِنَّمَا التَّوْبَةُ عَلَى اللَّهِ	١٢٩	قَدْ افْتَرَيْنَا عَلَى اللَّهِ كَذِبًا
٩٤	وَلَوْ أَنَّهُمْ إِذْ ظَلَمُوا	١٣١	سَخَرُوا أَهْلِينَ النَّاسِ
١٠٠	وَالْمُحْصَنَاتُ مِنَ النِّسَاءِ	١٣٢	وَلَا تَتَّبِعْ سَبِيلَ الْمُفْسِدِينَ
١٠١	مَا أَصَابَكَ مِنْ حَسَنَةٍ فَمِنَ اللَّهِ	١٣٢	لَنْ كِيدَ فِي حَتِّينِ
١٠٢	أَنْ تَقْصُرُوا مِنَ الصَّلَاةِ	١٣٣	وَيَمْكُرُونَ وَيَمْكُرُ اللَّهُ
١٠٣	إِنَّ الشُّفْعَاءَ يُخَدِّعُونَ اللَّهَ	١٣٣	قُلْ لَا أَمْلِكُ لِنَفْسِي

بَرَاءَةً مِنَ اللَّهِ وَرَسُولِهِ ١٣٥ وَالَّذِينَ يَدْعُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ ١٣٦
 فَتَبَطُّهُمْ ١٣٨ قُلْ دَعُوا الَّذِينَ رَعَوْهُمْ مِنْ دُونِ ١٣٩
 سَخِرَ اللَّهُ مِنْهُمْ ١٣٩ يَأْخُذْ كُلَّ سَفِينَةٍ غَصْبًا ١٩٠
 نَسُوا اللَّهَ فَنَسِيَهُمْ ١٤٠ مُفْسِدُونَ فِي الْأَرْضِ ١٩١
 السَّائِرُونَ ١٤١ قُلْ إِنَّمَا أَنَا بَشَرٌ مِثْلُكُمْ ١٩٢
 ثُمَّ اسْتَوَى عَلَى الْعَرْشِ ١٤٢ قَالَ رَبِّ ارْنِي وَهَنَ الْعِظْمُوتِ ١٩٥
 قُلِ اللَّهُ أَسْرَعُ مَكْرًا ١٤٦ فَخَرَجَ عَلَى قَوْمِهِ مِنَ الْمِحْرَابِ ١٩٤
 وَاجْعَلُوا يَوْمَ تَكُونُ قُبُلُهُ ١٤٨ وَاتَّبِعْهُ الْحُكْمَ صَبِيحًا ١٩٨
 وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ إِلَّا عَلَى اللَّهِ رِزْقُهَا ١٥٠ وَعَصَى آدَمُ رَبَّهُ فَغَوَى ٢٠٠
 فَإِنَّا نَسْخَرُهُ مِنْكُمْ ١٥١ إِذْ أَوْحَيْنَا إِلَىٰ آدَمَ مَا أَوْحَى ٢٠٢
 هُوَ لَا يَرِي بَنَاتِي هُنَّ أَطْهَرُ لَكَ ١٥٢ وَفَتَنَّاكَ فُتُونًا ٢٠٣
 إِنَّا بَالِغِي ضَلَالٍ مُبِينٍ ١٥٦ قَالُوا سِعْفًا فَنِيَّذِكْرُهُمْ يُقَالُ ٢٠٦
 وَلَقَدْ هَمَمْتُ بِهِ وَهَمَّ بِهَا ١٥٤ لَهُ إِبْرَاهِيمُ ٢٠٢
 وَأَنَا خَيْرُ الْمُنْزِلِينَ ١٦٢ قَالَ بَلْ فَعَلَهُ كَبِيرُهُمْ ٢٠٦
 كَذَلِكَ كَذَّبَ الْيُوسُفُ ١٦٥ لَقَدْ عَلِمْتَ مَا هَؤُلَاءِ يَبْتَغُونَ ٢٠٤
 إِنَّكَ لَفِي ضَلَالٍ الْقَدِيمِ ١٦٦ أَقْبَلْتُكُمْ وَلِمَا تَعْبُدُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ ٢٠٨
 حَتَّىٰ إِذَا اسْتَيْأَسَ الرُّسُلُ ١٦٤ وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا حَمِيَّةً لِلْعَالَمِينَ ٢٠٩
 مِنْ حِمَايَ مَسْنُونٍ ١٤٢ وَذَا النُّونِ إِذْ ذَهَبَ مُغَاضِبًا ٢١٢
 مِنْ نَارِ السَّعِيرِ ١٤٣ فَادْكُرُوا اسْمَ اللَّهِ عَلَيْهَا صَوَافٍ ٢١٥
 وَتَفَحَّتْ فِيهِ مِنْ رُوحِي ١٤٢ وَلَوْلَا دَفْعُ اللَّهِ النَّاسَ ٢١٤
 تَتَخَذُونَ مِنْهُ سَكْرًا ١٤٥ لَا تَجِدُوا الْيَوْمَ ٢١٨

مُشْكِرِينَ بِمَا سَمِعُوا تَهْجُرُونَ ٢١٩ فِي شُغْلٍ فَكِهِونَ ٢٢٨
 بَلِ الْآيَاتُ لَكُمْ بَيِّنَاتٌ ٢٢١ بَلْ هُمْ الْيَوْمَ مُسْتَلِمُونَ ٢٢٨
 وَلَا تُكْرِهُوا فَتِيَاتِكُمْ عَلَى الْبِغَاءِ ٢٢٢ فَوَاعِظُهُمْ ضَرْبًا بِالْيَمِينِ ٢٥٠
 وَقَدْ مَنَّ اللَّهُ عَلَى النَّاسِ ٢٢٣ فَلَمَّا بَلَغَ مَعَهُ السَّعْيَ ٢٥٢
 إِذْ قَالَ لَهُمْ أَخُوهُمْ نُوحٌ ٢٢٦ وَتَسْحَبُونَ مِنَ الْجِبَالِ يَبُوتًا ٢٢٤
 وَادْخُلْنِي رِجْعَتِكَ فِي عِبَادِكَ ٢٢٤ وَأَنْبَتْنَا عَلَيْكُمْ شَجَرَةً مِنْ ثَمَرِهِ ٢٥٤
 الصَّالِحِينَ ٢٢٨ لَئِنْ أَشْرَكْتَ لَيَحْبَطَنَّ عَمَلُكَ ٢٥٩
 وَلَوْلَا أَنْ رَبَّنَا عَلَىٰ قَلْبِهَا ٢٢٩ وَجِئْنَا بِالنَّبِيِّينَ وَالشُّهَدَاءِ ٢٦٢
 فَصُرْتُ بِهِ عَنْ جُنُبٍ ٢٣٠ ذِي الطَّوْلِ ٢٦٥
 عَلَىٰ أَنْ تَأْجُرَنِي ثَمَانِي حِجَابٍ ٢٣١ وَجِئْنَا بِالنَّبِيِّينَ مِنْ حِمِيمٍ لَا سَفِيمَ ٢٦٦
 إِنَّكَ تَهْدِي مَنْ أَحْبَبْتَ ٢٣١ وَإِنْ يَكُ كَذِبًا فَعَلَيْكَ كَذِبُهُ ٢٦٨
 وَتَفَحَّتْ فِيهِ مِنْ رُوحِي ٢٣٣ مَا كُنْتُ تَدْرِي مَا الْكِتَابُ وَلَا الْإِيمَانُ ٢٦٩
 وَلَنْذِيقَهُمْ مِنَ الْعَذَابِ الْأَدْنَىٰ ٢٣٣ مَا كَانَ لِلنَّاسِ يَكْلَمَهُ اللَّهُ وَلَا وَحْيًا ٢٤٠
 فَأَخَوَانُكُمُ فِي الدِّينِ وَمَوَالِكُمْ ٢٣٤ قُلْ إِنْ كَانَ لِلرَّحْمَنِ وَكَدٌّ ٢٤٢
 النَّاسِ أَوْلىٰ بِالْمُؤْمِنِينَ مِنْ أَنْفُسِهِمْ ٢٣٩ فِيمَا يُفْرِقُ كُلُّ أَمْرٍ حَكِيمٍ ٢٤٢
 مَنْ يَأْتِ بِمِثْرٍ يِفَاحِشَةٍ ٢٣٠ وَاسْتَغْفِرْ لِذَنْبِكَ ٢٤٥
 وَتَحْشَى النَّاسَ وَاللَّهُ أَخُو أَحْسَنُ ٢٣١ لِيُغْفِرَ لَكَ اللَّهُ مَا تَقَدَّمَ ٢٤٥
 إِنَّا أَرْسَلْنَاكَ شَهِيدًا ٢٣٣ مِنْ دَمَانِكَ ٢٨٣
 لِيَجِبَالَ أَوْ بِي مَعًا ٢٣٦ فَتَوَلَّىٰ جَوْكِيمَ ٢٨٦
 فَلَمَّا خَرَّ ٢٣٤ عَلَّمَهُ شَدِيدُ الْقُوَىٰ ٢٩٠

٣١١	٢٩٠	لَقَطَعْنَا مِنْهُ الْوَتِينَ	ثُمَّ دَنَى قَتْدَلِي
٣١٢	٢٩١	إِنَّا كُنَّا نَقْعُدُ مَقَاعِدَ اللَّسْمِيعِ	فَكَانَ قَابَ قَوْسَيْنِ أَوْ أَدْنَىٰ
٣١٢	٢٩٩	يَا أَيُّهَا الْمَرْمِلُ	فِي أَيِّ الْأَرْبَعِ تَتَّسَرَّى
٣١٣	٣٠٠	وَالْتُرَعْبَتِ غَرْقًا	الرَّحْمَنُ عَلَّمَ الْقُرْآنَ
٣١٣	٣٠٦	وَإِذَا النُّجُومُ انْكَدَرَتْ	فَاتَرَاهُمُ اللَّهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ
٣١٥	٣٠٤	إِنَّ رَبَّكَ لَبِالْمِرْصَادِ	الْبَارِئُ الْمُصَوِّرُ
٣١٦	٣٠٨	لَا أُقْسِمُ بِهَذَا الْبَدِيدِ	وَتَوَكُّوْكَ قَائِمًا
٣١٨	٣٠٩	وَوَجَدَكَ ضَالًّا فَهَدَىٰ	يَوْمَ يُكْشَفُ عَنْ سَاقٍ
٣٢٢	٣١٠	وَالْعَصْرِ	إِنَّهُ لَقَوْلُ رَسُولٍ كَرِيمٍ